ایڈیٹر

ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس/تھاپ پبلی کیشنز، لاہور

خط و کتابت (برائے مضامین)
بلاک ا، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ
فون: ۰۴۲۔۳۶۶۶۵۹۹۷
ای۔میل: mubarakali21@yahoo.com
قیمت فی شمارہ غیر مجلد: ۳۲۰ روپے
قیمت فی شمارہ مجلد: ۴۰۰ روپے
سرِ ورق: نین تارا
پینٹنگ سرِ ورق: بشکریہ ڈاکٹر اعجاز انور
پرنٹرز: شرکت پریس، لاہور
تاریخِ اشاعت: نومبر ۲۰۱۱ء

THAAP PUBLICATIONS
43-G Gulberg III, Lahore
Tel: 042-35880822, Fax: 042-35725739
E-mail: thappublications@gmail.com

فہرست

لاہور۔ سفرنامے

لاہور۔ یادداشتیں

لاہور۔فن تعمیر و آبادکاری

ابتدائیہ

لاہور شہر کے اس خصوصی شمارے میں ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس سے شہر میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں معلوم ہو سکے۔ اس کے پہلے حصہ میں ان سیاحوں کے تاثرات ہیں کہ جنھوں نے اس شہر کو مختلف ادوار میں دیکھا۔ سیاحوں کے مشاہدات کی اہمیت ہوتی ہے، کیونکہ یہ شہر کو ایک غیر ملکی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اس کا مقابلہ اپنے شہروں سے کرتے ہیں، ان کے ہاں تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ تنقیدی نقطۂ نظر بھی ہوتا ہے۔ ان کے بیانات سے لاہور کے بارے میں عہد مغلیہ، سکھ عہد اور انگریزی دور کے شہر کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

شمارے کے دوسرے حصہ میں ان لوگوں کی یادیں ہیں کہ جنھوں نے اس شہر میں اپنی زندگی گزاری، کس طرح سے یہ شہر ایک ہی نسل کی موجودگی میں بدل کر رہ گیا، اس کا اندازہ ان کی یادداشتوں سے ہوتا ہے۔ شہر بدل جاتا ہے مگر یادداشتوں میں شہر زندہ رہتا ہے۔ اس سے شہر کے بدلتے ہوئے کلچر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

تیسرے حصہ میں لاہور کے بارے میں مختلف مضامین ہیں، ان مضامین کے ذریعہ شہر کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ یہ مضامین لاہور کی نواحی آبادکاری اور نئی تعمیرات کے شہر پر پڑنے والے اثرات سے متعلق ہیں کہ کس طرح طرزِ معاشرت بدلنے اور حکومتی نظام میں تبدیلی آنے سے تعمیرات میں تبدیلیاں آتی ہیں۔

اس کا آخری حصہ غافر شہزاد کے مضمون پر مشتمل ہے جو انھوں نے اندرون شہر میں ہونے والے ایک پروجیکٹ کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ پراجیکٹ ابھی اپنے انجام کو نہیں پہنچا۔ غافر شہزاد نے ان تمام مراحل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے کہ جن سے اس پراجیکٹ میں تبدیلیاں

وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں اور ماہرین اور افسران کا اس میں کیا کردار رہا ہے۔

لاہور شہر کی ایک شناخت اس کی تاریخی عمارتیں ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر عمارتیں خستہ وشکستہ ہورہی ہیں، اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ریاست کے پاس رقم نہیں ہے۔ قلعہ اور شالا مار کو غیر ملکی امداد کے ذریعہ اس کی کچھ عمارتوں کی دیکھ بھال ہوئی ہے، مگر اکثر عمارتیں دکانوں اور مکانوں کے گھیراؤں میں آ چکی ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم مسجد وزیر خاں ہے۔ اکثر عمارتوں کی پوری طرح سے نشان دہی بھی نہیں کی گئی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عام لوگوں میں تاریخی ورثہ کی اہمیت کا احساس نہیں ہے اور جب یہ احساس نہ ہو تو ان کے کمرشل مفادات اس پر غالب آ جاتے ہیں۔

اس لیے سوال یہ ہے کہ اگر لاہور شہر کی تاریخی یادگاریں ختم ہو گئیں تو اس کے ساتھ ہی اس شہر کی تاریخی اہمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ اب تک جو لوگ تاریخ میں امر رہے ہیں وہ اس سے محروم ہو کر بیگانگی کا شکار ہو جائیں گے اور لاہور، لاہور نہیں رہے گا۔

''تاریخ'' کا یہ خصوصی شمارہ (لاہور نمبر) تھاپ کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ہماری اس کوشش کو قارئین پسند کریں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی

۱۶ اکتوبر ۲۰۱۱ء

لاہور

تبدیلیوں سے گزرتا لاہور شہر

ڈاکٹر مبارک علی

شہر عروج و زوال کے عمل سے دوچار رہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ترقی بھی کرتے ہیں، اور جب ان کی افادیت ختم ہو جائے تو یہ پس ماندگی کی جانب چلے جاتے ہیں۔

وہ شہر کہ جو سیاسی طاقت کا مرکز ہوتے ہیں، سلطنت کے عروج کے زمانہ میں ان کی شان و شوکت ہوتی ہے۔ عالی شان عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں، صنعت و حرفت میں ترقی ہوتی ہے، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے نتیجہ میں ایک نیا کلچر ابھرتا ہے۔ لیکن جب سلطنت ٹوٹتی ہے اور سیاسی طاقت بکھر جاتی ہے تو اس کا دارالسلطنت بھی اس کے ساتھ ہی زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ شہر روم کے ساتھ ہوا کہ جو اپنے وقت کا خوبصورت، آباد اور پرشکوہ عمارات سے گھرا ہوا تھا، رومی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی، امراء نے اپنے دیہاتی علاقوں میں پناہ لی اور وہاں تعمیر شدہ حویلیوں میں منتقل ہو گئے۔ شہر کی رونقیں گئی اور اس کے مشہور کلوزیم میں جھاڑیاں اُگ آ ئیں۔ اس کی عمارتیں خستہ ہو کر گرنا شروع ہو گئیں اور شہر عبرت کا نمونہ بن گیا۔

یہی صورت حال ہمیں سلطنتوں کے زوال کے بعد ان کے دارالسلطنتوں میں نظر آتی ہے بغداد عباسیوں کے زوال کے بعد گمنامی میں ڈوب گیا، غزنہ، غزنوی سلطنت کی شکست کے بعد معمولی شہر بن کر رہ گیا اور یہی صورت حال آگرہ، دہلی کی ہوئی جس کے گرد و نواح میں ٹوتی عمارتیں اور گرتی حویلیاں اور مقبرے ماضی کی کہانی سناتے ہیں۔

وہ شہر کہ جو تجارت کا مرکز ہوتے تھے، تجارتی راستوں کی وجہ سے خوب آباد رہتے تھے۔ تاجروں کی آمد، منڈیوں کی بہتات شہر کی خوش حالی کا باعث ہوتی تھی، مگر یہ شہر بھی تجارتی

راستوں کے بند یا تبدیل ہونے کی صورت میں اجڑ کر رہ گئے۔

اس کے بعد شہروں کی اہمیت مذہبی زیارت گاہوں کی وجہ سے ہوتی تھی، لیکن ایسا بھی ہوا کہ لوگوں کا مذہب بدل گیا اور پرانے مذاہب کی زیارت گاہ زائرین سے محروم ہوگئیں، ملتان ایک وقت میں ہندوؤں کی زیارت گاہ تھا، مسلمانوں کی آمد اور تبدیلی مذہب نے اس زیارت گاہ کی اہمیت ختم کر کے، اس کی جگہ صوفیاء کے مزاروں کی وجہ سے اس کو ایک اور شکل دے دی۔

اس تناظر میں شہر لاہور کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، تو اس سے اس شہر کی تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ شہر کی تاریخ تو پرانی ہے اس کی بنیاد کے بارے میں بہت سے مفروضے اور متھ وابستہ ہیں، لیکن شہر تاریخی طور پر اس وقت ابھرا جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کر کے پنجاب کو اپنی سلطنت کا حصہ بنایا اور لاہور کو اس کا مرکزی شہر۔ جب پنجاب پر اس کا تسلط قائم ہوگیا تو اب وسط ایشیا، افغانستان اور ایران سے یہاں ماہرین کی آمد شروع ہوئی، جن میں صوفیاء، علماء، ادباء، شعراء، کاریگر، ہنرمند اور اہل حرفہ شامل تھے۔ شہر میں قلعہ کی از سرنو تعمیر ہوئی، امراء کے لیے حویلیاں اور مکانات تعمیر ہوئے، مسجدیں اور خانگاہوں کی ابتداء ہوئی، اور اہل حرفہ نے حکمراں طبقوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے فن اور ہنر کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔ ان سب سرگرمیوں نے شہر میں ایک نئے کلچر کی ابتداء کی۔ ہندو آبادی کے ساتھ مسلمان کی آبادی نے دونوں مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے سے ملایا۔ کیونکہ جب کوئی بڑی امپائر بنتی ہے کہ جس میں مختلف فرقوں کے لوگ ہوتے ہیں تو ان کے عقائد اور مذاہب کے بارے میں رواداری اختیار کی جاتی ہے کہ امپائر میں امن وامان اور خوش حالی رہے۔ لہٰذا شہر لاہور میں بھی اس کی ابتداء ہوئی۔ شہر اس وقت اور اہم ہوگیا کہ جب غزنی یا افغانستان سے غزنوی خاندان کا خاتمہ ہوا اور اس کا آخری فرماں روا خسرو ملک نے لاہور میں پناہ لی۔ اس کا خاتمہ اس وقت ہوا کہ جب محمد غوری نے اسے شکست دے کر شہر لاہور کو اپنی ملکیت میں شامل کر لیا۔

غوری سلطنت کے دوران لاہور ان کی ماتحتی میں رہا۔ یہ اس وقت آزاد ہوا کہ جب محمد غوری کی وفات کے بعد اس کا نائب قطب الدین ایبک ہندوستان کا سلطان بن گیا۔ اس نے دہلی اور لاہور دونوں کو ایک مرکز کی حیثیت دی اور وہ خود لاہور شہر میں چوگان کھیلتے ہوئے

گھوڑے سے گر کر انتقال کر گیا۔ اس کے بعد سے شہر لاہور عہد سلاطین میں ایک اہم شہر رہا، یہ وسط ایشیا اور افغانستان کے درمیان بطور رابطہ کے رہا۔

جب شیر شاہ سوری، ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اسے شہر لاہور سے سخت نفرت تھی، اس کا خیال تھا کہ شہر مغلوں کا حامی ہے، اس لیے اس کی خواہش تھی کی اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا جائے اور اس کی جگہ پنجاب میں ایک اور نیا مرکز بنایا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ''سیدوالا'' گاؤں کو یا اس کے قریب میں اس کی تعمیر کا خواہش مند تھا۔ مگر اس کی حادثاتی موت نے شہر لاہور کو تباہی سے بچا لیا۔

مغلوں کے عہد میں شہر لاہور کی اہمیت اس وقت ہوئی کہ جب اکبر اپنے بھائی مرزا حکیم کی بغاوت کو ختم کر کے کابل سے واپس ہوا، تو اس نے لاہور میں تیرہ برس تک قیام کیا۔ اس دوران پورا مغل دربار لاہور میں آ گیا۔ قلعہ میں نئی عمارتوں کی تعمیر ہوئی اس سے ملحق کارخانہ جات نے شاہی ضروریات کی اشیاء کو تیار کرنے کا کام شروع کیا۔ امراء نے اپنے محلات تعمیر کرائے، شاعروں، علماء اور صوفیاء کے ساتھ صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والے شہر میں آباد ہو گئے۔ شہر کو ایک نئی زندگی مل گئی، یہاں عیسائیوں کے مشن بھی تھے کہ جن سے اکبر دن رات مباحثہ کرتا تھا، ان کے لیے قلعہ میں گرجا بھی تعمیر کرایا تھا بادشاہ کے قیام نے شہر میں تجارت کو فروغ دیا، اگر چہ اکبر بعد میں یہاں سے آگرہ چلا گیا مگر شہر کی رونقیں بحال رہیں۔

اس کے بعد سے شہر لاہور مغلوں کا دوسرا دارالسلطنت بن گیا، اکبر کے بعد جہاں گیر نے بھی قلعہ میں نئی عمارتوں کی تعمیر کرائی، اور جب کشمیر سے واپسی میں اس کا انتقال ہوا تو اسی شہر میں وہ دفن ہوا اور اس شہر میں اس کی محبوب ملکہ نور جہاں کا مقبرہ بھی ہے۔

شاہ جہاں تک اس شہر کو مغلوں نے آباد رکھا، عالم گیر دکن میں جا کر ایسا الجھا کہ اس کا تعلق شمالی ہندوستان سے ٹوٹ گیا اور وہ وہیں اورنگ آباد میں مدفون ہوا۔

آخری عہد مغلیہ میں پنجاب سیاسی کش مکش اور انتشار کا شکار رہا، س سے لاہور شہر بھی متاثر ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملوں نے اس شہر کو مزید تباہی سے دوچار کیا۔ اس کے ساتھ ہی پنجاب کے حکمراں طبقوں کی وفاداریاں بھی کبھی کابل کے ساتھ ہوتی تھیں، اور کبھی دہلی کے۔

اس کے ساتھ ہی مرکز کی کمزوری اور پنجاب کے حکمراں طبقوں کی سیاسی سازشوں کے نتیجہ میں ایک نئی طاقت ابھری۔ یہ سکھوں کے جتھے یا مسلح گروہ تھے کہ جنھوں نے اس سیاسی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ دور ''سکھ گردی'' کہلاتا ہے۔ لاہور شہر بھی اس سے متاثر ہوا، اور اس کو ان سکھ سرداروں نے آپس میں تقسیم کر کے، شہر کے امن و امان اور سکون کو تباہ و برباد کر دیا۔ صورت حال اس وقت بدلی کہ جب رنجیت سنگھ نے شہر پر قبضہ کیا اور پنجاب میں اپنے سیاسی تسلط کو مضبوط کیا۔ اس کے دور میں لاہور سکھ حکومت کا کیپٹل بن گیا۔ لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد ایک بار پھر یہاں سازشوں اور قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بالآخر ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔

انگریزی دور حکومت میں، لاہور شہر میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے دہلی کو اجاڑ کر ویران کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ شمالی ہندوستان کے اہم شہر کی حیثیت سے لاہور کو ابھارا جائے۔ اس لیے جب نئے شہر لاہور کی تعمیر ہوئی تو اس کو یورپی شہر کے طرز پر آباد کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے یہ سبق سیکھا کہ شہر کی سڑک کو چوڑا اور کشادہ رکھا جائے تا کہ عوام کے ہنگامہ کی صورت میں پولیس اسے کنٹرول کر سکے۔ یہ سبق انھوں نے یورپ میں ۱۸۴۸ء کے انقلاب سے سیکھا تھا، کہ جب ویانا اور پیرس کے شہر کو اس طرز پہ تعمیر کیا گیا تھا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن کو قلعہ نما بنایا گیا، کہ ہنگامے کی صورت میں انگریز یہاں پناہ لے سکیں۔

لیکن شہر کو جدید طرز پر تعمیر کیا گیا۔ اس کے مرکز کی شاہراہ مال روڈ کاروبار کا مرکز تھی، یہاں درختوں اور پھولوں کی کیاریاں تھیں، جہاں شام کو لوگ چہل قدمی کے لیے آتے اور آپس میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔

شہر میں ضرورت کے تحت پبلک عمارتیں تعمیر ہوئیں، جن میں پوسٹ آفس، عدلیہ، بینک، اسکول، کالجز اور حکومت کے آفس شامل تھے۔ عیسائیوں کے لیے نئے گرجا اور کیتھڈرل بنائے گئے۔

اس کے ساتھ ہی انگریز حکومت نے شہر کو تعلیم کا مرکز بنایا۔ یہاں سب سے پہلے ٹیچر ٹرینگ کالج کی بنیاد رکھی گئی، یہ شمالی ہندوستان کا پہلا ٹرینگ کالج تھا۔ اس کے بعد گورنمنٹ

کالج، اوراورینٹل کالج کی عمارتیں تعمیر ہوئیں، جاگیرداروں اورامرا کے لڑکوں کے لیے ایچی سن کالج بنایا گیا۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوا تو ان دونوں نے اپنے اپنے ادارے قائم کیے۔ یوں لاہور تعلیم کا ایک انتہائی اہم مرکز بن گیا۔ اس تعلیمی مرکز کی وجہ سے شہر میں پروفیشنل کلاسز پیدا ہوئیں، جن میں ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، اساتذہ اور گورنمنٹ کے اداروں میں کام کرنے والے کلرک اور افسر تھے۔ حکومت نے خاص طور سے اردو کی ترقی کے لیے کوشش کیں، اور کرنل ہال رائڈ کی سربراہی میں یہاں نئے طرز کے مشاعروں کی بنیاد پڑی، محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے ان مشاعروں میں مختلف سماجی موضوعات پر نظمیں پڑھیں۔

تعلیمی اداروں نے شہر میں ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا، شعراء اور ادباء کی ایک بڑی تعداد نئے ماحول میں ابھری، ان حالات میں شہر اشاعتی اداروں کا بھی مرکز بن گیا کہ جہاں سے بڑی تعداد میں کتابوں کی اشاعت ہونے لگی۔ اہل دانش کے جمع ہونے کی وجہ سے شہر میں ایسے ہوٹل اور بیٹھکیں ابھریں کہ جہاں یہ لوگ آپس میں ملتے تھے اور بحث ومباحثہ کرتے تھے۔

شہر میں ہندو، سکھ، مسلمان، جین، بدھ اور عیسائی مذہب کے ماننے والے مل جل کر رہتے تھے۔ ایک مشترک کلچر کی بنیاد پڑ رہی تھی کہ جس میں مذہبی رواداری کا جذبہ جڑ پکڑ رہا تھا۔ شہر کی فضا کاسموپولٹن تھی۔ لڑکیاں سائیکل پر اسکول، کالج جایا کرتی تھیں اور ان کے اس رویہ کے خلاف کوئی ردعمل نہیں تھا۔

شہر کا ماحول ۱۹۲۴ء کے بعد اس وقت بدلنا شروع ہوا کہ جب ہندوستان میں مذہبی فرقہ واریت کی ابتداء ہوئی، اس کے نتیجہ میں یہاں بھی آریہ سماج اور مسلمانوں کی مختلف تنظیموں نے اس کو ہوادی، اس نے شہر کے ماحول کو بدلنا شروع کر دیا۔ یہی مذہبی جذبات تھے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد قتل وغارت گری کی شکل میں ابھرے، اور یہاں سے ہندوؤں اور سکھوں کا شہر سے انخلا ہو گیا۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم نے شہر کو بُری طرح سے متاثر کیا، سکھوں اور ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ چلا گیا اور سماج میں جو مختلف مذاہب کا اشتراک تھا، اس کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی مذہبی عمارتیں مندر اور گردوارے ویران ہو گئے، ان کی جگہ جو مہاجرین مشرقی پنجاب سے آئے، وہ تعلیم یافتہ اور

جدید ذہن کے مالک نہیں تھے، اس لیے ماحول میں تبدیلی آئی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیاں محدود ہوکر رہ گئیں۔ تعلیمی اداروں میں ماہرین کی کمی ہوگئی، شہر کا آزاد ماحول پس ماندہ ہوگیا۔

تقسیم کے بعد، لاہور شہر نے اپنی روایات کو قائم رکھا، اس کے ابتدائی زمانے میں تعلیمی اداروں میں باصلاحیت اساتذہ تھے، شہر کے دانش ور ہوٹلوں اور بیٹھکوں کے ذریعہ ادبی مناظرہ کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ ماحول بدل رہا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ہونے والے قادیانی فسادات نے لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھارا، مذہبی جماعتوں کے اثرات بڑھنا شروع ہوئے، شہر میں فرقہ وارانہ نفرتیں ابھرنے لگیں۔ شہر میں اس وقت تبدیلی آنا شروع ہوئی کہ جب یہاں ہر فرقہ کے ماننے والوں نے اپنی اپنی مسجدیں علیحدہ بنانا شروع کر دیں، یہ مذہبی اختلافات ابتدا میں معمولی تھے، مگر آہستہ آہستہ ان میں تیزی آتی چلی گئی۔

جب شہری آبادی بڑھی تو اس کے ساتھ ہی شہر امیر و غریب میں تقسیم ہوگیا اس سے پہلے محلوں میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ امراء کی حویلیاں تھیں مگر اس محلہ میں غریب بھی آباد ہوتے تھے۔ یہ محلے پیشہ وروں کے حساب سے آباد تھے، مگر اب امراء کی بستیاں شہر کی غریب آبادیوں سے علیحدہ ہوگئیں اور صاحب حیثیت لوگ اپنے پرانے محلوں کو چھوڑ کر گلبرگ اور ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں منتقل ہونے لگے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ نہر اس طرف کی سرحد ہے۔

شہر کا کاسموپولٹن ماحول بھی بدل گیا۔ اب لڑکیوں کے لیے سائیکل پر جانا ناممکن ہوگیا۔ مذہبی اور جاگیردارانہ روایات نے آزاد خیالی اور جدیدیت کو روک دیا۔

لاہور کی تاریخ کے اس مختصر تبصرہ سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ شہر اپنے آپ کو بدلتے رہتے ہیں، مگر المیہ یہ ہوتا ہے کہ جب شہر ایک ترقی یافتہ کلچر سے پس ماندگی کی جانب چلا جائے تو یہ شہر کی خوبصورتی اور رعنائی کو ختم کر دیتا ہے۔ شہر لاہور کہ جو باغوں کا شہر کہلاتا تھا، اب صرف ان کے نام رہ گئے ہیں۔ وہ باغات غائب ہو گئے ہیں۔ وہ شہر کہ جہاں ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلمان مل جل کر رہتے تھے، اب مسلمانوں کے فرقوں میں یا دہشت گردوں کی لپیٹ میں ہے۔

دانشوروں کی بیٹھکیں کہ جن کا ذکر پڑھنے کو ملتا ہے۔ جن میں عرب ہوٹل، نگینہ اور چائنیز وغیرہ تھے، ادیبوں کی آخری آماجگاہ پاک ٹی ہاؤس کے بند ہونے کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا

ہے۔ تعلیمی ادارے کہ جہاں ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں ہوتی تھیں جہاں کل پاکستان مباحثے ہوتے تھے، اب ان کی جگہ طلباء کی جماعتوں کے درمیان لڑائی جھگڑوں کی جگہیں ہوگئی ہیں۔

اگرچہ لاہور اب بھی اخبارات کی وجہ سے اور ناشرین کی وجہ سے مشہور ہے، مگر ان اخبارات میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اور ناشرین جو کتابیں شائع کرتے ہیں۔ ان سے دانشوروں کے ذہن کی پس ماندگی پوری طرح سے ابھر کر آتی ہے۔

جیسا شہر کا ماحول ہوتا ہے۔ اس کے رہنے والوں کا بھی اسی طرح کا ذہن بنتا ہے۔ شہر لاہور کے باسی اب کھانے پینے کی وجہ سے مشہور ہیں، شہر میں ہوٹلوں اور ریستورانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، مگر علمی و ادبی ماحول کے زوال پذیر ہونے کی وجہ سے ذہنی وسعت ختم ہو رہی ہے۔

کیا شہر لاہور ایک بار پھر نئی کروٹ لے گا اور اس کا علمی و ادبی ماحول ابھرے گا، کیا آنے والی نسلوں کو اس کی ضرورت ہے؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ شہر شاید ایک پھر ایک توانا کلچر کو پیدا کرے گا۔ دوسری صورت میں اس کا ذہنی کھوکھلا پن اسے تاریخ میں غائب کر دے گا۔ یہ انتخاب لاہور کے شہریوں کا ہے کہ وہ کس کا انتخاب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر غافر شہزاد کا تخلیقی سفر

غافر شہزاد نے لاہور اور پنجاب کی خانقاہوں کو جدید تر تناظر میں دیکھتے ہوئے کئی نئی جہات دریافت کی ہیں۔ان کے ہاں تخلیق اور تحقیق کے باہم ملاپ نے زبان وبیان کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔

- لاہور کے مینار
- لاہور۔گھر گلیاں دروازے
- تعمیر و جمالیات۔۔مساجدِ لاہور
- پنجاب میں خانقاہی کلچر
- تعمیر وتوسیع خانقاہ بابا فریدؒ
- داتا دربار کمپلیکس۔تعمیر سے تکمیل تک
- لاہور۔نئی صدی، نیا عہد (زیرِ طبع)
- شیکسپیئر کے دیس میں (زیرِ طبع)

غافر شہزاد کی کتابوں کے نئے ایڈیشن
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کر دیئے ہیں

لاھور۔ سفرنامے

اکبر کا ہندوستان

فادر مونسراٹ
ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی

مونسراٹ اس عیسائی مشن کا ایک رکن تھا جو گوا سے اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ یہ ۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۲ء تک ہندوستان میں رہا۔ لاہور کے بارے میں اس کا یہ بیان اس کی کتاب کے اردو ترجمہ ''اکبر کا ہندوستان'' سے لیا گیا ہے۔

لاہور

اب میں کچھ لاہور کا ذکر کر دوں۔ یہ شہر اپنی آبادی، سائز اور خوش حالی میں ایشیاء، یورپ میں یگانہ ہے۔ اس شہر میں ایشیا بھر سے آئے ہوئے تاجروں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ یہ شہر ہر چیز میں دوسرے شہروں سے بڑھا ہوا ہے اور دنیا بھر کی اشیاء یہاں دستیاب ہیں۔ کوئی صنعت دست کاری نہیں کہ جو یہاں موجود نہ ہو آبادی اس قدر ہے کہ سڑکوں اور گلیوں میں کھوے سے کھوا چلتا ہے۔ قلعہ جو کہ اینٹوں سے تعمیر ہوا ہے۔ یہ رقبہ میں تین میل کے اندر پھیلا ہوا ہے۔ قلعہ ہی میں ایک بازار ہے کہ جس کے اوپر گرمی، سردی اور بارش سے بچاؤ کے لیے لکڑی کی چھت ہے۔ یہ اتنا عمدہ نمونہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی اس کو اپنانا چاہیے۔ اس بازار میں خوشبوئیں فروخت ہوتی ہیں۔ اس لیے خوشبوؤں سے یہ ہر وقت مہکتا رہتا ہے۔ قلعہ کے باہر شہر کافی پھیلا ہوا ہے۔ اس کی عمارتیں اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ اس کے دولت مند شہریوں میں برہمن اور دوسری ہندو ذاتیں ہیں۔ خاص طور سے کشمیری۔ کشمیریوں کی تجارت یہ ہے کہ ان

کے تندور ہیں کہ جہاں یہ روٹی فروخت کرتے ہیں۔ ہوٹلوں اور سرایوں کے مالک ہیں اور کاٹھ کباڑ جمع کر کے اسے بیچے ہیں، یہ اس قسم کی تجارت ہے کہ جو ہمارے ہاں یہودی کرتے ہیں، اس سے ان کا یہودیوں سے تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ شہر کے اردگرد کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے۔

جب مرزا حکیم نے حملہ کیا تو وہ اس شہر کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس کے مشرقی جانب ایک باغ میں اس نے اپنا کیمپ لگایا تھا۔ اس نے قلعہ کے کمانڈر مان سنگھ سے کہا تھا کہ وہ قلعہ اس کے حوالے کر دے۔ لیکن اس نے جواب دیا تھا کہ "میں تمہارے بھائی سے غداری نہیں کروں گا کہ جس نے یہ قلعہ میری نگرانی میں دیا ہے۔ اگر تم اپنی قسمت آزمانا چاہتے ہو تو آؤ اور قلعہ پر حملہ کرو۔ میں تمہارا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تمہیں اپنی فوجی برتری پر ناز ہے، تو مجھے اپنے آدمیوں کی بہادری پر اعتماد ہے کہ جو ہزار مرتبہ زندہ رہنے کے مقابلہ میں مرنا پسند کریں گے۔ اگر تم حملہ کر کے قلعہ پر قبضہ کر لو گے تو میں اپنی زندگی قربان کر دوں گا۔ میری ایک ہی خواہش ہے اور وہ یہ کہ میں بادشاہ کے ساتھ وفادار رہوں۔"

مرزا حکیم نے اس امید میں کہ قلعہ پر اس کا قبضہ ہو جائے گا اس نے شہر کے لوگوں سے اپنے تعلقات بہتر بنائے رکھے۔ اس نے فوجیوں کو سختی سے منع کیا کہ نہ تو چوری کی جائے اور نہ لوٹ مار۔ چونکہ شہر کے گرد کوئی فصیل نہیں تھی اس لیے پورا شہر کھلا ہوا تھا۔ اسی لیے اس نے تاجروں اور شہریوں کو یقین دلایا کہ انہیں اپنی حفاظت کے بارے میں بالکل نہیں ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی جنگ ان سے نہیں بلکہ قلعہ کے کمانڈر سے ہے۔

جہانگیر کا ہندوستان

پیل سے ئرٹ
ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی

پیل سے ئرٹ(Paelsert) ڈچ سیاح تھا جو جہاں گیر کے عہد میں ہندوستان آیا، یہ ۱۶۲۵ء سے ۱۶۲۷ء تک یہاں رہا۔ لاہور کے بارے میں اس کا یہ بیان اس کے سفرنامہ کے اردو ترجمہ ''جہانگیر کا ہندوستان'' سے لیا گیا ہے۔

واقع صوبوں کا ذکر

لاہور، آگرہ سے ۳۰۰ کوس مشرق، مغرب میں واقع ہے۔ انگریزوں کے آگرہ آنے سے پہلے یہ ہندوستان کا مشہور تجارتی مرکز تھا اور یہاں پر آرمینا اور شام کے تاجر منافع بخش تجارت کرتے تھے۔ اس وقت نیل کی اہم منڈی آگرہ نہیں بلکہ لاہور تھا، کیونکہ یہ ان تاجروں کے لیے سہولت کا باعث تھا کہ جو مقررہ موسموں میں قندھار سے اصفہان اور شام قافلوں کی شکل میں جاتے تھے۔ اس لیے نیل شام کے راستے سے یورپ جاتی تھی، یہ یورپ میں لاوَری یا لاہوری کہلاتی تھی، اب بھی یہاں سے گولکنڈا، منگا پٹنم اور مالی پٹم کے بنے ہوئے کپڑوں کی تجارت ہوتی ہے، مگر بہرحال تجارت کی پہلی والی صورت اب باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ تجارت مر چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سے درآمد کرنے والی اشیاء اب صرف ترکی اور ایران کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں کہ جس کی مانگ محدود ہے۔ چونکہ اب تجارت خشکی سے زیادہ سمندری راستوں سے ہوتی ہے، اس لیے اس کی اہمیت گھٹ کر رہ گئی

ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر لاہور کی تجارت عملی طور پر ختم ہوگئی ہے، ہندو یا کھتری تجار جو یہ تجارت کرتے تھے ان کی شہرت اب تک باقی ہے، مگران کا گزارہ پرانے کمائے ہوئے منافع پر ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ سے موجودہ بادشاہ سال کے پانچ یا چھ مہینے لاہور میں گزارتا ہے (بقیہ وقت، خصوصیت سے گرمیوں کا زمانہ یہ کشمیر یا کابل میں رہ کر گزارتا ہے) اس کی رہائش کی وجہ سے شہر کی حالت تھوڑی بہت بہتر ہوگئی ہے۔ لیکن اس کی یہ ساری شان وشوکت، شاہی عمارتوں، محلات باغات اور شاہی اخراجات کی وجہ سے ہے، اس لیے اس کے اثرات بھی محدود ہیں۔ شہر کے ساتھ ہی دریائے راوی بہتا ہے، یہ کشمیر کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ملتان سے ہوتا ہوا ٹھٹھہ و بھکر کو جاتا ہے۔ اس میں چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ تجارتی سامان لیجایا جاتا ہے۔ لاہور سے گرہ خاص طور سے قالین آتے ہیں جو کہ وہاں تیار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کابل سے پھل اور قندہار و ملتان سے دوسرا سامان آتا ہے۔ آگرہ سے لاہور وہ مصالہ جات جاتے ہیں کہ جو ہم یہاں پر لاتے ہیں۔ (ان کی مقامی کھپت اس وقت کم ہو جاتی ہے کہ جب یہاں بادشاہ کا قیام نہیں ہوتا ہے، یا جب کوئی فوجی کیمپ نہیں ہوتا ہے) اس کے علاوہ ہر قسم کی سفید کاٹن کے کپڑے، جن میں بنگالی اور گولکنڈہ کے بنے ہوئے شامل ہوتے ہیں۔ احمد آباد کی بنی ہوئی پگڑیاں پٹکے، اور سلک کے کپڑے، پٹنہ کی سلک، ان چیزوں کے ساتھ ساتھ لاکھ، کالی مرچیں اور دوسری بہت سی اشیاء کہ جن کے نام لینا مشکل ہے۔ ان کی یہاں کھپت ہے۔

برنیئر کا سفرنامہ ہند

ڈاکٹر فرانسس برنیئر
ترجمہ: خلیفہ محمد حسین

برنیئر: فرانسیسی سیاح، جو ہندوستان میں ۱۶۵۵ء سے ۱۶۶۸ء میں رہا۔
لاہور کے بارے میں اس کا یہ بیان، اس کے سفرنامے کے اردو ترجمہ
سے لیا گیا ہے۔

پنجاب کے دریاؤں اور شہر لاہور کا بیان

صاحبِ من! یہ امر بے وجہ نہیں ہے کہ وہ ملک جس کا پائے تخت لاہور ہے پنجاب کہلاتا ہے کیونکہ واقع میں پانچ دریا ان بڑے پہاڑوں سے جنہوں نے ولایت کشمیر کا محاصرہ کیا ہوا ہے نکل کر اور اس صوبہ کے میدانوں میں بہہ کر دریائے اباسین میں گرتے ہیں جو ملک سندھ میں خلیج فارس کے دہانے کے قریب سمندر میں جاملتا ہے۔

میں یہ امر معین نہیں کر سکتا کہ لاہور وہی قدیم شہر جس کو یونانی لوگ بیوس فلا کہتے تھے۔ کیونکہ اگرچہ الیگزینڈر کا نام جس کو اس ملک میں سکندر ابن فیلقوس کہتے ہیں، بخوبی معروف و مشہور ہے مگر یہاں کے باشندے اس کے گھوڑے کی نسبت کچھ واقفیت نہیں رکھتے۔

لاہور کے قریب جو راوی دریا ہے، اس کا ذِکر

وہ دریا جس کے کنارے شہر لاہور آباد ہے، پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک بڑا دریا ہے۔ جیسا فرانس میں دریائے لوائر ہے اور ویسے ہی بلند اور سنگین پشتہ کا محتاج ہے جیسا کہ لوائر کے کنارے پر بنا ہوا ہے کیونکہ اس دریا میں اکثر سیلاب آتے رہتے ہیں جس سے بڑا

نقصان ہوتا ہے اور دریا اپنی جگہ کو اکثر بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ چند ہی سال کے اندر پورا نصف میل لاہور سے دور ہٹ گیا ہے جس سے باشندوں کو کمال بے آرامی اور تکلیف ہوئی ہے۔

لاہور کی عمارات کا ذکر

لاہور کی عمارتیں دہلی اور آگرہ کے برخلاف بہت اونچی ہیں اور چونکہ بیس برس سے زیادہ ہوئے کہ بادشاہ مع امراء دربار آگرہ یا دہلی میں رہتا ہے اس لیے لاہور کے اکثر مکانات حالتِ ویرانی میں ہیں۔ بلکہ واقع میں بہت سی عمارتیں بالکل منہدم ہوگئی ہیں اور پچھلے چند برسوں کی شدید بارشوں میں بہت سے باشندے بھی مکانات سے دب کر مر چکے ہیں مگر اب تک بھی چار پانچ بازار بہت بڑے بڑے ہیں جن میں سے دو تین تو طول میں دو میل سے بھی متجاوز ہیں۔ لیکن ان میں اکثر مکانات بالکل ڈھئے پڑے ہیں اور چونکہ دریا کا رُخ تبدیل ہوتا جاتا ہے اس لیے بادشاہی محل دریا کے کنارے سے دور ہو گئے ہیں اور یہ شاہی مکانات بھی اگر چہ بہت عمدہ اور عالی شان بنے ہوئے ہیں لیکن محلات شاہی واقع دہلی اور آگرہ سے ہر ایک بات میں بہت کم ہیں۔

لاہور سے کشمیر کی جانب کوچ کا ذِکر

دو مہینے سے زیادہ ہوئے کہ بہ انتظار اس امر کے کہ کوہستان کشمیر کی برف پگھل کر راستہ آسانی سے گزر کے لائق ہو جائے، ہم لاہور میں مقیم تھے مگر اب کل کو ہمارا کوچ ٹھہر چکا ہے اور بادشاہ کو تو لاہور چھوڑے دو روز ہو چکے ہیں۔ میں نے کل رات ایک خوبصورت چھوٹا سا کشمیر کے لائق خیمہ خرید لیا ہے کیونکہ میرے دوستوں نے یہ صلاح دی تھی کہ اپنے پہلے خیمے کو جو بڑا اور بھاری ہے اب آگے نہ لے جانا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ کشمیر کے پہاڑوں پر جہاں اونٹ نہیں جا سکتے ہمارے تمام خیموں کے واسطے جگہ ملنی بہت مشکل ہوگی اور چونکہ اس صورت میں مجھ کو اپنی بار برداری کے واسطے مزدور اور قلی درکار ہوں گے تو اپنے پہلے خیمے کے ساتھ لے جانے کی حالت میں بہت خرچ پڑتا۔ والسلام۔

فرے سباشین مان رک کا سفر نامہ

(باب ۶۴)

مان رک
ترجمہ: ڈاکٹر محمد خاں اشرف

مان رک، اطالوی سیاح، جو شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا۔
یہ ۱۶۴۰ء سے ۱۶۴۱ء تک ہندوستان میں رہا۔ لاہور کے بارے میں
اس کا یہ بیان اس کے انگریزی سفرنامے کا ترجمہ ہے۔

(اس باب میں مصنف شہر لاہور، جہاں ایک مغل اعظم اپنے دربار کے ساتھ قیام پذیر تھا، کے حالات کی تفصیل بتاتا ہے اور اس شان وشوکت کا بیان کرتا ہے جو اس نے ''نوروز'' کے جشن پر دیکھی جسے مسلمان قوموں کا بڑا حصہ ہر سال مناتا ہے)

گزشتہ باب میں میں نے بتایا تھا کہ جب ہم شہر لاہور پہنچے دیر ہو چکی تھی اس لیے ہم شہر میں داخل نہ ہوئے تھے، سو اگلے دن، اس سے پہلے کہ سورج (شمسِ اعظم ،اوقات کا ناظم) طلوع ہوا اور دیکھا کہ کیا وقت ہے ہم شہر میں داخل ہوئے یہ وہ وقت تھا جب رات کی استراحت کے بعد لوگ اپنے نرم یا سخت بستروں کو چھوڑ کر، اپنے گھروں سے نکلنا شروع ہو رہے تھے۔ پس چونکہ گلیاں بازار خالی تھے ہم آسانی سے بڑھتے چلے گئے۔ ہم فرنگیوں کی قیام سرائے کے متعلق دریافت کر رہے تھے کہ اچانک ہمیں سوسائٹی کے فادر جوزف ڈی کاسٹرو مل گئے جو گھوڑے پر سوار آ رہے تھے چونکہ میرے ہمراہیوں نے ان کو فوراً پہچان لیا تھا میں نے ان کو لاطینی میں مخاطب کر کے سلام کیا اس پر انہوں نے چونک کر گھوڑے کو روک لیا میں نے اسی

زبان میں بات جاری رکھتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں ان کے لیے خطوط لایا ہوں وہ اتر آئے اور میرے ساتھ چھکڑے میں بیٹھتے ہوئے اپنے ہمراہیوں کو گھر چلنے کا حکم دیا جہاں پہنچے اتر کر انہوں نے میرا بڑی فراخ دلی سے استقبال کیا اور میرے پہنچنے پر بڑی مسرت کا اظہار کیا خاص کر اس لیے بھی کہ انہیں پتہ تھا کہ میں فادر پرائر فرے انٹونیو دی کرسٹو کی رہائی کی درخواست کرنے کا حکم نامہ لایا ہوں اور جس کے متعلق میں اس وقت تفصیل بیان کروں گا جب میں ان کارناموں کے متعلق بتاؤں گا جو خدا کے اس خدمت گار نے ان علاقوں میں انجام دیے۔

اب میں اس طرف توجہ کرتا ہوں جس کا میں نے اس باب کے عنوان میں وعدہ کیا ہے میرے نزدیک لاہور کا شہر ایک انتہائی خوبصورت مقام پر واقع ہے جس کو ایک بڑا اور خوشگوار دریا روشن اور دیدہ زیب بناتا ہے وہ ایک طرف صاف اور صحت مند پانی کثرت سے بہم پہنچاتا ہے جو وہ کشمیر کی سلطنت کے بلند سطح مرتفع سے لے کر آتا ہے اور زمین کو سادہ لیکن مشترکہ طاقت سے زرخیز بناتا ہے اور سیراب کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پھر ملتان کے شہر پہنچتا ہے اور وہاں پر مشہور و معروف اور وسیع سندھ میں داخل ہو کر اپنے منبع کو خراج پیش کرتا ہے لاہور کا یہ شہر جو کہ مغل سلطنت کا دوسرا بڑا شہر ہے ایک طرف تو دہلی کے بعد دارالحکومت ہونے کی وجہ سے مشہور ہے اور دوسری طرف اپنی دولت اور شان و شوکت کے لحاظ سے جانا جاتا ہے جو کہ بڑے بڑے محلات اور باغات، پھلوں سے لدے باغیچوں، پانی بھرے تالابوں، فواروں سے سجا بنا ہوا ہے۔ میں اس کے بازاروں میں سامان اور ضروریات کی کثرت کو بیان کر کے بات کو طول نہیں دینا چاہتا محض یہ کہنا کافی ہے کہ متجسس قاری اس لکھے کو پڑھ لے جو میں نے اس کے نواح کے متعلق بیان کیا ہے۔

وہ مال و دولت جو اس وقت اس کے مرکزی رہگزر کو حاصل تھی یا جیسا کہ مقامی لوگ جس کو چوک بازار پکارتے ہیں۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ ان علاقوں کو یورپ کے طاقتور ترین اور امیر ترین علاقوں پر بھرپور فوقیت حاصل تھی خاص طور پر ان اوقات میں جب بادشاہ یہاں موجود ہو اور جشن نوروز کے اس سال جو رمضان میں تیس روزوں کے بعد واقع ہوا تھا یہ جشن یہ لوگ آٹھ دن تک مناتے ہیں اور اس کو نوروز (نوروز قدیم ایرانی موسم بہار کا تہوار ہے) اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ یہ سال کا پہلا دن ہے اور اس کا نو دن جشن منایا جاتا ہے

اس دوران یہ اپنے بہترین لباس زیب تن کر کے ایک دوسرے کو ملنے جاتے ہیں مبارکباد یں دیتے ہیں ایک دوسرے کے لیے مسرت آمیز جشن کا اظہار کرتے ہیں عام لوگ اور زیادہ عقیدت مند بھی اس کو مناتے ہیں یہ لوگ اپنے دروازوں اور گزرگاہوں کو سبز شاخوں سے سجاتے ہیں یا پھر چونے سے سفیدی کرتے ہیں اور سفیدی پر (سیندور) سے نقش ونگار بناتے ہیں جو کہ ارغوانی رنگ ہے ان علاقوں میں اس کو جشن کی علامت سمجھا جاتا ہے ان دنوں میں مغل اعظم شان وشوکت اور شکوہ کا اظہار کرتا ہے اور پورے دن وہ اپنے عظیم اور خوبصورت آراستہ ایوان میں لگاتار دربار لگاتا ہے لیکن اس بات کا بیان کرنے سے پہلے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے اس کی شاندار تیاری کا ذکر کریں جشن سے پہلے اس سے قبل کہ پیلا ماہتاب اپنی دھیمی روشنی کو دھرتی ماتا پہ ظاہر کرے، شاہی محل کے برج، گنبد اور ان کی بلند دیواریں چمکدار روشنیوں سے منور ہو گئیں یہ رنگدار پردوں میں سے جھانکتے ہوئے پھولوں کے ایک میدان کا منظر پیش کر رہی تھیں اور اگر یہ قدرتی منظر اس وقت نظر کو زیادہ خوبصورت اور خوشگوار لگتا ہے جب سبز درختوں سے سجا ہو تو وہ مصنوعی منظر جس کا ہم بیان کر رہے ہیں کم خوبصورت نہیں تھا یہ مختلف طرح کے سبز ریشمی جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔

اس شاہی محل کے پرشکوہ دروازے پر ایک بڑا وسیع اور خوبصورت احاطہ تھا جو میرے خیال میں ایک چھوٹی توپ کے گولے کی حد تک وسیع تھا یہ لمبا تھا اور اسی تناسب سے چوڑا تھا یہ بذات خود ہی ایک نہایت عمدہ اور خوبصورت منظر پیش کر رہا تھا حقیقت یہ ہے کہ یہ اس سے بھی زیادہ تھا کیونکہ اس میں بادشاہ سلامت کا محافظ دستہ سجا ہوا تھا یہ دستہ گھڑسواروں کا ایک عظیم الشان جتھہ تھا اور لوگ کہہ رہے تھے کہ اس کی تعداد چار ہزار ہے وہ سب کشیدہ کاری سے مرصع سلک کے لباس سے سجے ہوئے تھے مرد قیمتی اور خوبصورت جشن کے لباس پہنے ہوئے تھے ان کے ہاتھوں میں سنہری، رنگین اور قبضے لگی ڈھالیں، کمانیں اور ستر تھے ان کے کمر بندوں سے متزاد و خمدار تلواریں لٹک رہی تھیں ان میں سے کچھ سونے سے مرصع تھیں، کچھ چاندی سے، اور باقی جن پر قیمتی دھاتیں نہ تھیں وہ مرصع تانبے سے سرخ تھیں ان کے کمر بندوں سے تلوار کی الٹی سمت نہایت قیمتی اور مرصع ترکش لٹک رہے تھے جو کہ تیز اور پروں والے ڈاٹ سے بھرے ہوئے تھے ان کے پر پرندوں سے تھے، فولاد مرنجی تھا اور قوت بازو کے زور پر جب ان کو چلایا

جاتا تو اپنے نشانے پر قوت سے کھب جاتے تھے یہ تمام گھڑ سوار دو قطاروں میں کھڑے تھے اور
ان قطاروں کے درمیان ایک لمبا اور خوبصورت راستہ بن گیا تھا جہاں یہ ختم ہوتا تھا وہاں یہ دوسرا
راستہ شروع ہوتا تھا جو اتنا طویل تو نہ تھا لیکن زیادہ قوت اور شان و شوکت ظاہر کر رہا تھا یہ چھ سات
ہاتھیوں پر مشتمل تھا جو دو قطاروں میں کھڑے کیے گئے تھے وہ سب اسی طرح مسلح اور تیار تھے
جس طرح وہ جنگ میں شامل ہوتے ہیں ان کے گلوں میں سنہرے تانبے کی گھنٹیاں تھیں اور ان
کے لکڑی کے کجاوے تھے جن کو سیاہ رنگ کیا گیا تھا وہ سیاہ رنگ کی فولادی پلیٹوں سے مزین
تھے ان کی سونڈوں پر تیز شمشیریں تھیں جو پانچ انچ چوڑی تھیں جو دیکھنے میں بہت بڑی اور
خوفناک لگتی تھیں لیکن اسی وجہ سے وہ اچھی بھی لگتی تھیں خاص طور پر جب مختلف قسم کے ریشم اور
رنگوں سے بنائے علم نظر آتے تھے جن سے ان کے کجاوے سجائے گئے تھے جو ہلکی اور نرم ہوا میں
لہرا رہے تھے اور ایسے لگتا تھا کہ وہ لہرا کر اپنی خوشی کا اظہار طاقت ور علمبرداروں کے لیے کر رہے
ہیں جنگی ہاتھیوں کا یہ دستہ صحن کے داخلے تک پھیلا ہوا تھا اور بادشاہ کے دوسرے محافظ دستے کا
مددگار تھا دوسرے صحن میں بھی ایسا ہی راستہ بنا ہوا تھا جس کے دونوں طرف ایک سو ہاتھی ترتیب
سے کھڑے تھے وہ سب مختلف قسموں کے رنگین، خوشگوار اور چاندی سے مرصع کپڑے سے
مزین تھے جن پر بہت سے ریشمی پھول ٹکے تھے اور ان کی رنگا رنگی ان کی خوبصورتی میں اضافہ
کر رہی تھی ان ہاتھیوں کے کجاوے سنہری سونے اور چاندی کے تھے جن میں کچھ پر سائبان
تھے جو ہماری ڈولیوں پر ہوتے ہیں اور کچھ اس کے بغیر تھے ہاتھیوں کی یہ دیوار لوگوں کے کہنے
کے مطابق کیونکہ میں نے خود نہیں گنا دو ہزار سپاہیوں سے گھری ہوئی تھی جو تمام شاندار اور
طاقتور تھے اور لگتا تھا کہ وہ پچیس سے تیس سال کی عمر کے ہوں گے اس صحن سے ایک چوڑے اور
بڑے اچھے بنے ہوئے ہال میں سیڑھیوں سے داخل ہوا جاتا تھا جو اپنی بلند چھت سے لے کر
فرش کی سطح تک مختلف قسم کے جنگی شکار اور تعاقب کے مناظر سے مرصع تھا۔

اس پورے ایوان میں کثیر تعداد میں امراء، مرزے، کماندار اور شرفاء موجود تھے جو سب
بڑی شاندار پوشاکیں پہنے ہوئے تھے اس پہلے ایوان میں دوسرے ایوان میں داخل ہوا جاتا تھا
جو اگرچہ شان و شوکت میں برابر کا نظر آتا تھا لیکن زیادہ شاندار اور معتبر لگتا تھا کیونکہ فرش سے
چھت تک وہ سارے کا سارا بے شمار پھولوں سے سجا اور رنگا ہوا تھا جن کی چمک اور رنگا رنگی سے

ایسے لگتا تھا کہ وہ گرمیوں کے سورج کا مذاق اڑا رہے ہیں اور برباد خزاں میں بھی ان کی شان اور خوبصورتی عام ویرانی میں ضائع نہیں ہوتی وہ شدید کہر آلود سردی میں بھی اپنی تازگی برقرار رکھتے ہیں اور جب بہار دوبارہ آتی ہے تو ان کو ہمیشہ اسی بہار کی تازگی میں پاتی ہے اس ایوان میں خواجہ سراؤں کا بھی ایک ہجوم تھا جو کہ سونے اور چاندی سے مرصع زربفت اور سبز ریشم کی پوشاکوں میں ملبوس تھے ان کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے عصا تھے جنہیں اٹھائے وہ ان شہزادوں اور امراء یا نوابوں کو ساتھ لے کے چلتے ہوئے ایک خوبصورت اور وسیع راہداری تک لے جاتے تھے جس کے دروازے پر ایک معمر سفید بالوں والا بوڑھا کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں سنہری عصا اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ وہ ان دربان خواجہ سراؤں کا امیر ہے اور ان دوسو ازبکوں کا بھی جو ہاتھوں میں چھوٹے نیزے اور ڈھالیں لیے توپ داروں میں لمبی اور کھلی راہداری کے دونوں طرف اُس وسیع اور خوبصورت دروازے تک کھڑے تھے جس پر ایک شاندار اور پرشکوہ فتح کا محراب بنا تھا یہ محراب چاندی کے چار ستونوں پر کھڑا تھا اور مختلف طرح کی شاخوں اور پھولوں سے ڈھکا ہوا جو انتہائی نازک رنگوں سے اس طرح مرصع تھے کہ لگتا تھا وہ خوبصورت باغوں میں بھی اصل کا مقابلہ کر سکتے ہیں ان چار ستونوں کی بنیاد چار چاندی اور سونے کے پایوں پہ تھی جن کے اندر کے خلاء میں کئی طرح کے ظروف اور انگیٹھیاں تھیں جن میں مختلف قسم کی نہایت نازک عنبر او خوشبوئیں جل رہی تھیں جو ستونوں کے خلاء سے ہوکر محراب کے عروج پر آپس میں مل جاتی تھیں جہاں سے یہ خوشبوئیں مختلف سوراخوں سے نکلتی تھیں اور اس ہوا کے روش پر جو راہداری کے دروازوں اور کھڑکیوں سے داخل ہوتی تھی تمام قریبی ایوانوں کو نہایت خوشگوار خوشبو سے معطر کر رہی تھیں۔

اسی قیمتی محراب کے داخلے پر بارہ عدد گرز بردار ایستادہ تھے جو اپنے کندھوں پر چاندی کے بڑے بڑے مالے گرز رکھے ہوئے تھے وہ ان لوگوں کو جو شہنشاہی ایوان میں داخل ہوتے تھے راستہ بتا رہے تھے اگر اس طاقتور شہنشاہ کی دولت اور شوکت کی دھوم پرتگالی مصنفوں کی کثیر تحریروں کے ذریعے پہلے ہی سارے طول و عرض میں نہ پھیلی ہوتی تو میں اس درباری ایوان کی شان و شوکت، عظمت اور دولت کو بیان کرنے کی بالکل جرات نہ کرتا لہٰذا ان کی ناقابلِ تردید شہادت کے ساتھ میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اس عظیم ایوان کے چاروں کونے (جو کہ مربع تھا)

فرش کی سطح سے لے کر شفق کی انتہائی بلندی تک، ہر طرح کے پھولوں کے ہاروں سے اور اس کی دیواریں اعلیٰ ترین سونے کی شبیہوں سے اس طرح مرصع اور منقش تھیں جس طرح ہمارے ہاں کپڑے کے پردے لٹکے ہوتے ہیں اگر اتاری جاسکنے والی کپڑے کی شبہیں اپنے رنگ وروپ کی وجہ سے آنکھوں کو بھلی لگتی ہیں تو وہ مستقل نقاشی کتنی زیادہ بھلی اور خوبصورت لگتی ہوگی جس کو میں بیان کررہا ہوں اس مصنوعی رنگ کے مقابلے میں جو وقت کے ساتھ اپنی چمک کھو دیتا ہے اس منقش مینا کاری کے درمیان خالی جگہوں پر اور جہاں بھی ضروری ہو مختلف رنگین کرسٹل اور مختلف قسم کے پتھروں کی نقاشی جڑی ہوئی تھی جو اگرچہ قیمت میں مشرق کے جواہرات میں چوتھے یا پانچویں نمبر پر آتے ہیں لیکن اپنی کثرت میں وہ نہایت شاندار تھے۔ اس کمرے میں دنیا کے قدیم عجوبوں میں آٹھواں جدید عجوبہ ایک انتہائی شاندار تخت ایستادہ تھا۔ اور اگر کچھ اشیاء، خواہ وہ اپنی فطرت میں کتنی بھی اعلیٰ نہ ہوں ہمارے حواس کو منتشر کر دیتی ہیں جیسا کہ سورج کی چمکدار کرنیں بینائی کو چکا چوند کر دیتی ہیں۔ بلندیوں سے گرتے ہوئے غضبناک شوریدہ پانیوں کا شور سماعت کو بہرا اور بے حس کرتا ہے اور معطر نشہ آور ادویات اور مشرقی مصالحہ جات کی خوشبو ہماری قوت شامہ کو تبدیل کر دیتی ہے۔ کوہِ جبلہ کے شہد کی مٹھاس ہمارے ذائقے کو خراب کرتی ہے اور سردی کی شدت ہماری قوت لامسہ کو بے حس اور مردہ کر دیتی ہے تو اس میں کیا حیرت کہ اتنی غیر معمولی اور اعلیٰ شئے جیسا کہ وہ شاندار تخت تھا کے نظارے نے میرے حواس کو اتنا منتشر کر دیا کہ میں اُس کے تمام ترقیمتی اور انمول مواد کا بالکل ادراک نہ کر سکا۔ تاہم میں اپنا وعدہ پورا کرسکوں، میں ان کو بیان ضرور کروں گا تاکہ اس موقعہ پر میری حیران کن شادمانی اور جذبات کو سمجھا جاسکے۔ یہ ایک ایسا تخت تھا جو اپنے گول دائرے میں چار جدا حصوں میں تقسیم تھا جن میں ہر ایک چھ سونے اور چاندی کے پائے رکھتا تھا جہاں فنکار نے اپنی کاریگری کی مہارت میں اپنے فن کی نفاست کا ثبوت دیا تھا اس تخت کے اوپر آٹھ نہایت بیش قیمت سنہری ستون قائم تھے جو سونے ہی کے بنے ہوئے ایک گنبد کو سہارا دیے ہوئے تھے جو اس خوبصورت اور پُرشکوہ تخت کے لیے چھتری یا سائبان کا کام دے رہا تھا جو کہ خود بھی سونے ہی کی بنی ہوئی تھی۔ اس قیمتی چمکدار دھات کی چکاچوند ہماری نگاہوں کے لیے ایک انتباہ کا کام کررہی تھی کہ وہ ان پُرشکوہ نظاروں کے درمیان نہایت ادب و تعظیم کے بغیر ان سب سے بیش

قیمت مظاہر کو دیکھنے کی جرات نہ کرے جس کے ساتھ یہ کہن سال مادر زمین اس جہان کے عظیم اور طاقتور ترین افراد کو خراج تحسین پیش کرنے کی عادی ہے کیونکہ یہاں پر وہ خالص ترین اور روشن و چمکدار وجے نگر کے دیدہ زیب جواہرات نظر آ رہے تھے جو ہمارے سینٹ آئیسبیڈور کے مطابق جادو کا توڑ رکھتے ہیں اور جو اپنے بڑے سائز کی وجہ سے بہت کمیاب ہیں۔ یہاں پر وہ جامنی رنگ کا ایہوا کا لعل بھی نظر آ رہا تھا جو کھلی ہوا میں رکھنے سے سرخ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ہر عالمتاب کی شعاعوں میں چکاچوند پیدا کر دیتا ہے یہاں پر وہ نہایت بیش قیمت سبز زمرد بھی دیکھے جا سکتے تھے جن کی نرم و نازک چمک اور جگمگاہٹ تھکی آنکھوں کے لیے بہت ہی پرسکون اور آرام دہ ہے اور اسی لیے دیدہ وران کی تعریف کرتے ہیں۔ یہاں پر اسی سطح مرتفع کے نیلے نیلم بھی دیکھے جا سکتے تھے جو کہ رنگت میں پرسکون اور چمک میں فلک عالمتاب کی مانند تھے اور جن کے بارے میں حکایت ہے کہ جس کے پاس وہ موجود ہوں اُسے جسمانی لہو ولعب کی شدت سے تازہ دم کرتے ہیں۔ اس منفرد نظارے کی تکمیل کے لیے ارضی و آسمانی زیورات کی کمی نہ تھی۔ بلاشبہ ہم نے دیکھا بحیرۂ ہند اور خلیج فارس نے اسی مقصد کے لیے اتنے خالص ترین اور بالکل گول موتیوں کا خراج پیش کیا تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے جسمانی صحت کے لیے مفید ہیں اور کمزور بینائی کے مرہم میں اکسیر ہیں۔ اس تخت کے گرد چاندی سے بنے زیتون کی تین قطاریں تھیں جو سات ہاتھ بلند تھے۔ یہ تین حصوں میں تقسیم تھے اور ان کے رتبہ اور وقار کو ظاہر کرتے تے جو مغل شہنشاہ کے دربار میں حاضری دیتے تھے۔

باب ۶۴

(جس میں مصنف اس دعوت کا بیان کرتا ہے جو کہ مغل شہنشاہ
اپنی سالگرہ پر ہر سال بپا کرتے ہیں)

اگلے دن سے پہلی رات کو جو کہ شہزادہ خرم (شاہ جہاں) کا یوم ولادت تھا اس کم تر اور بے فائدہ ماہ تاب کے اپنی اس مدہم روشنی کے ساتھ طلوع ہونے سے پہلے جس سے وہ رات کے مدہم سایوں کو روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے، شاہی محل سے توپ خانے کے گولوں کے داغنے کی آواز سنائی دی جن کی گھن گرج اس بات کا اعلان تھا کہ خوشیوں کی رسومات کا آغاز ہو چکا ہے اس سال شاہ معظم جاہ نے اپنے محل میں نہایت ندرت کے ساتھ ان تقریبات کا انعقاد

کیا تھا اور دن کا بڑا حصہ رقص و سرود، مقابلوں اور کھیلوں میں صرف ہو گیا تھا اس کے بعد شہنشاہ نے اپنا دربار برخاست کیا۔ تخت شاہی سے اٹھا اور شہزادوں اور امراء کی بڑی تعداد کی ہم رکابی میں شہنشاہ کے آداب اور ان کی خوشی میں شریک ہونے کے لیے والدہ کے محل میں گیا۔ اس موقع پر شہزادوں اور امراء نے نہایت بیش قیمت تحائف پیش کیے جو اگر ہم مغلوں کی حرص اور طمع کو سامنے رکھیں خاص طور پر اس وحشی شہنشاہ کی جس کے بارے میں میں لکھ رہا ہوں تو میرا یقین ہے کہ یہی ان تقریبات کا اصلی محرک رہے تحائف کے سلسلے کے بعد تقریب کے ختم ہونے پر وہ فوراً اپنے محل واپس آیا جہاں ایک روشن اور خوبصورت ایوان میں اُس نے ایک شاندار اور بھرپور دعوت کا اہتمام کیا تھا واپس پہنچنے پر انہوں نے تمام بندوں کو تیار پایا۔ تمام لوگ اپنے مرتبہ اور درجہ پر اپنی اپنی مقررہ نشست پر بیٹھ گئے۔ اور خواجہ سرا فوراً ہی مختلف اور اعلیٰ ترین اشیائے خورد و نوش پیش کرتے گئے۔ دعوت کے اختتام پر شہزادہ خرم ایک بہت ہی بیش قیمت پرائیویٹ ایوان میں چلا گیا جو کرۂ ارض کی بیش قیمت اور اعلیٰ قدر اشیاء سے مزّین تھا۔ اس حیرت انگیز ایوان کے درمیان میں سونے کی زنجیروں کے ذریعے اس دھات کے دو عدد بڑے ترازو معلق تھے جن کے مدوری کناروں پر بہت سے قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے اس پُرشکوہ تقریب کے لیے شہنشاہ معظم سفید ساٹن کے ایسے لباس میں ملبوس آئے تھے جو نہایت بیش قیمت رنگین جواہرات سے مرصع تھا۔ یہ جواہرات جہاں ایک طرف متنوع رنگوں کی وجہ سے دیدہ زیب تھے اور اپنی قدرتی جسامت کی وجہ سے قابل تعریف تھے انہوں نے گردن میں بھی بڑے بیش بہا جواہرات کی لڑیوں کے ہار پہن رکھے تھے میں ذہنی طور پر سب کے وزن کا اندازہ لگاتے ہوئے سوچتا ہوں کہ اس قدر زیورات اُس کے لیے عالیشان آرائش کی بجائے ایک تکلیف دہ بوجھ ہوں گے۔

بادشاہ سلامت اس دوران اسی طرح سجے سجائے میزان تک پہنچے اور آلتی پالتی مار کر ایک ترازو پر بیٹھ گئے فوراً ہی کچھ امراء اور خدام نے دوسرے پلڑے میں چاندی کے روپیوں سے بھرے ہوئے بیگ رکھنے شروع کر دیے یہاں تک کہ ان کا وزن اتنا ہو گیا اور دنوں پلڑے برابر ہو گئے جب یہ وزن پورا ہو گیا تو انہوں نے چاندی کے تھیلے اتار کر ایک طرف رکھ دیے اور اب اس پلڑے میں دوسرے تھیلے رکھنے لگے جو کہ سونے اور دوسرے قیمتی جواہرات سے

بھرے ہوئے تھے۔ جب یہ بھی وزن میں بادشاہ کے برابر ہو گئے تو ان کو اتار کر اب تیسری دفعہ اس ترازو میں سونے اور چاندی سے بنے خلعت اور لباس، دوسرے قیمتی پارچہ جات اور قیمتی خوشبودار مرکبات اور مصالحہ جات رکھے گئے اس کے بعد چوتھی اور آخری بار وزن کرنے کے لیے مختلف قسم کی اشیائے خورد ونوش مثلاً گندم، نان، آٹا، چینی، مکھن، گھی اور عام قسم کے پارچہ جات رکھے گئے کہا جاتا ہے کہ آخری باری میں تمام اشیاء جو وزن کرنے کے لیے رکھی گئیں فوراً ہی برہمنوں اور بنیا لوگوں کے درمیان بانٹ دی جاتی ہیں لیکن اتنی رازداری کے ساتھ کہ کسی کو بھی اس کا پتہ نہیں چلتا سوائے ان لوگوں کے جو ان کو بانٹتے ہیں یا وہ جن کو یہ ملتی ہیں کیونکہ اگرچہ یہ لوگ ہمارے خیال میں کافر ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ایسی خیرات اور بخشش جو خدا کی راہ میں اور اس کی محبت میں کی جاتی ہے وہ اس وقت بابرکت ہوتی ہے جب اس کو پوشیدہ طور پر کیا جائے اور نمائش نہ کی جائے اور اگرچہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے ان خدائی قوانین کو نہیں مانتے جو کہ اُس نے اپنے مقدس مبلغ میتھیوز کے ذریعے بتائے اور نافذ کیے جبکہ وہ کہتا ہے کہ ''جب بھی خیرات کرو اپنے بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلنے دو کہ دایاں ہاتھ کیا کر رہا ہے تاکہ تمہاری خیرات راز میں رہے ان کا یہ عمل ان ہتھکنڈوں کی واضح ملامت ہے جو اس آفت زدہ زمانے میں ہمارے کچھ کیتھولک عیسائی استعمال کرتے ہیں ایسے ہتھکنڈے اور طریقے جو نہ ہی ہمارے عقیدے کے مطابق ہیں نہ ہی ان مقدس نبیوں کے طریق عمل کے مطابق جن کی ہمیں پیروی کرنی چاہیے کہ وہ اپنی خیرات نیک کاموں کا ناقوس اور بگل باجوں کی صداؤں اور ان ہتھیاروں اور ٹرافیوں کی نمائش اور منادی کے ساتھ اعلان کرتے ہیں جو ان ظروف اور سامانِ آرائش کے متعلق جو مقدس خدا کی عبادات میں استعمال ہوتے ہیں لیکن واعظ و نصیحت کو وقتی طور پر چھوڑ کر میں تاریخ کے دھاگے کو دوبارہ پکڑتا ہوں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پہلے تینوں اہم میزانوں کی قیمت کا بہت احتیاط سے تخمینہ لگایا جاتا ہے اور ان کی مالیت کو فوراً نقد رقم میں تبدیل کیا جاتا ہے اور اس رقم کو شہنشاہ خلوص اور انسانیت نوازی سے سال بھر خیرات کرتا رہتا ہے۔

جب وزن کرنے، قیمت لگانے اور رقم میں تبدیل کرنے کی تقریب ختم ہوتی ہے تو شہنشاہ واپس تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے جب بادشاہ تخت پر بیٹھ جاتا ہے تو سیاہ فام خواجہ سرا اُس

کو سونے کے بڑے طشت اور ظروف پیش کرتے ہیں جو چاندی سے بنائے ہوئے نقلی اور مصنوعی پھلوں سے بھرے ہوتے ہیں جیسے کہ اخروٹ، بادام اور اسی طرح کے مختلف اقسام کے پھل اور سب اس قدر لطیف اور نازک طریق سے بنے ہوئے کہ مجھے یقین ہے کہ اس طرح کے ایک ہزار چاندی کے پھلوں کا وزن پچیس یا تیس اسپینی سپیو کے وزن سے زیادہ نہیں ہوگا (اسپینی پیسو مصنف کے مطابق دو روپیہ کے برابر ہوگا) اور مجھے بعد میں پتہ چل گیا کیونکہ اس موقع پر مرزا عبدالحسن نے ان پھلوں کی ایک طشتری مجھے دی جس کا وزن صرف گیارہ روپے تھا جو کہ ہماری رقم میں ساڑھے پانچ پیسو بنتے ہیں بادشاہ نے یہ پھل شہزادوں اور امراء میں تقسیم کر دیے جس کے بعد اُس نے تازہ بنائے ہوئے روپوں کے بھرے کچھ ظروف ان درباریوں میں بھجوا کر تقسیم کروائے جو کہ کم مرتبہ کے تھے ان روپوں کی تعداد دس یا بارہ ہزار ہوگی جو کہ ہمارے چھ ہزار پیسو یا ریال سے زیادہ کے نہیں تھے ان ہدیہ جات اور تحفوں کی غیر معمولی مقدار جو کہ بادشاہ اس موقع پر اپنے دربار کے امراء اور شہزادوں سے وصول کرتا ہے اس کے ان اخراجات اور تحائف سے بہت زیادہ ہوتی ہے جو کہ وہ خود اس موقعہ پر ان کو بخشتا ہے اس شان وشکوہ کے درمیان میں ایک ایسے واقعہ کا بیان ضرور کروں گا جس کے ذریعے قاری پر شہنشاہ خرم (شاہ جہاں) کی سوچ کا انداز واضح ہو جائے گا اگر وہ دنیا کے امیر ترین اشخاص میں سے ہے لیکن اس کی حد کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی کھوئی ہوئی شے، اگر پائی جائے تو فوراً ان کے حضور پیش کی جائے ہوا یوں کہ اس شاندار جشن کے دوران ایک غریب کو ایک چھوٹا اور گندا سا بٹوہ ملا جس میں تین سنہری اشرفیاں تھیں جو کہ انتالیس چاندی کے روپوں کے برابر ہوتی ہیں وہ اس کو لے کر بادشاہ کے حضور حاضر ہو گیا کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے وہ چھوٹا سا گندا بٹوا اپنے ہاتھوں سے کھولا اور اس سے تینوں اشرفیاں نکال کر دوا اپنے لیے رکھ لیں اور ایک اُس غریب آدمی کو دی جس کو بٹوہ ملا تھا اور ہنستے ہوئے اُسے کہا ''یہ لو تمہارے لیے یہ ہی کافی ہے'' ایسا عمل تو ایک کم تر رتبہ اور مرتبہ کے آدمی کے لیے باعث شرم ہے سوائے اس کے وہ شہنشاہ نہایت ہی بے شرم، حریص اور طمع سے آلودہ ہو

باب ۶۵

جس میں مصنف لاہور شہر میں ہونے والے واقعات کا بیان جاری رکھتا ہے۔

جب یہ تقریبات ختم ہوگئیں تو فادر جوزف دی کاسٹرو نے شہزادہ آصف خاں کو میری آمد سے مطلع کیا چونکہ وقت بہت گزر چکا تھا شہزادہ نے کہا وہ دوسرے دن مجھے بلائے گا رات کو ریونڈ فادر نے مجھے اس اچھی خبر سے مطلع کیا کہ یہ فادر پرائر فرے انٹونیو ڈی کاسٹرو کو چھڑانے کے لیے ایک نیک فال ہے ہم نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ عالی جاہ کے سامنے جانے کا بہتر طریقہ کیا ہے ہم نے اس بات پر اتفاق کیا کہ چونکہ ان کو پہلے ہی معلوم ہے کہ مذہبی آدمی ہوں لہٰذا میرے لیے یہ آسان ہے کہ میں اُن سے اپنے پادری کے لباس میں ملوں تا کہ وہ مجھے زیادہ عزت دے اور زیادہ آسانی سے ملے تا کہ جو کام درپیش ہے زیادہ آسانی سے انجام پائے اس کے لیے ضروری تھا کہ کسی خواجہ سرا سے پیشگی مفاہمت کرنا ہوگی تا کہ وہ مجھے اپنی رہائش گاہ کے اندر داخل کرے جہاں میں اپنا پادری کا لباس پہن سکوں کیونکہ منگول شہزادوں اور امراء کے ہاں یہ رسم ہے کہ جب وہ کسی باعزت شخص خاص کر غیر ملکی کو اپنے حضور بلاتے ہیں تو سواروں کا ایک دستہ اسے ہمراہ لانے اور پیش کرنے کے لیے بھیجتے ہیں اب میرے لیے ضروری تھا کہ میں ان کے ہمراہ منگول لباس میں جو کہ میں اس وقت پہنے ہوئے تھا جاؤں تا کہ کوئی اچنبھا اور اجنبی پن پیدا نہ ہو کیونکہ ہمیں شہر کے مرکز سے گزر کر جانا تھا اس فیصلے کے مطابق اگلے دن، ماس پڑھنے اور خدا سے اپنی مہم کی کامیابی کی دعا مانگنے کے بعد میں نے اپنے عبا کو اپنے دستور کی روایت کے مطابق تیار کرنے کا حکم دیا اس دوران ایورنڈ فادر اپنے خواجہ سرا دوست کی قیام گاہ کا بندوبست کرنے چلا گیا میں نے بھی چین کے کچھ عجائبات کے ساتھ شہزادے کو پیش کرنے کے لیے روایتی تحفہ یا ہدیہ کو تیار کیا کیونکہ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں ان علاقوں کی رسم کے مطابق خالی ہاتھ حضور میں پیش ہونا بدتمیزی اور بدتہذیبی ہے اسی اثناء میں ایک عہدے دار چار گھڑ سوار سپاہیوں کے ساتھ پہنچا میں نے روایتی انداز میں اس کا استقبال کیا استقبالی تقریب کے اختتام پر اس نے مجھے بتایا کہ نواب اعظم نے مجھے یاد کیا ہے اس حکم کے سننے پر میں نے اپنے سر کو اطاعت کے طور پر جھکا دیا اور میں نے پیام بر کو ایک خوش باش چہرے اور بہت ہی احسان مند الفاظ میں اس ملک کی روایت اور رسم کے مطابق جس کا میں نے خوب مطالعہ کر رکھا تھا بتایا کہ میں اس اعزاز، شفقت اور احسان کے لیے جو شہزادہ معظم نے مجھ پر کی ہے بے حد ممنون ہوں اور اس پیام بر پر اپنی اس احسان مندی کا نقش مزید بٹھانے کے لیے تا کہ وہ واپس

نواب کے پاس جا کر ہماری اس ملاقات کو اچھے طریقے سے پیش کرے میں نے اس کی شہادت کی انگلی نہیں بلکہ اُس کے ہاتھ کے انگوٹھے پر، مغل رسم کے مطابق ایک ایسی سنہری انگوٹھی پہنائی جس کا نگیں اس کی قیمت سے زیادہ چمکدار تھا اور جس کو میں اپنے ساتھ اس دوسری طرح کے عجائبات اور اشیاء کے ساتھ لے کر آیا تھا کیونکہ یہ ایسے مواقع کے لیے ناگزیر ہوتی ہیں جیسا کہ میں چاہتا تھا۔ اس سیاہ فام عہدہ دار کو وہ انگوٹھی بہت ہی پسند آئی اپنی قدر و قیمت کی بناء پر نہیں بلکہ اپنی عجیب وغریب کاریگری اور چمکداری کے باعث اور وہ عجوبہ تو تھی کیونکہ چین کی بنی ہوئی تھی کاریگری کی مہارت میں چینی لوگ نہ صرف باقی مشرقی اقوام سے بہت بہتر ہیں بلکہ اس میں وہ یورپ کی بہترین کاریگر اقوام سے بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ منگول امیر بہت ہی شادمان ہوا اور اُس نے اپنی ممنونیت کا نہایت مناسب الفاظ میں اظہار کیا پھر ہم سوار ہوئے اور سڑک کے راستے آصف خاں کے محل پہنچ گئے محل کے دروازے پر ایورنڈ فادر ہمارا منتظر تھا انہوں نے ہمارے راہنما سے کچھ لمحوں کی اجازت مانگی اور مجھے اس مکان میں لے گیا جہاں میں نے لباس تبدیل کرنا تھا لباس تبدیل کر کے میں واپس آیا جب میں واپس آیا تو وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے اور بس تکتے ہی گئے کیونکہ میں سوداگر سے اب ایک پادری کے لباس میں تھا پھر وہ مجھے پہچان گئے پھر ہم دروازہ سے داخل ہوئے اور کچھ سپاہیوں کے درمیان سے گزر کر ایک اوسط درجے کے دالان یا صحن میں پہنچے جہاں سے پہلے ہی کچھ سپاہی لوگ موجود تھے یہاں سے گزر کر ہم ایک دوسرے دروازے سے داخل ہوئے تو سامنے ایک خوبصورت اور خوشگوار باغ تھا یہاں فطرت اور صناعی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اس سے ہمیں اس محل کے مالک کی عظمت کا اندازہ ہوا دوسرے یہ کہ اس باغ میں اُگے درختوں سے جن میں بہت سے یورپ کے لیے اجنبی ہیں۔ ہمیں پتہ چلا کہ فطرت کے شہنشاہ کے علاوہ اس کی زندگی بخش خواہر بھی ان کو کتنا پسند کرتی ہے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے درمیان ایک دوستان رقابت تھی ہر ایک اپنا اثر ڈال رہا تھا۔ پھلوں سے لادے نہایت دلکش اور سودمند ثمر آور درختوں پر اور مختلف رنگوں کے پھولوں سے بھرے ہوئے گلرنگ پودوں پر، یہ سب دیکھنے میں بھی خوشگوار تھے اور اس کے ساتھ اپنی عطر بنیری سے قوت شامہ کو بھی پرسکون کر دیتے تھے۔ لیکن زمین پر پھیلی بوٹیوں اور گھاس کی مختلف خوشبوئیں بھی حواس کو تسکین پہنچا رہی تھیں۔

یہ جڑی بوٹیاں اور خوشبودار گھاس زمین کو خوبصورت ترین ایرانی قالینوں سے بہتر طور پر ڈھانپے ہوئے تھیں۔ اس نہایت خوبصورت پارک کو میٹھے شفاف پانی کی نالیاں جو مختلف فواروں اور حوضوں سے پھوٹتی تھیں سیراب کر رہی تھیں ان میں کچھ فوارے اور حوض سنہری اور رنگین مکانوں کے اندر تھے جو نہایت دلکش حماموں کا کام دیتے تھے اگرچہ یہ سب مہمانی حمام تھے جن کی دیواروں پر سچے خیر البشر کی زندگی کے مناظر کنندہ تھے۔ سنگین اور ویران صحرا، اور ان کا محل جہاں وہ اونٹ کی کھال میں ملبوس ٹڈی دل اور جنگلی شہد کھانے میں مشغول تھا پھر وہ صحیح آمدہ کو بپتسمہ دینے کی تیاری کر رہا تھا اور جیسا کہ میں پاکیزگی سے سوچ سکتا ہوں کہ وہ خود بھی اوروں کی خالص ترین عبادت گاہ میں بپتسمہ لینے والا تھا وہاں پر حضرت عیسیٰؑ کی بپتسمہ لینے کی تصویریں بھی تھیں اور مقدس روح کو ایک فاختہ کے روپ میں بنایا گیا تھا اس ایوان میں نوحؑ کی کشتی کی تصویر بھی تھی جو اولین عہد کی یادگار تھا اور اس کی بھی جو دوسرے عہد کا۔

ہم ان نظاروں کو دیکھ ہی رہے تھے کہ وہ ساعت آ پہنچی جب کہ شہزادہ معظم اس ایوان خاص میں داخل ہوئے جہاں وہ خاص خاص لوگوں کو شرف ملاقات بخشتے تھے پس ہم ان نشیبی محلات کی طرف روانہ ہوئے جو ایک بہت ہی نفیس باغ کے درمیان بنے تھے ہمارا راہنما ہمیں ایک بیش قیمت اور عجیب عمارت میں لے گیا جو بہت روشن اور خوبصورت تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس میں چاروں طرف کھلی اور خوبصورت کھڑکیاں تھیں جن میں رنگدار بلور کے شیشے لگے تھے اور دوسرے کہ جہاں کھڑکیاں نہیں تھیں۔ وہ جگہیں چاندی کے چمکدار پھولوں اور شاخوں سے سجی ہوئی تھیں اور دیواروں پر غیر متحرک پردوں کی آویزاں تھیں اس عمدہ ایوان کا فرش نہایت مہنگے اور خوش رنگ قالینوں سے مزین تھا کیونکہ وہ قیمتی چھپر کھٹ جو ان کے عین اوپر ایوان کے درمیان دھرا تھا اس سے کم تر اشیاء اور سجاوٹیں اس کے شایان شان نہ تھیں یہ چھپر کھٹ مکمل عمدہ ترین سونے کا بنا تھا اور نہایت ہی نازک اور چمکدار رنگوں کے قیمتی پتھر سے سجا تھا جو اس کے لیے نقاش کا کام کر رہے تھے اور چونکہ یہ بہت بیش قیمت تھا لہٰذا نگاہوں کو اور بھی بھلا لگتا تھا اس بستر پر آصف خاں آرام سے بیٹھا ہوا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ناساز تھی رسمی تسلیمات کے بعد میں انہیں اپنا ہدیہ یا تحفہ اپنے خیال میں بہترین روایتی رسومات اور آداب کے ساتھ پیش کیا اس نے مجھے نہایت خوشگوار اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اذنِ باریابی

دیا اور مجھے اپنے پلنگ کے قریب آنے کا کہا جونہی میں بیٹھا اُس نے مجھ سے انڈیا اور دوسرے ممالک جہاں سے میرا گزر ہوا تھا کے مختلف معاملات کے متعلق سوال پوچھنے شروع کر دیے وہ غیر ممالک کے متعلق جاننے کے لیے بہت متجسس تھا۔ اس اثناء میں ایک کم عمر، خوبصورت اور پروقار خواجہ سرا وہاں آیا جو کہ سفید ساٹن کا لباس جس پر اودی کشیدہ کاری تھی پہنے ہوئے تھا اُس نے بڑے تکلف اور آداب سے جھک کر اور دوزانو ہو کر اُسے نہایت کمیاب اور مہنگا سونے سے بنا پاندان پیش کیا جو پان (یا بیڑی، پتوں) کے بیڑوں سے بھرا تھا جس کے متعلق اس کتاب کے کسی حصے میں پہلے ہی تفصیل سے لکھ چکا ہوں ان پان بیڑوں میں سے شہزادے نے ایک بیڑہ اٹھایا اور اپنے ہاتھ سے مجھے بخشا جو کہ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ یہ ایک ایسا شرف اور عزت افزائی تھی جو بہت کم لوگوں کو میسّر آتی ہے۔ میں نے اس عزت افزائی کو رسمی اور روایتی آداب کے ساتھ قبول کیا اور موقعہ مناسب پا کر میں نے اس تمام انکسار اور سنجیدگی کے ساتھ جو میں بجا لاسکتا تھا فادر پرائر فرے انٹونیو دی کرسٹو کی رہائی کی درخواست کی۔ میں نے یہ بھی عرض کی کہ ریورینڈ فادر پہلے ہی کسی وجہ کے بغیر نو سال قید سخت کاٹ چکا ہے میں نے یہ بھی خاص طور پر عرض کی کہ سب کو پتہ ہے کہ یہ ان لوگوں کی غلطی زیادہ ہے جن کو ان کی رہائی کی درخواست کرنا چاہیے تھی نہ کہ بادشاہ کے وزراء کی یہ جانتے ہوئے ریورنڈ فادر دو دفعہ فرار ہو چکا تھا انہوں نے اس معاملے کو نظر انداز کیا تھا جبکہ دوسرے لوگ ذاتی ارادوں کو پوشیدہ رکھتے ہوئے (جو کسی بدنامی سے بچنے کے لیے میں یہاں بیان نہیں کروں گا) اور اس انتباہ کے بہانے جو انہوں نے دیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے خرچ پر چوہدری کے ملازمین کو ریورنڈ فادر کو تلاش کرنے کے لیے روانہ کیا تھا اور وہ دوسری دفعہ بھی اُسے اس وقت واپس لے کر آئے تھے جب وہ فرار ہو کر آگرہ کے دربار سے پانچ دن کی مسافت پر پہنچ چکا تھا۔

اس معاملے کے بیان میں ایک لمبی تفصیل دی جا سکتی ہے اور شاید یا بغیر کسی شاہد کے ایک یا دو ابواب لکھے جا سکتے ہیں لیکن جبکہ خداوند اعلیٰ اپنی پوشیدہ مشیت میں اس قسم کے لوگوں کو برداشت کرتا ہے اس لیے ہم بھی ان کے ہاتھوں سے نقصانات اور دکھ برداشت کر لیتے ہیں لیکن اس یقین اور ایمان کے ساتھ کہ خدائی عدل ان لوگوں کی برائیوں کے لیے ان کو ضرور سزا دے گا اور اس کے جاننے کا یہ ثبوت ہے کہ وہ اپنے بے انتہا رحم کے طور پر ان پر کوئی مصیبت یا

بیماری بھیجتا ہے کہ وہ اس سے سبق سیکھ کر درست ہو جائیں اور اس کے شدید غصے سے بچ جائیں اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اس کی تائید میں خدائے اعظم سے دعا کریں کہ وہ ان کو ان شیطانی سیاسی طور طریقے چھوڑنے میں مدد کرے جن کو دیکھ کر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اپنے آپ اور اپنی ملکیتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ بھی ان غیر قانونی طریقوں کو استعمال کریں جو ہر چیز کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ہے اگر خدا اپنے بے کراں رحم میں ان کو درست نہیں کرتا تو جو لوگ زندہ رہیں گے وہ دیکھیں گے کہ ان کے متعلق ہمارے تمام اندیشے درست ثابت ہوتے ہیں۔

میں اس کہانی کا رشتہ دوبارہ جوڑتا ہوں شہزادے نے بڑی توجہ سے میری عرضداشت کو سنا اس نے ان تکلیفوں اور مشکلات کو جو ریورنڈ فادر کو بندی خانہ یعنی شاہی قید خانہ میں اٹھانا پڑی ہیں پر ہمدردی کا اظہار کیا اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی آزادی کی یا کم از کم اس کو قید خانے سے رہائی دلانے کی کوشش کریں گے اس مثبت جواب کے بدلے میں نے اپنے پرزور الفاظ میں جو میں کہہ سکتا تھا اور ان مودبانہ اور خاکسارانہ آداب و تعظیم کے ذریعے بھی جو اس ملک کا رواج تھا اور میں نے سیکھ رکھی تھیں ان کے تشکر اور اپنی نیاز مندی کا برملا اظہار کیا۔ انہوں نے یہ انداز دیکھا تو ان خواجہ سراؤں کو مڑ کر بولے جو بڑے خوبصورت اور بیش قیمت پنکھے لیے بستر کے پاس کھڑے بدتمیز مکھیوں اور کیڑے مکوڑوں سے بچانے کے لیے جھل رہے تھے۔

''دیکھو! اگر تم فرنگیوں کے دیس میں ہوتے کیا تم بھی ان کے آداب اور رسوم میں اتنے ہی رواں ہوتے جتنا یہ فرنگی ہمارے آداب سے واقف ہے بلا مبالغہ یہ تو فرنگی کی بجائے ہمارے ملک کا باشندہ معلوم ہوتا ہے۔''

یہ خوشگوار تقریب ختم ہوئی تو ان کے طبیب یا ڈاکٹر (اگرچہ ان میں ماہر ترین کو حکیم کہتے ہیں) آ پہنچے۔ اور انہوں نے مسکراتے ہوئے اور سر جھکاتے ہوئے مجھے الوداع کیا اور ایک خواجہ سرا کو ساتھ کیا تا کہ وہ دروازے پر چوکیداروں کو اس کا یہ حکم پہنچائے کہ میں جب ان سے ملنے آؤں تو مجھے داخلے کی آزادی ہے یہ بھی کوئی کم شرف نہ تھا ان کے یہ احسان اس قدر بڑھ گئے کہ دو دن بعد اس نے میرے اس مکان پر جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا نہایت نازک، نفیس اور اعلیٰ

پھلوں کا تحفہ بھجوایا جس میں دو ایرانی تربوز بھی شامل تھے جو کہ وہ تین سو کوس سے زیادہ دور سے لائے تھے اور اپنی بہت ہی اعلیٰ اور کمیاب خوشبو اور لذت کی بدولت بیس یا تیس روپے کی مالیت کے تھے پھلوں کے ساتھ ایک بٹواہ بھی تھا جس میں تین سو روپے تھے جو کہ ایک سو پچاس پیسو کے برابر ہوتے ہیں میں نے یہ تحائف روایتی آداب کے ساتھ وصول کیے اور اس شہزادے کو اپنے موافق کرنے میں زیادہ اعتماد اور جرأت محسوس کرنے لگا اور انسانی دلوں میں رحم اور محبت پیدا کرنے والے خدائے کامل نے یہ ممکن بنا دیا کہ میں ایک محمڈن (مسلم) حکمران کی آنکھوں میں خیر و برکت حاصل کروں اس سے میں نے ریورنڈ فادر کی رہائی حاصل کی جس کی میں نے درخواست کی تھی جو اس اجازت کے ساتھ ملی کے وہ بنگال جا سکتا ہے جس کا یہ مفہوم بھی نکلتا تھا کہ وہ جہاں چاہے جا سکتا تھا بلکہ میں نے وہ سہولت بھی حاصل کر لی جو میرے ذہن میں بھی نہ تھی کیونکہ وہ تقریباً ناممکن تھی لیکن احسانات کی بادِ صبا سے جرات حاصل کر کے اور موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے شاہی مہر زدہ ایک خصوصی فرمان بھی حاصل کر لیا جو کہ سندھ میں ہمارے کلیسا اور رہائش گاہوں کی تعمیر کی اجازت دیتا تھا اور جن گزشتہ برسوں میں اس شہنشاہ خرم (شاہ جہاں) کے حکم پر اینٹ سے اینٹ بجانے کا حکم دیا تھا خدا کی رحمت کے سبب یہ معاملات طے پا گئے تو مجھے بہت خوشی اور آرام ملا اور میں نے محسوس کیا کہ اس سفر میں جو تھکاوٹ پائی تھی اور مشقت اٹھائی تھی مجھے اس کا بہت اچھا صلہ مل گیا ہے۔ اب مجھے اس غیر ماہر ناخدا کی غلطی بھی ایک خوش قسمتی لگی جس نے ملا پٹنم کی بندرگاہ میں پہنچانے کے بجائے بنگالہ پہنچا دیا تھا اور اب مجھے وہ طویل شاہراہیں اور بہت سے سفر جو ابھی مجھے طے کرنے تھے کہ یورپ پر جانے والی سیدھی سڑک پر پہنچ جاؤں بہت آسان لگے۔

آخر کار ریونڈر فادر کی رہائی حاصل کرنے کے بعد مجھے سندھ جانے کی ضرورت ہوئی اس کی وجہ فرمان شاہی پر عمل درآمد کرنا نہیں تھا کیونکہ یہی کافی تھا کہ میں اس کو ان مذہب والوں کو بھجوا دوں جو وہاں تھے بلکہ اس لیے کہ میں سمجھ گیا کہ شہزادہ آصف خاں چاہتا تھا کہ میں وہاں خود جاؤں اور کچھ ان معاملات اور کاموں کو دیکھوں جو کہ اس نے انڈیا میں وائسرائے کے ساتھ ان پرتگیزیوں کے ذریعے انجام دینے تھے۔ جو وہاں کی فیکٹری میں رہتے تھے اور چونکہ اس ملک میں رہنے والے عیسائیوں کے مفاد ان کی حفاظت اور ان کے رہنے کے لیے ضروری

تھا یہ مجھے اپنے سفر سے پانچ سے چھ ماہ دور لے جائے گا میں نے وقت کے اس ضیاع کو درخور اعتنا نہ جانا کیونکہ پرتگال کے بادشاہ کی تخت نشینی کی افواہ ان علاقوں میں ایک یقینی چیز کا درجہ رکھتی تھی اس لیے معاملات کو سپین کے کیتھولک دربار میں لے جانے کی اب ضرورت نہ رہی تھی اب چونکہ میرے پاس فرصت تھی میں نے انہیں بتایا کہ میں سندھ جانے کا ارادہ کر چکا ہوں میں اس کا بڑا احسان سمجھوں گا اگر وہ مجھے وہاں پر اپنا خادم اور نوکر ہی سمجھے اور استعمال کرے شہزادے نے میری اس پیش کش کو پسند کیا اور میرے عزم کی تعریف کی اس نے اپنے معاملات سے مجھے آگاہ نہ کیا تو اس کے بارے میں مجھے پوری طرح تحریری ہدایات دیں اس نے میرے حق میں فرمان یا پاسپورٹ تیار کرائے تاکہ راستے کی تمام چوکیداریاں اور کسٹم ہاؤس میرے جانے کی پوری آزادی دیں یہ بہت ضروری تھے کیونکہ تمام سفر بہت سے چھوٹے بادشاہوں کی حکمرانیوں سے گزرنا پڑتا تھا جو اگرچہ مغل اعظم کے باج گزار اور ماتحت تھے لیکن اپنے علاقوں میں خود مختار تھے اور اپنے کسٹم ہاؤس اور چوکیداریاں بھی رکھتے تھے اور اپنے قوانین کی خلاف ورزی پر سزائیں دینے میں بھی آزاد تھے۔

باب ۶۴

جس میں اس شاندار اور مشہور مہمانی یا ضیافت کی روداد بیان کی گئی ہے جو پرنس آصف خان نے مغل اعظم کے اعزاز میں منعقد کی۔

میرے شہر لاہور سے روانگی سے پہلے بلند بانگ افواہوں نے بتایا کہ بادشاہ اپنے سسر آصف خاں کی ملاقات کو جا رہا ہے تاکہ اس کو صحت یابی پر مبارکباد دے سکے یہ بات میری لاہور سے روانگی کی مقررہ تاریخ کو دو دن ملتوی کرنے کی وجہ بنی کیونکہ میں ایسے پروانے کا منتظر تھا جس کی مجھے ضرورت تھی لہٰذا میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا کہ اس شاندار اور اعلیٰ ضیافت کو دیکھ سکوں جو کہ شہزادے نے اپنے آقا اور شہنشاہ کے لیے برپا کی اور اس آزادی سے فائدہ اٹھا کر جو مجھے میسر تھی ان حدود میں داخل ہوں جہاں تک آداب اجازت دیتے تھے میں نے یہ اجازت بھی حاصل کر لی کہ اس سے آگے جاؤں اور ایک ساتھی کے ساتھ اس گیلری میں داخل ہو سکوں جو کہ حماموں کے ایوان کے اوپر تھی اور جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں ایک خواجہ سرا ہمیں وہاں لے گیا اس نے یہ ہدایت بھی کی کہ ذرا سی آہٹ بھی نہ ہونے پائے اور اگر

ہمیں مجبوری میں کھانسنے کی ضرورت ہوتو اس نے دوسری طرف ہمیں کمرے دکھائے کہ وہاں جا کر کھانسیں پھر ہمیں یہ ہدایت دے کر ہم اس کے واپس آنے سے پہلے ہرگز کوئی حرکت نہ کریں وہ چلا گیا۔

حمام کے اس بڑے ایوان میں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا ان مستقل آرائشوں کے علاوہ جو اس میں پہلے سے موجود تھیں اس موقع پر ریشمی، سیمیں اور سنہری قالین اضافہ کیے گئے تھے جو سارے فرش پر بچھے تھے اور اس ملک کے رواج کے مطابق ان مہمانوں کے لیے جو اس تقریب میں رونق افروز ہو رہے تھے زمینی میزوں اور نشست کے کام آ رہے تھے اور اگر چہ یہ لوگ اونچے میزوں کو بے کار خیال کرتے ہیں ان کا استعمال نہیں کرتے لیکن یہ شاندار اور قیمتی ایستادہ کو پسند کرتے ہیں اس موقعہ پر ایوان کے چاروں کونوں میں بہت ایستادے تھے ہر ایک کے پانچ قدم تھے اور ہر ایک سونے اور چاندی کی ایرانی سجاوٹوں سے مرصع تھا یہ سائڈ بورڈ اور بوفے کا کام دیتے تھے اور سب پر سونے کے ظروف سجے تھے جن پر سے نظر پھسلتی تھی کچھ پر تو قیمتی پتھروں کی نقش کاری نظر آتی تھی دوسروں پر نہایت ہی چمکدار انیمل تھا ان کی ساخت کا سامان تو مختلف تھا لیکن رنگوں میں ایک جیسی جھلک تھی اتنی ساری شاندار نمائش اور سجاوٹ کے ساتھ ساتھ خوشبوؤں کے بھی کئی برتن تھے جو سلیقے کے ساتھ ایوان میں رکھے تھے اور چاندی کے چھوٹے ظروف تھے جن کی کاریگری بہت غیر معمولی تھی جس میں بہت نازک قسم کے عطر جل رہے تھے جو کہ کافور، عنبر اور اس طرح کے دیگر مرکبات سے بنے تھے۔ جو آپس میں مل کر سکون آور اور قوت شامہ کے لیے خوش کن تھے اس خوبصورت ایوان کے داخلی دروازے پر ایک قابل تعریف کاریگری کا شاہکار سات سروں کا مجسمہ تھا جو چاندی کا بنا تھا مناسب سائز کا تھا اس پر سبز رنگ کے جھرنے تھے اور اس کے ساتھ خمیدہ سروں سے خوشبودار پانی کے سات باریک فوارے ابھر رہے تھے جو اس کے اسی مادے سے بنے ایک بڑے حوض میں گرتے تھے اور اس کو نصف بھرا رکھتے تھے کیونکہ ایک طرف تو وہ پانی جو اس حوض میں پڑتا تھا اس کو خارج بھی کرتا تھا لیکن دوسری طرف اس کی سطح برقرار رہتی تھی تا کہ مہمان اس میں پاؤں دھوسکیں جو مغلوں کے مطابق ان کی رسومات کے آداب کا ایک اہم ترین حصہ ہے سنہری اور قیمتی ایوان کے عین درمیان ایک دستر خوان بچھا تھا جو کہ باریک ترین اور سفید ترین کپاس کا تھا جو قدرتی اور

خوشبودار پھولوں کی بجائے سونے اور چاندی کے مصنوعی پھولوں سے آراستہ تھا جو کپڑے میں ہی بنے ہوئے تھے اس دسترخوان کی جائے صدارت پر دو بڑے اور خوبصورت، سادہ اور سنہری کپڑے کے دو کشن رکھے تھے اور دوسری جگہوں پر سیمیں رنگ کے تھوڑے چھوٹے سائز کے سادہ کشن تھے شہنشاہی دسترخوان کا بس یہی سازوسامان تھا اور وہاں دیگر کوئی سامان نہیں تھا جب وقت ہوا تو شہنشاہ اس کمرے میں خوبصورت اور جرأت مند خواتین کے جمگھٹے میں داخل ہوا جو اس کے سامنے زیادہ تر زربفت کے کپڑے پہنے ہوئے پیش ہوئیں جس کی سنہری اور سیمیں زمین پر رنگین ریشم سے مختلف زرکار سجاوٹیں بنی ہوئی تھیں وہ اپنے گلے میں سونے کا ہار، موتیوں کی مالائیں پہنے تھیں اور ان کے سروں پر سیمیں سجاوٹ کے ہار آراستہ تھے۔ ان خوبصورت خواتین کی ٹولی کے پیچھے شہنشاہ اپنی ساس اور بیٹی کے ساتھ چلتے ہوئے آئے ان کی ساس ان کے دائیں اور بیٹی بائیں طرف تھی ان کے پیچھے ان کا جانشیں شہزادہ داراشکوہ آیا جس کے دائیں ہاتھ اس کا نانا آصف خان تھا۔

جب یہ تمام لوگ ضیافت کے ایوان کے دروازے پر پہنچے تو قرب وجوار کے کمروں میں بہت سے ساز بجنے لگے جونہی بادشاہ ان دو کشنوں کے درمیان دسترخوان پر بیٹھ گیا جن کا میں نے پہلے ذکر کیا اس کے شانوں پر دونوں طرف دو بہت ہی معزز خواتین بہت قیمتی پنکھے لے کر ایستادہ ہوگئیں جن سے وہ گستاخ مکھیوں کو جھل رہی تھیں، تو اس کی ساس اوسسر دونوں اور ان کے تمام بچے اچانک ان کے سامنے دوزانو ہو گئے جس نے اپنی ساس کو ہاتھ بڑھا کر اٹھایا اور ماں کہہ کر اسے اپنے دائیں ہاتھ بٹھایا یہ ایک ایسا شرف تھا جس پر اس کے خاوند اور بچوں نے اس قدر احسان مندی دکھائی کہ بادشاہ کے سامنے نہایت ہی گہری تسلیمات بجالائے بادشاہ نے اس پر مزید کرم فرمائی کی اور ان کو اپنے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا لیکن وہ اس وقت تک وہاں نہ بیٹھے جب تک بادشاہ نے تیسری دفعہ ان کو کہا بیٹھتے ہوئے شہزادوں نے اپنے نانا کو اپنے درمیان میں رکھا یہ سب تقریبات اور آداب وتسلیمات جب ختم ہوئے اور تمام لوگ اس ترتیب سے جیسا کہ میں نے بتایا بیٹھ گئے تو بہت سی مدھم اور نرم آوازیں مختلف گروہوں سے سنائی دیں جو بادشاہ کی ان مہمات اور جنگوں اور فتوحات کے گانے گا رہی تھیں جو شہنشاہ نے اپنے دشمنوں کے خلاف انجام دیں۔ آوازوں اور سازوں کی اس مشترک موسیقی کے آہنگ کے ساتھ ہی

ہاتھ دھونے کا بندوبست شروع ہو گیا اس کا مندرجہ ذیل طریقہ تھا پہلے چار بہت ہی خوبصورت دوشیزائیں داخل ہوئیں جو شہزادہ آصف خان کے رشتہ داروں اور بڑے امراء کی بیٹیاں تھیں ان کے چہروں کی سفیدی اور سرخی اور ان کے بالوں کا سرخی مائل رنگ بے حس بوریاز رنگوں کے مقابل تھا جہاں تک سفیدی اور سرخی کا تعلق ہے تو یہ ان کے مقابل تو تھی لیکن پھر بھی شمالی علاقہ جات کی یہ عورتیں ان لڑکیوں سے وقار، خوبصورتی اور تمکنت میں کم تر ہیں کیونکہ ان خوبیوں کی وجہ یہاں کی حرارت ہے جو کہ یہاں پر انداز، عمل، حرکت اور گفتگو کے وقار کو ہم آہنگ کرتی ہے وہاں اس کی کمی ہے جیسا کہ کیٹولس نے تھوینیا کی خوبصورتی کے بارے میں کہا ہے۔

''کس قدر سفید جسم اور دانائی اور ذکاوت کا ذرہ بھی نہیں'' خوبصورتی کی یہ چار اجسام ایک ایسے انداز سے آگے بڑھیں جو کہ حسن کی دیوی میں خود جلن پیدا کر دے جس میں وقار، خوش باشی اور بانکپن جھلکتا تھا اور وہ اپنے درمیان موجود شہنشاہ معظم کے ہاتھ دھلانے کے لیے برتن لیے ہوئے آئیں قریب آ کر، شاہی آداب کے بعد ایک نے بادشاہ کے آگے سفید ساٹن کا ایک کپڑا بچھا دیا جو کہ وہ اٹھائے ہوئے تھی دوسری نے اس پر ایک سونے کا قیمتی برتن جس میں قیمتی جواہرات سجے تھے رکھا یہ ظروف ہمارے برتنوں کے مقابلے میں زیادہ کاریگری کے نمونے ہیں یہ درمیان سے گہرے ہیں اور خالی جگہ پر باریک جالی لگی ہے پانی اور تھوک پہنچ چلے جاتے ہیں اور اوپر سے بدصورت بلغم نظر نہیں آتی برتن جب سامنے رکھ دیا گیا تو ایک لڑکی پانی کا آفتابہ لیے آگے بڑھی۔ یہ آفتابہ بھی قیمتی اور سونے جواہرات سے مرصع تھا اس لڑکی نے پانی انڈیلا جس سے بادشاہ نے اپنے ہاتھ دھوئے آخری لڑکی نے تولیہ آگے بڑھایا جس سے انہوں نے ہاتھ پونچھے یہ ہاتھ دھلائی کی رسم ختم ہوئی تو لڑکیاں واپس چلی گئیں اور ان کی بارہ اور لڑکیاں اندر داخل ہوئیں جو اگرچہ ان چاروں سے مرتبہ میں کم تھیں لیکن کسی بھی مجلس میں عزت اور وقار سے جگہ رکھنے والی تھیں انہوں نے بھی شہزادوں کو ہاتھ دھلائی کے برتن پیش کیے اور واپس چلی گئیں اب دسری طرف سے طعام وخوان بہت سے باجوں ڈھول اور تاشوں کی آواز کے ساتھ اندر لائے گئے یہ ساز ہمارے بگل کی طرح ہیں لیکن ذرا ماتمی لہر میں شور انگیز ہیں ضیافت سنہری طشتریوں میں لائی گئی جن کو خواجہ سرا لے کر آئے وہ ہندوستانی انداز میں

شاندار لباس میں ملبوس تھے۔ مختلف قسم کے ریشم کے پاجامے اور عمدہ شفاف کپڑے کے کوٹ زیب تن تھے جو مختلف قسم کی خوشبوؤں کے ساتھ معطر تھے اور ان کی سیاہی مائل اور سانولی جلد بھی چھپی تھی ان میں چار شہنشاہ کے قریب آ گئے وہ صرف ان کھانوں کو جو دوسرے خواجہ سرا لے کر آتے تھے دو خوبصورت دوشیزاؤں کو پیش کرتے تھے جو بادشاہ کے دونوں طرف دوزانو تھیں یہ دونوں باری باری بادشاہ کے سامنے خوان رکھتی تھیں اسی طرح یہ پینے کو پانی دیتی تھیں اور جس خوان کی ضرورت نہ ہوتی اسے اٹھا دیتی تھیں۔ ان تقاریب میں اس قدر ترتیب اور نرم مزاجی دیکھ کر میں بہت متحیر ہوا کھانوں اور طعام کی کثرت اور رنگارنگی دیکھ کر بھی مجھے بہت تعجب ہوا ان میں کچھ ایسے تھے جو ہم بھی بناتے ہیں خاص کر مختلف قسم کی پیسٹری، کیک اور دوسری اس طرح کی مٹھائیاں جو ایسے غلاموں نے بنائی تھیں جو ہگلی کے پرتگیزیوں کے ساتھ آئے تھے یہ اس قدر اچھے طریقے اور سلیقے سے بنی تھیں کہ شہنشاہ نے حیران ہو کر اپنے سسر سے پوچھا کہ یہ مٹھائیاں کس نے بنائی ہیں جب انھیں بتایا گیا کہ یہ فرنگیوں اور پرتگالی غلاموں نے بنائی ہیں تو اُس نے جیسے حیران ہو کر بلند آواز میں کہا۔

''یقیناً فرنگی بہت عظیم قوم ہوتے اگر ان میں تین شدید خامیاں نہ ہوتیں پہلے تو یہ کہ وہ کافر ہیں (یعنی بے مذہب) دوسرے وہ سور کھاتے ہیں اور تیسرے وہ جسمانی حصوں کو دھوتے نہیں جن کو فطرت اپنے فضول فاضل مادہ بھرے ہوئے شکم سے نکالتی ہے''

یہ فضول گفتگو ختم ہوئی تو ضیافت بھی جو کوئی چار گھنٹے جاری رہی تھی ختم ہوئی دستر خوان کو تعظیمات سے بڑھایا گیا جس کو میں یہاں بیان نہیں کروں گا کیونکہ میں نے اور بہت سی بے شمار لاکھوں باتیں اپنے متجسس قاری کو بیان کرنا ہیں جو ان حجروں کی بڑی وجہ اور اصل مقصد ہیں جن سے شہنشاہ سلامت کی رسم ہے کہ وہ اپنے اہم ترین ماتحتوں کو نوازتے ہیں پس اس شاہی آمد کے تفریحی اور خوشگوار اختتام کے طور پر بارہ عدد نوجوان، رقاص و دوشیزائیں اندر داخل ہوئیں ان کے بیان کو ہم خاموشی کی نذر کرتے ہیں کیونکہ اپنی گراوٹ میں یہ موضوع عیسائی کانوں کے لیے مناسب نہیں ہے اپنے لباس کی بے حیائی اور عریانی کی وجہ سے بھی اور ان کی حرکات وسکنات کی وجہ سے بھی۔

اس بے حیا اجتماع کے مرکزی کرداروں کی طرف دھیان دیتے ہوئے میں یہ کہوں گا یہ

خوبصورت دوشیزائیں قیمتی اور پرتعیش لباس میں ملبوس، اپنے ہاتھوں میں تین بڑے بڑے اور قیمتی ظروف لیے ہوئے اندر داخل ہوئیں جو کہ ہیرے، جواہرات، موتیوں، لعل وزمرد جیسے قیمتی پتھروں سے بھرے ہوتے تھے اور ان طشتوں کے اندر ان قیمتی پتھروں کی قیمت سات لاکھ روپے سے زیادہ کی قرار دی جارہی تھی ایک غریب کے لیے تو یہ بہت ہی قیمتی اور بے تحاشا دولت ہوگی لیکن ایک ایسے شہنشاہ کے لیے جو دنیا کے امیر ترین بادشاہوں میں سے ہے سلطنتوں اور صوبوں کا مالک ہے۔ وہ بادشاہ جس کے پاس بے تحاشا سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی دولت ہے اگر وہ خزانے اور دولت جمع کرنے میں حریص اور طمع کا شکار نہ ہوا یک اور مارکس کریس تو ان کو ان جواہرات کی قدر و قیمت کی زیادہ پرواہ نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن اس نے اس طمع اور حرص کا اظہار کر دیا بلاشبہ اس رقص اور تماشے میں جو اس کے لیے منعقد ہو رہا تھا اس نے کوئی دلچسپی نہ لی وہ آرام سے ان جواہرات کو جو اسے پیش کیے گئے تھے دیکھتا اور چھوتا رہا جو میرے خیال میں ان کو گن رہا تھا کیونکہ ایسے امیر کنجوس سے کسی بھی چیز کی توقع ہوسکتی ہے ایک ایسا کنجوس جس کے بارے میں ہوریس شاعر نے اپنی پہلی طنزیہ نظم میں بیان کیا تھا۔

تھیلے بھرے ہوئے

جن کی تقدیس ہے انسان کی ضرورت سے پرے

اس طرح تکتے ہیں ان کو جیسے تصویریں ہیں وہ اور بس ان کا مقدر ہے کہ دیکھو خوش رہو

جب تقریبات اس منزل پر پہنچیں ہمارا خواجہ سرا بھی ہماری تلاش میں آ گیا اس نے بتایا کہ اب ہمارے جانے کا وقت ہے کیونکہ اگر ہم آخر تک رہتے تو ہمارے لیے مشکل ہوگی اس تنبیہ پر ہم فوراً ہی رخصت ہو گئے اور اس کے پیچھے چلتے ہوئے، وہ ہمیں شاہی محافظوں کے ہجوم کے بیچ سے لانے کے بجائے ہمیں زیر زمین سرنگ سے لے گیا اور ہم باہر گلی میں آ گئے جہاں ہم نے اس کی توجہ اور تکلیف کے لیے اسے انعام دیا اور اپنی رہائش گاہ کو چل دیے وہاں پہنچنے سے پہلے ہمیں بے شمار گلیوں اور چوکوں سے بڑے بڑے ہجوم سے بڑی مشکل سے گزرنا پڑا لیکن ہمیں اپنی تکلیف کا بہت اچھا صلہ مل گیا تھا کیونکہ ہم نے اتنی شان و شکوہ اور ایسے معاملات دیکھ لیے تھے جو ہمارے یورپ کے لیے بھی اجنبی اور انوکھے ہیں۔

سفرنامہ بلوچستان افغانستان اور پنجاب

(باب ۱۹)

چارلس میسن
ترجمہ: ظفر علی خاں

چارلس میسن (۱۸۵۳ـ۱۸۰۰) امریکی سیاح جو سکھوں کے عہد میں پنجاب میں آیا۔ اس نے پہلی مرتبہ ہڑپہ کے قدیم شہر کے آثار کی جانب اشارہ کیا تھا۔ لاہور کے بارے میں اس کا یہ بیان اس کے انگریزی سفرنامے کا ترجمہ ہے۔

لاہور۔ مساجد، بادشاہی مسجد، روایت، مسجد وزیر خان، سنہری مسجد، مسز ایلرڈ کی فراخدالی، پامالی، بازار، عمارات، محلات، قلعہ بندیاں، دروازے، کھنڈرات، مقابر، شاہدرہ، اس کی پامالی، ایم ایس کی رہائشگاہ، انارکلی، داستان و مقبرہ، ایم پنچورا کا قبضہ، باغات، پھل سبزیاں، شالیمار، تجارت، نواں کوٹ، لاہور کا پہلا دروازہ۔

رنجیت سنگھ کے زیر نگین علاقوں اور پنجاب کا دارالسلطنت لاہور بلا شبہ قدیمی شہر ہے اور اپنی وسعت اور شان و شوکت کے لیے مشہور رہا ہے۔ ہندوستان کے مورخوں کی طرف سے کی گئی اس کی غیر معمولی تعریف پرانے شہر کے لیے تھی۔ اب جس کے کھنڈرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں اس کہاوت کا حوالہ بھی موزوں ہوگا کہ اصفہان اور شیراز مل کر بھی لاہور کے نصف کے برابر نہیں ہیں۔ حالیہ شہر بھی بہت وسیع ہے جس میں بہت سی نفیس اور اہم عمارات موجود ہیں، جن میں بادشاہی مسجد اور مسجد وزیر خاں خاص طور سے پرشکوہ ہیں۔ سنہری مسجد بھی پرکشش ہے

جس کے مینار اور گنبد دل آویز ہیں۔ بادشاہی مسجد سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے اپنے رقبے کے پھیلاؤ میناروں کی بلندی، گنبدوں کے گھیر اور پوری عمارت کی عمومی شان وشکوت اس تعمیر کروانے والے کے لیے موزوں پرشکوہ یادگار رہے، جسے اورنگ زیب کہتے ہیں۔ قبول عام روایت کے مطابق لاہور اس عمارت کی تعمیر کے لیے مندرجہ ذیل حالات کا ممنون ہے۔ شہنشاہ نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ اس کی نجی عبادت کے لیے ایک مسجد تعمیر کرائے جو معلوم مساجد سے زیادہ حسین ہو۔ وزیر نے حکم کیمطابق بڑے زیادہ خرچ سے وہ مسجد تعمیر کرائی جسے مسجد وزیر خاں کہتے ہیں اور بادشاہ کو مسجد کی تکمیل کے بارے میں اطلاع دی جو فوری طور پر عمارت کے معائنے اور وہاں نماز ادا کرنے کے لیے چل پڑا۔ راستے میں اس نے لوگوں کے تبصرے سنے ''شہنشاہ کو دیکھو وہ وزیر خاں کی مسجد میں نماز کے لیے جارہا ہے'' وہ واپس ہوگیا کہ اس کا منصوبہ ناکام ہوگیا تھا کیونکہ مسجد اس کے نام کی بجائے اس کے وزیر کے نام سے جانی جاتی تھی۔ پھر اس نے ذاتی طور پر ایک اور مسجد کی تعمیر کا حکم دیا اور تعمیر کے دوران بذاتِ خود اس کی نگرانی کی اور یوں اپنا نام مسجد کے ساتھ منسلک کرنے میں کامیاب ہوا۔

مسجد وزیر خان بڑی نفیس امیرانہ عمارت ہے جو عظیم میناروں سے مزین ہے۔ یہ مکمل طور پر منقش اور روغنی ٹائلوں سے ڈھکی ہوتی ہے اور ان پر عربی آیات لکھی ہوئی ہیں جو بہت خوبصورت نظر آتی ہیں۔ بڑا غلط العام دعویٰ ہے کہ اس کی دیواروں اور مختلف حصوں پر پورا قرآن لکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بازار ہے پہلے جن کا کرایہ مسجد کی مرمت کے لیے اور ان ضرورتمندوں کے لیے مختص تھا جو وہاں جاتے تھے۔ اب یہ پیسے سکھ غصب کرتے ہیں۔

سونا یا سنہری مسجد اپنے سنہری گنبدوں کے علاوہ ایک خوبصورت اور وسیع عمارت ہے۔ یہ بڑی بے توجہی کی حالت میں تھی اور یہ امر لاہور کی مسلمان آبادی کے لیے باعث شرم تھا تا آنکہ ایم ایلرڈ کے افسروں نے یہ معاملہ اس کے سامنے پیش کیا۔ جرنیل نے اسے دوبارہ سنہری بنوانے کے لیے ایک خطیر رقم فراہم کی۔ بادشاہی مسجد اور مسجد وزیر خان کی سکھوں نے بے حرمتی کی تھی جنہوں نے ان کے اندر سور مارے اور ان کے صحنوں کو اصطبلوں میں بدل دیا تھا۔ بادشاہی مسجد کو مہاراجہ نے اپنی ملازمت میں چند یورپیوں کو رہائش کے لیے دے دیا تھا۔

بہت سی دوسری مساجد اور کچھ سرائے بھی قابل توجہ ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ ہندو منادر بھی قابل تعریف ہیں۔

گلیاں بہت تنگ جیسے کہ بازار ہیں جو بہت زیادہ ہیں اور ان پیشوں کے حوالے سے مشہور ہیں جو ان میں کیے جاتے ہیں۔ جیسے بازار سنیاراں لوہاراں اور زین سازاں وغیرہ کچھ بہت ہی بلند اور بڑی عمارات ہیں جو پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں (وہ مواد جس سے کہ شہر کا زیادہ حصہ بنا ہوا ہے) ان میں سے کچھ حال ہی میں تعمیر ہوئی ہیں۔ ان کی بیرونی سطحوں پر کوئی نقش و نگار نہیں ہیں ان کے مقابل بڑی حد تک مردہ دیواریں ہیں۔ جو بہر حال یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بہت وسیع جگہ گھیری ہوئی ہے۔ وسعت کے لحاظ سے ان میں سب سے نمایاں جمادار خوشحال سنگھ کی جائے رہائش ہے جو سردھانا کے قرب و جوار کا باسی ایک غدار برہمن ہے اور جسے رنجیت سنگھ نے ایک برتن دھوانے والے سے جرنیل کے عہدے پر فائض کر رہا ہے۔ رنجیت سنگھ کے بیٹوں میں سے ہر ایک کے پاس شہر میں ایک بڑا محل ہے اور مہاراجہ اپنے لاہور کے کبھی کبھار ہونے والے دوروں میں اندرونی قلعے میں جو شہر کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے رہتا ہے۔ یہاں جنگی ساز و سامان کا بہت وسیع سٹور اور گولہ بارود کا ذخیرہ تھا۔

لاہور دریائے راوی سے ایک میل کے فاصلے پر ہے جو اس کے پانی پر انحصار نہیں کرتا۔ اس کی دیواروں کے اندر متعدد کنویں ہیں۔ اس کے گرداگرد ایک مضبوط اینٹوں کی دیوار ہے۔ یہ کوئی پچیس فٹ بلند ہے اور اتنی چوڑی ہے کہ ایک توپ اس پر کھینچی جا سکتی ہے اس میں بہت سے مینار ہیں اور متعین فاصلوں پر مختلف اطراف میں گڑگنج ہیں (فصیل کے ابھرے ہوئے حصے ہیں) رنجیت سنگھ نے فصیل کو ایک اچھی خندق سے محفوظ بنا دیا ہے اور اس نے فصیل کے پورے محیط پر خوبصورت کام کروایا اور مورچے بنوائے ہیں۔ جنہیں بھاری توپ خانے سے دل کھول کر سجایا ہے۔ وہ مسلسل قلعہ بندیوں کو اپنے فرانسیسی افسران کی نگرانی میں بہتر بناتا رہتا ہے اور ملبے اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کو اٹھواتا رہتا ہے۔ جو کہ اس کے درست خیال کے مطابق نہ صرف دشمن کی آمد کو چھپائیں گے بلکہ اس کے لیے بھاری توپوں کا بنا بنایا مورچہ فراہم کریں گے۔ شہر کے بہت سے دروازے ہیں جیسے موچی دروازہ، لاہوری دروازہ، دہلی دروازہ، اٹک دروازہ وغیرہ۔ موخرالذکر کو ٹیکسالی دروازہ یا ''منٹ'' دروازہ ایک خطاب (نام)

جس سے جیسوٹ تیفنتھا (کو غلط فہمی ہوتی کہ شہر کے دروازوں میں سے ایک کا ٹکسلا کا نام باقی بچ گیا ہے۔ لاہوری دروازے پر ایک بڑی توپ موجود ہے جسے بھنگیوں کی توپ کہتے ہیں اور موچی دروازے پر دو تین شیر پنجروں میں بند ہیں۔

فصیل کے باہر ہر طرف قدیم شہر کے کھنڈرات بکھرے پڑے ہیں۔ جو مہاراجہ کے واضح احکامات سے کچھ جگہوں پر اور دوسری جگہوں پر چھاؤنیاں بنانے اور فرانسیسی فوجی کیمپ کے لیے پریڈ گراؤنڈ بنانے کے لیے صاف کر دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے حجم میں مسلسل کمی تعمیراتی سامان اور اینٹوں کی تلاش کی بنا پر ہو رہی ہے۔ لیکن ابھی بھی حیران کن ہیں کہ پرانے لاہور کی وسعت کو ظاہر کرتے ہیں۔ متعدد مقابر اور دوسرے ڈھانچے ابھی بھی کھڑے ہیں۔ کچھ تو تقریباً پورے کے پورے صحیح سالم موجود ہیں اور اگر وقت کے قدیم دیوتا کو مکمل شکست نہ بھی دے سکیں تو اس کے سامنے غیر محسوس طریقے سے گھٹنے ٹیکیں گے۔ لاہور کے مغرب میں راوی کے مغربی کنارے پر خوبصورت اور دور پار مشہور مقبرہ ہے شہنشاہ جہانگیر کا شاہدرہ میں۔ ہندوستان کے باسی اسے ان چار عجائبات میں سے ایک گردانتے ہیں جنس ے ان کا مک مزین ہے اور یقیناً یہ فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ سکھ غلبے کے تحت ہندوستانی آرٹ کا یہ خوش کن نمونہ بے توجہی کا شکار ہے اور انحطاط کا شکار ہے اسے پامال کیا جا رہا ہے۔ مہاراجہ نے اسے ایک فرانسیسی افسر ایم ایمس کو رہائش کے لیے دے دیا ہے اس نے اس کے ایوانوں میں جمع شدہ گند کو صاف کروایا اور ارد گرد کے باغ کو منظم کیا ہے۔ جب وہ فوت ہوا تو مسلمانوں نے اس کی موت کو اس گستاخی اور بدی کی وجہ قرر دیا جس کے تحت اس نے اس مقدس جگہ میں رہائش کی تھی۔ ان کا یقین تھا کہ شہنشاہ کا سایہ حقیقت میں اس کے سامنے آیا جس نے اس کے جرم کی یہ سزا سنائی تھی۔ مہاراجہ نے اس کہانی کو سچ سمجھا۔ مجھے معلوم نہیں لیکن مسٹر ایمس کی موت پر وہ بہت متاسف ہوا اور اس نے عمارت کی مزید بدحالی اور بے حرمتی کی ممانعت کر دی ہے۔ شاہدرہ کی حالت بڑی خوش کن ہے جس نے مہاراجہ کو تحریک دی ہے کہ فوری طور پر اس کے شمال میں ایک باغ والا گھر بنوائے۔

شہر کے جنوب میں ایک اور قابل ذکر عمارت، دریا اور اس کے درمیان ہے انارکلی کا مقبرہ، جس سے متعلق یہ کہانی زبان زد عام ہے۔ انارکلی (انارگل، غالباً یا انار کی کلی) بہت

خوبصورت دوشیزہ تھی اور ہندوستان کے ایک شہنشاہ کی محبوب کنیز تھی۔ جب شہزادہ اپنے حرم کی خواتین کے ساتھ ہوتا تو محبوب کنیز بھی موجود ہوتی۔ ہوا یہ کہ ایک دن شہنشاہ اپنی خواتین کے ساتھ ایسے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جس میں آئینے لگے ہوئے تھے جس میں انارکلی کا عکس نظر آ رہا تھا جو اس کے پیچھے کھڑی تھی وہ مسکرایا بادشاہ نے اس مسکراہٹ کا ایسا مطلب نکالا کہ اس کے لیے افسوس ناک نکلا، حکم دیا گیا کہ اسے زندہ دفن کر دیا جائے۔ حکم کے مطابق انارکلی مقررہ جگہ پر سیدھی کھڑی کر دی گئی اور اس کے گرد اینٹیں جڑ دی گئیں۔ جبکہ ایک بہت بڑی اور مضبوط عمارت قبر کے گرد تعمیر کر دی گئی۔ اس عمارت کا خرچہ روایت کے مطابق اس کی چوڑیوں میں سے ایک کو بیچ کر پورا کیا گیا۔ پہلے وقتوں میں تو وسیع باغات اور بہت سی عمارات اس مقبرے سے منسلک تھیں لیکن اب ان میں سے کسی کا نشان نہیں ہے۔ اس یادگار عمارت پر ایک وقت میں کھڑک سنگھ کا قبضہ تھا سب سے بڑا اور رنجیت سنگھ کا واحد قانونی بیٹا تھا۔ لیکن بعد میں یہ ایک اٹالین افسر مسٹر وینچورا کو دے دی گئی ہے جسے اس نے اپنا حرم بنالیا ہے۔ اس کے قریب ہی مسٹر ایلرڈ کا خوبصورت گھر ہے اور اس کے سامنے ایک پیریڈ گراؤنڈ اور درمیان میں بٹالینوں اور رجمنٹوں کی قطاریں ہیں جو ان کے زیر حکم ہیں۔ شہر کے مشرق کی طرف سپاہیوں کی چھاؤنیاں ہیں جو مسٹر ایویٹے بائل اور کورٹ کی کمان میں ہیں جہاں ان افسروں کی رہائش گاہیں بھی ہیں۔ اولذ کر اٹلی کے شہر نیپلز کے باسی کی رہائشگاہ ایک منفرد اور بھونڈے انداز میں رنگی گئی ہے۔

لاہور کے آس پاس بہت سے بڑے اور خوش کن باغات ہیں۔ پھل دار درخت، پھولدار جھاڑیاں اور پودے جو ہندوستان میں عام ہیں، بہت کم ان پودوں کی آمیزش ہے جو مغربی ممالک سے خاص ہیں۔ پھل دار درختوں میں آم شہتوت کے لیے سیب اور کم تر حجم اور قسم کا آڑو، جامن، انجیر ''کارندہ'' Karinda، بہی، سنگترہ، لیموں، ترس اور میٹھا اور کھجور۔ آخرالذکر کا پھل کم قابل خوردنی ہے۔ انار بھی بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اور انگور کی بیلیں بھی خال خال ہیں۔ خربوزے اتنے باکثرت ہیں کہ انہیں پھل نہیں سمجھا جاتا۔ گو کہ متواتر کاشت ہوتے ہیں۔ وہ بے ذائقہ ہوتے ہیں۔ شہر کے قریب اراضی کے بہت سے حصے پر سبزی کی کاشت ہوتی ہے جو شہریوں کے صرف میں آتی ہے۔ یہاں بھی عام مشرقی اقسام،

بینگن، مختلف اقسام کی لوکیاں، کریلے، کھیرے وغیرہ کاشت ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی انوکھا پن نہیں ہے۔ میٹھی سویا کے بڑے بڑے کھیت عام ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بیج کے لیے اگائے جاتے ہیں۔ پھولوں کی زیادہ اقسام نہیں ہیں جو کہ خوشبو کے حوالے سے چنے جاتے ہیں۔ پھولوں کے گجرے بنائے اور بازار میں بیچے جاتے ہیں۔ باغات یہاں جیسے تمام مشرقی ممالک میں عوام کے لیے کھلے ہوتے ہیں اور افراد پھولوں اور پھلوں کے لیے احترام کا جذبہ لیے آزادی سے داخل ہو کر ان میں چہل قدمی کر سکتے ہیں۔ لیکن پیداوار بیچنے کی کمینگی عام ہے۔ اس فروخت سے باغ کا مالک چاہے وہ بادشاہ ہو یا غلام نفع کماتا ہے۔

لاہور کے تقریباً ۳ میل شمال مشرق میں مشہور زمانہ اور خوش کن شالیمار باغ ہے۔ ابھی بھی وہاں سنگ مرمر حوض اور فوارے ہیں اور بڑی مہنگی مشینری بھی جو کبھی فواروں کی فوار کو پانی مہیا کرتی تھی اس وسیع باغ کی تفریحی عمارتیں اور دوسری تعمیرات، مسرور زمانہ کی وجہ سے زیادہ انحطاط کا شکار نہیں ہوئیں جتنی کہ مہاراجہ کی تخریب کاری سے جس نے اس کا بہت سا سنگ مرمر اور پتھر جس سے یہ تعمیرات بنی تھیں یہاں سے اٹھوا کے اپنے دلپسند مذہبی دارالسلطنت امرتسر اور قریبی قلعے گوند گڑھ کی تعمیرات میں استعمال ہونے کے لیے بھجوا دیا ہے۔ ابھی بھی اپنی شان و شوکت کے زوال میں شالیمار باغ شائقین کے لیے بہت سی خوبصورتیاں اور خوشیاں لیے ہوتے ہیں یقیناً ان کا تاسف بڑی شدت سے ابھرے گا کہ ایسے اعلیٰ پائے کے باغ کو برباد کیا گیا ہے جو تیمور کے شاہی خاندان کی خوش ذوقی کی تجسیم تھا۔

لاہور باوجودیکہ اپنے بہت آبادی والے قرب و جوار سے ایک خاص درجے کی تجارت و آمد و رفت رکھتا ہے لیکن تجارتی معنوں میں یہ ایک دھیما شہر ہے۔ امرتسر پنجاب کا عظیم تجارتی مرکز بن گیا ہے اور ملک کے بنکار اور سرمایہ داروں نے وہاں سکونت اختیار کر لی ہے۔ اس نے بڑی تعداد میں حرفتکاروں کو جذب کر لیا ہے اور اس کی خوشحالی نے بہت سے فاقہ زدہ کشمیری کاریگروں کو بھی اپنے اندر کھپا لیا ہے۔

نیا کوٹ لاہور کے جنوب میں ڈیڑھ میل کے فاصلے پر رنجیت سنگھ کا ہیڈ کوارٹر تھا جب وہ لاہور قبضے میں کامیاب ہوا تھا جو میری اطلاع کے مطابق یوں واقع ہوا تھا۔

وہ شہر جو طاقتور سکھ بادشاہی کا مرکز بننے جا رہا تھا اس وقت چار سکھ سرداروں کے زیر تسلط

تھا جن میں سے ہر ایک دوسرے سے آزاد تھا اور سب ایک دوسرے سے لڑائی میں مصروف تھے۔ حالات جب کہ یہ تھے رنجیت سنگھ سات ہزار سواروں کے ساتھ لاہور کے سامنے نمودار ہوا۔ مشترک خطرے نے چاروں سرداروں کو متحد کر دیا جنہوں نے شہر کے دفاع کی تیاری شروع کر دی۔ نوجوان حملہ آور اپنے فوجیوں کی حالت کی بنا پر ایسے شہر پر جو ایک مضبوط فصیل سے گھرا ہوا تھا کوئی اثر نہ ڈال سکا نئے کوٹ میں جا گزین ہو گیا جہاں اس نے گردو پیش میں لوٹ مار مچا دی۔ چند ماہ وہ اسی منصوبے پر کار بند رہا۔ جب باغاتی میدانوں کے کاشتکار جن کی مزدوری کے مواقع لازمی طور پر معطل ہو گئے تھے جب بالکل فاقوں پر آ گئے اور گزارہ مشکل ہو گیا اور انہوں نے اس آفت کے اختتام کا کوئی امکان نہ دیکھا تو انہوں نے رنجیت سنگھ سے رابطہ کیا اور رنجیت سنگھ کو کسی غیر محفوظ یا غیر معروف راستے سے شہر کے اندر پہنچانے کی پیش کش کی۔ اس نے ان کے وعدوں پر بھروسہ کیا اور اس کے فوجی رات کے اندھیرے میں شہر میں داخل ہو گئے اور قتل عام کے بعد جو ایسے مواقع پر دستور تھا رنجیت سنگھ لاہور کا مالک بن گیا۔ اس دن خود مختار سکھ سرداروں کا زوال ہوا اور ان کے فاتح کی اعلیٰ اتھارٹی قائم ہوئی۔

سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب

بیرن چارلس ہیوگلز
ترجمہ: محمد حسن صدیقی

چارلس ہیوگلز ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں انڈیا آیا تھا جب لاہور پر رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ یہ سفرنامہ چار جلدوں پر ۴۲۔۱۸۴۰ء کے دوران شائع ہوا۔

سوموار ۱۱ جنوری: آج صبح مجھے جنرل ونٹیورا کا ایک خط ملا، جس میں تحریر تھا کہ ''مجھے مہاراج کے احکام موصول ہوئے ہیں کہ میں آ کر آپ سے ملاقات کروں۔'' رنجیت کی یہ خواہش تھی کہ میں شاہ ڈیرہ (شاہدرہ) میں ٹھہروں جو جہانگیر کے مقبرے کے لیے مشہور ہے یہاں پر جنرل نے میری آمد کی اطلاع خلیفہ صاحب کو پہنچائی تھی جو درباری امور کے مدارالمہام تھے۔ انہیں میرا استقبال کرنا تھا۔ شاہ ڈیرہ شہر سے صرف تین میل کے فاصلے پر راوی کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ میں نے اس رقعے کا جواب براہ راست بھیج دیا کہ بارہ بجے تک مجھے شاہ ڈیرہ پہنچنے میں کسی رکاوٹ کا احتمال نہیں اور اگر آپ میرے شہر میں پہنچنے کے متعلق اس کے مطابق اعلان کر دیں تو اس میں بمشکل ہی کوئی غلطی ہوگی، نیز اس کا انتظار نہ کیا جائے کہ میں مزید کوئی اطلاع بھیجوں گا۔ لاہور میں قیام کے دوران میں مجھے اس توقع سے کہ میں ونٹیورا کے ہاں ٹھہروں گا کہیں زیادہ خوشی تھی بہ نسبت مہاراجہ کی کسی عزت افزائی کے جو میرے لیے متوقع تھی۔

جوں جوں آدمی راوی کے قریب پہنچتا ہے، علاقے کی ویرانی اور بنجر حالت بڑھتی جا رہی

ہے۔ ننگل سے جو لاہور جانے والی بڑی سڑک سے کچھ بائیں ہاتھ ہٹ کر ہے، شاہ ڈیرہ (شاہدرہ) کا فاصلہ آٹھ کوس سے زیادہ نہیں لیکن ہم بارہ بجے سے پہلے پہنچ گئے اگرچہ نسبتاً جو ایک چھوٹا سا دریا ہے جو بہت گہرا بھی ہے اور اس پر پل بھی کوئی نہیں، ہمیں کچھ وقت کے لیے رکنا پڑا۔ مجھے تو مجبوراً ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہو کر گزرنا پڑا اور گاڑی کو بہت زیادہ مشکل سے پار اتارا گیا۔ مجھے تو حیرت ہوئی کہ کس ترکیب سے ہندوستانیوں نے اس مشکل پر قابو پالیا کیونکہ جس قسم کا کام اب انہیں درپیش تھا، پہلے اس قسم کے کام میں انہیں ہرگز کوئی مہارت نہ تھی۔

شاہ ڈیرہ (شاہدرہ) ایک شاندار کھنڈر ہے۔ اس کی خوبصورتی اس کے نقشے یا عمارات کی ترتیب میں اس قدر نہیں جتنی کہ اس کی تفصیلات میں ہے۔ سنگ مرمر اور قیمتی پتھر یہاں بہ افراط کام میں لائے گئے ہیں۔ اس کی بڑی عمارت جو ایک نفیس باغ میں ایستادہ ہے مربع شکل کی ہے، جس کے ہر کونے پر ایک خوبصورت مینار ہے جن پر دیرپا قسم کے پتھروں کی پچی کاری کی گئی ہے اور دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان پر مختلف رنگوں کا روغن کیا گیا ہے۔ انہیں قریب جا کر دیکھنا چاہیے ورنہ ان رنگوں کا تاثر بالکل مختلف ہوتا ہے، جب کسی خاصے دور فاصلے سے دیکھا جائے جہاں اس گراں ڈیل عمارت کا صحیح نظارہ کیا جا سکے۔ نیچے کی منزل تو محرابوں کے سلسلے پر مشتمل ہے جہاں پہنچنے کے لیے بہت سی سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے۔ پھر ایک بلند چبوترہ ہے جہاں سے مغرب کی سمت ایک نہایت آراستہ پیراستہ راستہ ہے جو ایک چھوٹے سے گنبد میں جا پہنچتا ہے۔ یہ جہانگیر کا مقبرہ ہے جس کی زیادہ مشابہت تاج محل آگرہ کے ساتھ ہے۔ یہاں روشنی اوپر سے پہنچتی ہے۔

ہندوستان میں تو اس قسم کی کوئی اور جگہ اتنی شاندار نہیں جتنی کہ عمارت کی چھت کے اردگرد وہ مسطح سقف ہے جو پتھروں کی پچی کاری کی بنی ہوئی ہے، اور اس کے چاروں طرف سنگ مرمر کا کھلا کٹہرہ ہے۔ میں ایک مینار پر چڑھ گیا تا کہ لاہور کے نظارے سے اپنی دیرینہ خواہش پوری کرلوں۔ اتنے فاصلے سے اس کا منظر بھلا معلوم ہوتا ہے جب اس کی بلند فصیلیں، شاندار مینار اور مکانات دکھائی دیتے ہیں۔ پیش منظر میں تو وہ عمارتیں نظر آتی ہیں جو شاہ ڈیرہ (شاہدرہ) سے متعلق ہیں جو دریائے راوی تک چلی جاتی ہیں۔ پھر دریا آتا ہے اس کے بعد کھیتوں کی ایک لمبی قطار آتی ہے جن میں درختوں کے جھنڈ ملے جلے ہیں۔ اس وقت یہ تمام

درخت موسم بہار کی آمد آمد کے لباس میں ملبوس ہیں۔ ازاں بعد وہ شاندار عمارتیں دکھائی دیتی ہیں جو جہانگیر نے لاہور میں تعمیر کرائی تھیں۔ ان جاذب نظر چیزوں کے دیکھنے کا مشکل سے موقع ملا تھا کہ میں نے گرد وغبار کا ایک بادل دریا کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا، اور کچھ دیر تک تو سواروں اور مزدوروں کا یہ گروہ اس میں چھپا رہا۔ یہ وہ وفد تھا جو رنجیت سنگھ نے میرے استقبال کے لیے بھیجا تھا۔

فقیر خلیفہ صاحب کی معیت میں لاہور کی فوجوں کا کمانداربھی تھا۔ مہاراجہ کی طرف سے انہوں نے مجھے خطاب کرتے ہوئے پوری ایک تقریر سنا دی جو گلہائے بلاغت سے پر دامن تھی۔ اس میں مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ مہاراجہ ہر روز دریافت کرتے رہے ہیں کہ میں کدھر ہوں اور میرا کمال بے صبری سے انتظار کرتے رہے ہیں اور اب مجھے اپنے آپ کو خود اپنے ملک میں سمجھنا چاہیے اور حسب ضرورت حکم دینا چاہیے۔ مہاراجہ صاحب کی خواہش ہے کہ میری قیام گاہ کو جہاں تک ممکن ہو سکے میرے لیے خوشگوار بنا دیا جائے۔ اس کے بعد مسٹر وائنے اور میں نے کماندار اور خلیفہ صاحب کو ساتھ لیا اور جنرل صاحب کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ راوی کا پتن پرے شاہ ڈیرہ کے قریب ہی ہے اور اس وقت خشک موسم میں بھی کئی جگہوں پر پانی کی گہرائی اٹھارہ فٹ سے کم نہ ہوگی۔ ساحل پر ایک بہت بڑا باغ دلکشا مغل شہنشاہ کا لگوایا ہوا ہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر عمارات بنی ہوئی تھیں۔ سیلابوں نے بائیں کنارے پر تو جو کچھ بھی تھا مدت ہوئی برباد کر دیا ہے اور بھاری بھرکم دیواروں کو اپنی نرم تہ میں پہنچا دیا ہے۔ شاہ ڈیرہ (شاہدرہ) کی یادگار کے اردگرد جو بہت بڑا مربع ہے اس کو بھی اسی حال کا سامنا کرنا پڑا اور دریا کا دایاں کنارہ بھی اسی طرح دریا کی دست برد میں ہے۔

اس سڑک کے ذریعے سے لاہور پہنچنے کا راستہ بڑا دلکش ہے۔ قلعہ جو رنجیت سنگھ نے مرمت کرا لیا ہے اور جہاں باقاعدہ سوار فوج کی جمعیت متعین ہے، نہایت اچھی حالت میں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ بہت لمبا چوڑا ہے، باقاعدہ توپ خانے کے حملے کی صورت میں، اس کا دفاع بالکل خارج از امکان ہے۔ میں انتہائی خوشی محسوس کر رہا تھا جب میں سوچتا تھا کہ جنرل ونٹیورا کے ساتھ خود اس کے مکان پر میری ملاقات ہوگی کیونکہ جس وقت سے میں پنجاب میں داخل ہوا تھا اس کی متواتر توجہات نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ اسے اپنا پرانا دوست تصور

کروں۔ میری دلی کیفیت یہ تھی کہ میں تنہائی سے اکتا گیا تھا۔ اس کے علاوہ میری آرزو تھی کہ کسی گھر میں چند دن کے لیے آرام کرلوں اور میرا میزبان کوئی یورپین شخص ہو۔ اس کے ساتھ میری ملاقات اور اس سائبان کے نیچے ہوئی جو اس نے اپنے خوبصورت باغ کے داخلے کے راستے پر لگوایا ہوا تھا، ہم نے نہایت تپاک سے مصافحہ کیا۔ پہلے تو میں نے کوشش کی کہ اس کی نوازشات کے لیے شکریہ پہ شکریہ ادا کرتا جاؤں اور پھر اسے یقین دلاؤں کہ اس کی ملاقات سے مجھے کس قدر مسرت ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس پر چند دن کے لیے بیجا مہمان نوازی کا بوجھ ڈالنے کا خیال طبیعت پر گراں محسوس نہیں ہوتا۔ اس نے نہایت شکرگزاری سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ مہاراجہ صاحب کو توقع ہے کہ آپ کم از کم ایک مہینہ تو لاہور میں قیام کریں گے۔ لیکن میں تو اس سے پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ وہاں پر اپنے قیام کو چار دن سے بڑھنے نہ دوں گا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ میں کسی سبب سے بھی اس جہاز پر سوار ہونے سے رہنا نہیں چاہتا تھا جسے بمبئی سے مارچ میں روانہ ہونا تھا۔

اب فقیر صاحب تو مجھ سے رخصت ہوئے لیکن معاً بعد ان کے بڑے بھائی عزیز الدین جو وزیر خارجہ کے علاوہ خفیہ امور کے دبیر بھی ہیں تشریف لے آئے وہ مہاراجہ کی طرف سے مجھے یہ بتانے آئے تھے کہ جنرل ونٹیورا نے میرے پہنچنے کی اطلاع انہیں پہنچا دی ہے جنہوں نے اس خوشی میں اپنی تمام مصروفیات ملتوی کر دی ہیں۔ اس کے بعد جو عمدہ تقریریں ہوئیں ان کا دہرانا میری قدرت سے باہر ہے۔ اس کے بعد پچاس بیرے پیش ہو گئے جن کے پاس تحائف میں پھل، مٹھائیاں، ایک بوتل اس کی ذاتی شراب، جس کا ذکر ابھی کیا جاتا ہے اور سات سو روپے کی ایک تھیلی تھی۔

اب جنرل نے میرا تعارف مسٹر میکےسن سے کرایا جو کمپنی کی طرف سے بہاولپور میں پولٹیکل ایجنٹ ہے۔ اس کے علاوہ ایک فرانسیسی ڈوبوئی گنان تھا۔ اول الذکر ایک نہایت ذہین افسر ہے جس نے لدھیانہ سے تین میل دور ریگستان میں اپنی تعیناتی قبول کر رکھی ہے جہاں وہ ان کشتیوں کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ دار ہے جو امیران سندھ سے ایک حالیہ معاہدے کی رعائت کے مطابق دریائے سندھ میں انگریزوں کی طرف سے جہاز رانی کے فرائض بجالاتی ہیں۔ ایک اور پرانے واقف کار کا نام مجھے قریباً بھول ہی گیا ہے جو مجھے یہاں ملا۔ راوی کے

بائیں کنارے پر ایک شخص نے میرے ساتھ بڑھ کر باتیں شروع کر دیں۔ اس کی ڈاڑھی سفید تھی اور اس کی وادی کچھ کچھ فرانسیسی وضع قطع کی تھی۔ یہ تو مجھے خوب یاد آ گیا کہ پہلے بھی اس آدمی سے ملاقات ضرور ہو چکی ہے لیکن کب اور کہاں، اس کے متعلق خیال نہیں کر سکتا تھا یہاں تک کہ اس نے بمبئی کا ذکر چھیڑ دیا۔ تب کہیں میں نے مسٹر فورنی کو پہچانا۔ اس کا قلمی شورہ بنانے کا کاروبار تھا اور وہ بمبئی سے مصر پہنچا جب کہ میں بھی وہاں تھا۔ شام کو جو ہمارا پر تکلف کھانا تیار ہوا تو مسٹر فاکس بھی آ شامل ہوا جو حال ہی میں مہاراجہ کی ملازمت میں بھرتی ہوا ہے۔

منگل وار......۱۲ جنوری: پہلی رات جو میں نے بڑی مدتوں کے بعد ایک یورپین کے ہاں گزاری اب ختم ہو چکی تھی۔ ابھی میں اپنی گہری نیند سے بمشکل بیدار ہوا ہی تھا کہ میرا حال معلوم کرنے کے لیے مہاراجہ کے ہاں سے ایک قاصد پہنچ گیا۔ میں نے جلدی سے اپنی پوشاک پہن لی اور معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب اور ان کے ساتھ فوجی جمعیت کا کماندار آئے ہوئے ہیں۔ ان سے مجھے اطلاع ملی کہ مہاراجہ کو بڑا افسوس ہے کہ اس دن وہ مجھے مل نہیں سکا کیونکہ سکھوں کے ہاں اس دن شاندار چھٹی منائی جا رہی تھی۔ اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک غیر ملکی مہمان کا شایان شان استقبال کر سکے۔ اس نے مجھے تحفے کے طور پر ایک بستر جو ریشم اور شالوں پر مشتمل تھا مع پلنگ وغیرہ بھجوایا۔

جنرل ونٹیورا کا مکان جو اس نے خود اور جنرل ایلارد نے بنوایا ہے کوئی بہت بڑا نہیں لیکن مشرق کی شان و شوکت اور ایک یورپین اقامت گاہ کی آسائشیں اس میں جمع کر دی گئی تھیں۔ داخلے کے بڑے کمرے کی دیواروں پر، جو ستونوں کی قطاروں سے پہلے نچلی منزل پر واقع ہے، دو فرانسیسی افسروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جن کا رنجیت سنگھ کے دربار میں جہاں ہزاروں شکلیں دکھائی دیتی ہیں، استقبال کیا جا رہا ہے۔ دوسرا کمرہ بے شمار آئینوں سے جن کے گرد سنہری حاشیے ہیں، مزین کیا گیا ہے جو بے انتہا تاثر کے حامل ہیں۔ تیسرا کمرہ ایک بہت بڑا حال ہے جو مکان کے پورے عرض میں پھیلا ہوا ہے اور پھر سونے کے کمرے ہیں۔ مکان کے پیچھے تھوڑے سے فاصلے پر ایک قدیم مقبرہ ہے جس کے اوپر بہت بلند گنبد ہے۔ فی الوقت اسے یورپین افسروں کے قبیلوں نے رہائش کے لیے لے رکھا ہے۔ چونکہ یہ ایک باغ کے عین درمیان واقع ہے جسے نہایت ذوق اور سلیقے سے لگایا گیا ہے، اردگرد کے ریگستانی میدان کے

مقابلے میں اس کا منظر اچھا قابل دید ہے۔ اس مقام سے راوی کی ایک شاخ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اور مشرق کی جانب پرانا شہر اور گورستان دکھائی دیتا ہے جس میں بے شمار خستہ حال عمارتیں اور مقبرے پائے جاتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے مانند ہیں جن پر باقاعدہ عمارتوں کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ لاہور کے گردونواح میں قلمی شورہ کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے جوان دیواروں کو جو کھڑی رہ جائیں بہت جلد تباہ کر دیتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ پلستر شدہ عمارتیں بھی اس سے متاثر ہو کر گر پڑتی ہیں اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ انہیں کھنڈرات کے درمیان جنرل ونٹیورا کے مکان کے سامنے زمین کا ایک مربع قطع صاف کر لیا گیا ہے جہاں فوجی دستے اپنی مشقیں کرتے ہیں۔ اس صفائی اور کھدائی سے جو اینٹیں نکالی گئی ہیں ان سے نہ صرف اس نے اپنے لیے رہائشی مکان بنوایا ہے بلکہ فرانسیسی فوج کے لیے بیرکیں بھی تعمیر کرالی ہیں۔ اس وقت تو یہ خالی پڑی ہیں کیونکہ فوج پشاور گئی ہوئی ہے۔ یہ فوج کہنے کو تو شیر سنگھ کی کمان میں ہے لیکن حقیقت میں ایوی ٹیبل کے ماتحت ہے جو پیشتر ازیں مراد کی فوج اور دربار میں ایک افسر تھا۔ وہ پالی ٹیکنیک پیرس کا طالب رہ چکا ہے اور آج کل مہاراجہ کی ملازمت میں ہے۔ پنجاب میں بہت کم یورپین ملتے ہیں۔ جنرل ونٹیورا اور ایوی ٹیبل (ان کے علاوہ ایلارڈ ہے جو آج کل رخصت پر یورپ گیا ہوا ہے)، کرنل کورٹ اور مسٹر فاکس جو انگریز ہے، اور چند دیگر افراد جو ماتحت ملازمتوں میں ہیں اور اس طرح کل نفری کی یہ فہرست پوری ہو جاتی ہے۔ تمام فوجوں میں، خواہ وہ باقاعدہ ہیں یا بے قاعدہ، ماسوائے بے قاعدہ رسالہ فوج کے، کمان کے لیے فرانسیسی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جب انہیں رائفلوں سے مسلح کر دیا جاتا ہے۔ فرانسیسی فوج کا عقاب اور ترنگا جھنڈا جس پر گووند سنگھ کے الفاظ ثبت ہیں، استعمال ہوتا ہے۔ ہر پرائیویٹ (بے قاعدہ) سپاہی کو آٹھ روپے ماہوار، ایک سرخ کوٹ اور اسلحہ مل جاتا ہے۔ البتہ خوراک اور لباس کا خرچ اس کا اپنا ہوتا ہے۔ ساری فوج کے واجبات عام طور پر بارہ مہینے کے لیے بقایا میں پڑے رہتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کا خیال ہے کہ انہیں تابع رکھنے کا یہ ایک اچھا ڈھنگ ہے۔ جمعدار یا لیفٹننٹ کو تیس روپے ملتے ہیں۔ فرانسیسی فوج کے سوا باقی سب کو اجازت ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق لباس پہن لیں۔ اس طرح یورپین پوشاک اور پنجابی لباس کی عجیب سی بوقلمونی نظر آتی ہے۔

شام کے وقت اس گھر میں چراغاں کیا گیا اور پچیس ناچنے والیاں اپنی دردآ گیں موسیقی کے ساتھ ہمارے سامنے آ گئیں۔ آتش بازی بھی چھوڑی گئی۔ کافی رات گزرنے پر ایک اور رقاصہ اپنے طائفے کے ساتھ آ پہنچی۔ وہ خاص طور پر میری تفریح کے لیے خود مہاراجہ نے بڑے تعریفی الفاظ کے ساتھ بھیجی تھی کہ یہ کوئی معمولی درجے کی فنکارہ نہیں۔ جب گورنر جنرل اور مہاراجہ کی کانفرنس ہوئی تھی تو اس موقع پر اس رقاصہ نے مجرا پیش کیا تھا اور موخر الذکر نے اس پر خصوصی عنایات فرمائی تھیں۔ لیکن لاہور کی یہ مشہور حسینہ اگرچہ ابھی بیس سال کے پیٹے میں ہے، قبل از وقت ہی پھیکی پڑ چکی ہے بشرطیکہ اس قسم کے الفاظ ایک ہندنی کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہوں۔

بدھ وار......۱۳ جنوری: نو بجے خلیفہ صاحب آ پہنچے تا کہ مجھے محل تک لے چلیں۔ وہ اپنے ساتھ تین ہاتھی لے کر آئے جن پر یورپین ہودے کسے ہوئے تھے ان میں آدمی سیدھا بیٹھ سکتا ہے اور اپنے پاؤں پھیلا سکتا ہے۔ ایک کثیر التعداد حفاظتی دستہ لاہور کے کماندار کی سرکردگی میں حاضر تھا۔ مسٹر میکےسن کو بھی دعوت موصول ہو چکی تھی۔ ہم لاہور میں جنوبی دروازے کے راستے داخل ہوئے جب ہم پرانے شاہی محل کے بیرونی حصے میں پہنچے تو مہاراجہ کے افسران جو ہماری حفاظت پر متعین تھے سب اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے جب کہ ہاتھی کچھ قدم آگے دوسرے دروازے سے گزر کر باغ میں جا پہنچے جسے نہایت اچھی حالت میں رکھا ہوا تھا۔ یہاں پر بہت چھوٹی چھوٹی سنگ مرمر کی عمارتیں میرے مشاہدے میں آئیں جو اکبر کے خاندان کے پاکیزہ ذوق کا مظہر تھیں۔ انکا بیرونی حصہ پھولوں سے مزین تھا، جو سنگ مرمر تراش کر ابھاردار بنائے گئے تھے۔ فرش اور اندرونی دیواریں سنگ خارا کی تھیں۔ ان کے متعلق دریافت کرنے پر مجھے بتایا گیا کہ یہ مہاراجہ نے خود بنائی ہیں جو صریح جھوٹ تھا۔ سفید اینٹوں کی ایک جدید عمارت جس کی بالائی منزل بھی ہے اور اس خوبصورت پرانی عمارت کے کونے میں آگے بڑھی ہوئی ہے اس کی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ ساری عمارت ہی اس نے تعمیر کرائی ہے۔ اس باغ کی بائیں طرف جہانگیر کی عظیم جمعہ مسجد ہے جس کے تین گنبد ہیں جو سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن محل سے اس میں جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ جنگجو رنجیت سنگھ اس کی حیثیت بدل کر اسے اپنے بہترین استعمال میں لے آیا ہے۔ اس مضبوط عمارت کی شمالی

دیوار کو تو شہر کی فصیل کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ ہم ایک وسیع دروازے سے گزر کر آگے بڑھے۔ یہاں ایک چھوٹا سا مربع قطعہ ہے جہاں سپاہیوں کی ایک کمپنی باقاعدہ کھڑی کی گئی تھی۔ انہوں نے ہمیں فوجی سلام پیش کیا۔ مہاراجہ ایک چھوٹی سی بارہ دری میں ایک نیچی سی پشت والی بازوؤں دار کرسی پر براجمان تھا۔ دیواروں پر زربفت کے پردے لٹک رہے تھے اور فرش پر ایک بہت بڑا قالین بچھا ہوا تھا۔ جونہی میں نے اپنا قدم قالین پر رکھا، وہ اٹھ کر میرے استقبال کے لیے دروازے تک آ گیا۔ میں نے اپنے منشی کے ہاتھ سے ۵۰۷ روپے کی ایک تھیلی لی اور اسے راجہ کے سر پر دائیں سے بائیں لہراتے ہوئے اس کے خدمتگاروں کے حوالے کر دی۔ جب مہاراجہ بیمار ہوتا ہے تو یہ رسم ضروری خیال کیجاتی ہے۔ اس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ خبیث روحوں کو دفع کیا جا سکے کیونکہ شاہانہ کمزوری کا سارا سبب انہی کو سمجھا جاتا ہے۔

میری یونیفارم ابھی تک نہیں پہنچی تھی اور میرے پاس کوئی بوٹ بھی نہ تھا۔ اس لیے مجھے جوتے پہن کر حاضر ہونا پڑا۔ جوتوں سمیت قالین پر سے گزرنا بادشاہ کی شان کی اتنی توہین نہیں سمجھی جاتی، جیسے کہ یورپین خیال کرتے ہیں بلکہ اسے نہایت بدتہذیبی اور بدتمیزی قرار دیا جاتا ہے۔ خود بادشاہ تک کو شائستگی سے مکمل طور پر محروم سمجھا جاتا ہے اگر وہ جوتوں سمیت کسی کمرے میں جہاں قالین بچھا ہوا ہو چلنے پھرنے لگے قطع نظر اس کے کہ مالک مکان اس سے رتبے میں کہیں کمتر ہو۔ یہ سب جانتے ہوئے میں نے اپنے جوتے قالین کے حاشیے سے باہر ہی اتار دیئے۔ انگریزوں کے ہاں رسم یہ ہے کہ اپنے تحائف اپنے منشی کی معرفت پیش کرتے ہیں، لیکن چونکہ مجھے معلوم تھا کہ مہاراجہ بڑا فخر محسوس کرے گا اس لیے میں نے یہ رسم اپنے ہاتھوں ادا کی۔ اب میں اس میں اپنی کوئی سبکی محسوس نہ کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ "کیا آپ کبھی سپاہیانہ خدمات بھی بجالا چکے ہیں؟" اس کا جواب میں نے اثبات میں دیا۔ اس پر اس نے مجھ سے آسٹرین فوج کے متعلق سوال کیا اور فرانس سے ہماری جنگ کا حال پوچھا۔ مسٹر میکےسن بڑا شاندار ترجمان تھا۔ جب اسنے موہن کو میرے پیچھے کھڑا دیکھا تو اس نے پوچھا کہ وہ کون ہے اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ میرا ترجمان ہے اور میرا پہلا ترجمان جو آگرے کا ایک برہم تھا بیمار ہو چکا ہے تو اس نے موہن کو میرے قدموں میں بیٹھ جانے کو کہا اور اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ موہن نے بتایا کہ "میں

ایک گورکھا ہوں۔ کشتری ہوں (یعنی فوجی ذات کا ہوں) اور صوبیدار یعنی کپتان کا بیٹا ہوں۔ تب مہاراجہ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''کیا موہن اس قابل ہے کہ جو کچھ آپ کہنا چہاتے ہوں وہ اس کا ترجمہ کر لے؟ جب میں نے اسے بتایا کہ ہاں وہ ایسا کر سکتا ہے تو وہ بولا کہ میں اس کی آزمائش کرتا ہوں اور جھٹ سے اس جوان کو کہا کہ ''ان سے پوچھ کر بتاؤ کہ ان کی میری فوج کے متعلق کیا رائے ہے۔ اور کیا یہ اس حالت میں ہیک ایک یورپین طاقت سے مقابلہ کر سکے؟'' میں نے جواب دیا کہ ''سکھوں کی بہادری تو عرصے سے مشہور ہے اور اب جب کہ ان میں یہ نظم ونسق پیدا کیا جا چکا ہے تو بلا شک ایسے مقابلے میں ضرور برابر اتریں گے۔'' اس نے پوچھا ''جب دونوں طرف فوجیں برابر ہوں؟'' میں بولا ''بلاشک۔'' ''آپ نے تمام دنیا دیکھی ہے۔ کس ملک کو آپ سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں؟'' ...... ''اپنے وطن کی سرزمین کو'' ...... ''آپ نے کشمیر کو دیکھا ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟'' ...... ''گزشتہ سالوں کی بیماری اور قحط نے اسے اتنا غیر آباد کر دیا ہے کہ اس کے محاصل سے بہت کم رقم وصول ہوتی ہو گی'' ...... ''میں نے میہان سنگھ کو حکم دیا ہے کہ غریبوں کی نقد امداد کرے۔ آپ خیال کرتے ہوں گے کہ وہ لوٹ رہا ہے۔'' ...... ''میرا تو ایسا خیال نہیں'' ...... ''کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ مجھے اسے حکومت سے برطرف کر دینا چاہیے۔ اس میں سمجھ بوجھ بالکل نہیں۔'' ...... میرا خیال ہے کہ وہ بطور گورنر کے مناسب ہے اور آپ کو بھی آسانی سے بہتر شخص نہیں مل سکے گا۔ ملک کو اس وقت دل جوئی کی ضرورت ہے تا کہ حالات بحال ہو سکیں۔

جس دوران میں ان سوالات کا سلسلہ جاری تھا اور جب میکے سن فارسی میں ترجمہ کرتا جاتا تھا اور خلیفہ صاحب اسی پنجابی میں ترجمہ کر رہے ہوتے تو مجھے اس فوجی جمعیت کو بنظر غائر دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ مہاراجہ کے قریب ہی ایک کرسی ہیرا سنگھ بیٹھا تھا، یہ سولہ سال نوجوان منظور نظر راجہ دھیان سنگھ وزیر اعظم کا بیٹا تھا، باقی تمام حکومت کے افسران زمین پر بیٹھے تھے۔ ہر شخص کی نگاہ مجھ پر جمی ہوئی تھی تا کہ میرے جوابات کا قیاس کر سکیں، پیشتر اس کے کہ وہ مہاراجہ کی اطلاع کی خاطر ترجمہ کیے جائیں۔ دربار کا سرکاری رنگ زرد یا سبز تھا اور امیر اور افسران سب زرد لباس میں ملبوس تھے جو کشمیری اون کا بنا ہوا تھا، صرف ہیرا سنگھ نے ہلکے سبز اور گلابی رنگوں کی اطلس کی پوشاک پہنی ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ حاضرین میں راجہ سچیت سنگھ تھا جو

دھیان اور گلاب سنگھ، جموں کے میاں یعنی نواب کا بھائی تھا۔ خوشحال سنگھ تھا جسے جمعدار کہتے ہیں۔ وہ ایک برہمن تھا جسے کسی وقت سکھ بنا لیا گیا تھا۔ وہ کبھی مہاراجہ کے خانگی ملازموں میں باورچی ہوا کرتا تھا اور پھر جمعدار یعنی لیفٹننٹ بنا دیا گیا اور اب اس کا رتبہ محل کے امور خانہ داری کے مدار المہام کے برابر ہے۔ اس نے اپنا پرانا لقب ہی بحال رکھا ہے اگرچہ دھیان سنگھ کے بعد وہ رنجیت سنگھ کے سب سے زیادہ بااختیار جاگیرداروں میں سے ہے۔ مہاراجہ کا سب سے بڑا بیٹا کڑک سنگھ (کھڑک سنگھ) لاہور میں سکونت پذیر ہے، لیکن اسے ہمیشہ ہی نظرانداز کر دیا جاتا ہے کیونکہ دماغی صلاحیت اس درجہ پست ہے کہ اس کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا کہ وہ اس سکھ سلطنت پر کبھی حکمرانی کر سکے گا جو بمشکل متحدہ کہلا سکتی ہے۔ اس کا بیٹا انہال سنگھ ہونہار، سمجھدار اور چست جوان ہے لیکن اس کی عمر پندرہ برس سے زائد نہیں۔ اب یہ رنجیت سنگھ کی صحت پر موقوف ہے کہ آیا اسے موقع ملتا ہے یا نہیں کہ ایک طاقتور پارٹی بنا لے جو اس کے پوتے کو تخت کا وارث بنا دیں جب کہ اس کے باپ کے حقوق کو نظرانداز کیا جائے۔ شیر سنگھ اور تارا سنگھ دو جڑواں بھائی ہیں جنہیں رنجیت سنگھ نے کبھی اپنے بیٹے تسلیم نہیں کیا۔ اول الذکر نے اپنی سپاہیانہ قابلیت کا سکہ تو منوا لیا ہے لیکن جب اسے کشمیر کا گورنر تعینات کیا گیا تو نہایت نااہل ثابت ہوا۔ آج کل وہ پشاور میں ہے اور گورنر کہلاتا ہے البتہ ملک کے جملہ امور اور نظم و نسق کلیتاً جنرل ایوی ٹیبل کی ہدایات پر سرانجام پاتے ہیں۔ تارا سنگھ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کشمیر سنگھ اور پشاور سنگھ کو بھی رنجیت سنگھ کے بیٹے کہتے ہیں لیکن ان کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ جس شہنشاہیت کی بنیاد رنجیت سنگھ نے رکھی ہے اس کے استحکام میں سب سے زیادہ رکاوٹ تو اس کوتاہ اندیشی سے پیش آئے گی جس کی وجہ سے بعض جاگیرداروں کی شخصیت میں بہت زیادہ طاقت جمع ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر گلاب سنگھ کو جموں میں اور اس کے بھائیوں دھیان سنگھ اور سچیت سنگھ کو اتنے بڑے علاقے کا قبضہ دے دیا گیا ہے جو اٹک کے دشوار گزار پہاڑوں سے لے کر جنوب مشرق میں نار پور (نور پور) تک اور اس سے پرے شمال میں لداخ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب میں بھی ان کی بہت وسیع جاگیریں موجود ہیں۔ یہ بھائی جو دولت، فوج، توپخانوں اور قلعوں کے لحاظ سے ایسے طاقتور ہیں، رنجیت سنگھ سے کمزور جانشینوں کے ہاتھوں بڑی مشکل ہی سے مغلوب ہو سکتے ہیں۔ اس طرح بعض دوسروں کا حال ہے۔ اس

بادشاہ کے خاندان کو بھی استحکام نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کمپنی کے ساتھ اتحاد کی صورت نہ پیدا کر لیں جس میں اس کا تکبر اور پالیسی اب تک مانع ہو رہی ہے۔ مہاراجہ کا کوئی تخت نہیں ہے۔ اس پر یوں رائے زنی کرتا ہے: ''میری تلوار ہی نے مجھے یہ امتیازی حیثیت دی ہے جس کی مجھے خواہش ہے۔ ظاہری شان و شوکت سے میں بے پرواہوں۔''

رنجیت سنگھ کی عمر اس وقت چند سال ہے۔ چیچک نے بچپن ہی میں اسے ایک آنکھ سے محروم کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اس کا نام پڑ گیا تھا 'کانا' یعنی یک چشم گل۔ اسی عارضے کی وجہ سے اس کے چہرے پر بھی داغ پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی داڑھی چھدری اور سفید ہے جس میں چند سیاہ بال بھی نظر آتے ہیں۔ سکھ مذہب کے رواج کے مطابق یہ اس کی ٹھوڑی سے ذرا نیچے اور ناتراشیدہ ہے۔ اس کا سر مربع شکل کا اور اس کے قد و قامت کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔ اس کا قد اگرچہ قدرتی طور پر پست ہے لیکن بیماری کے باعث خاصا جھک گیا ہے۔ اس کے شانے فراخ ہیں اگرچہ اس کے بازو اور ہاتھ سکڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی وہ مہیب ترین شکل کی انسانی ہستی ہے جیسی شاید پہلے کبھی میرے دیکھنے میں نہ آئی ہو گی۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں، مضطرب اور شک و شبہ مملو، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مخاطب شخص کے خیالات کی گہرائیوں تک دسترس رکھتی ہوں۔ اس کے براہ راست سوالات نہایت مختصر الفاظ میں اس تسلسل سے پوچھے جاتے ہیں کہ بیچ میں کوئی وقفہ نہیں آتا۔ لقوے کی وجہ سے اس کا کلام اس طرح متاثر ہے کہ اس کا سمجھنا کوئی آسان بات نہیں۔ لیکن جواب میں اگر لمحہ بھر توقف ہو جائے تو اس کے درباریوں میں کوئی ایک، اور عموماً جمعدار ہی وہ سوال دہرا دیتا ہے۔ جب پورے ایک گھنٹے تک مجھے اس امتحان میں ڈالے رکھا اور ایک لمحے کا وقفہ بھی نہ دیا کہ میں جواباً کوئی سوال پوچھ سکوں۔ اس نے مسٹر وائنے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''اور تم کیا کر سکتے ہو؟'' اس کا جواب میرے ساتھی مسافر نے اپنی حسب معمول سادگی سے دیا کہ ''میں تصویریں بنا سکتا ہوں۔'' مہاراجہ کے فہم سے یہ بعید تھا کہ کیسے ایک فن جس کی اس کے ہاں کوئی خاص وقعت نہ تھی، ایک صاحب لوگ یعنی ایک اعلیٰ قسم کے گورے آدمی کے وقت کو مصروفیت بہم پہنچا سکتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی زبردست حکومت کے زیر اثر مجھے ایسی حفاظت میسر رہی جیسی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی

مملکت میں۔ اس کے ساتھ میں نے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ پکی دوستی جو دونوں ملکوں میں ہو گئی ہے ہندوستان اور پنجاب میں بڑے اطمینان کا باعث بن گئی ہے۔ میری یہ رائے اسے خاص طور پر پسند آئی اور پھر اس کے پہلے خط کے جواب میں نے ارادۃ اس یگانگت کے متعلق کچھ مشرقی صنائع بدائع کے پھول بکھیرے جس کے جواب میں مجھے بہت قلیل عرصے میں انشاء پردازی کا نمونہ موصول ہوا جس میں میری ضرورت سے زیادہ تعریف کی گئی تھی اور میرے حاصل مضمون کی مزید وضاحت کی گئی تھی۔ اب اس نے مجھ سے پوچھا کہ ''آپ کے خط کون لکھتا ہے؟'' میں نے ٹھاکر داس کا نام لیا اس نے اس کی بڑی تعریف کی اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ''مجھے امید ہے لاہور آپ کو پسند آئے گا۔ بس حکم دیجیے اور یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے۔'' سپاہیوں کی ایک کمپنی صحن میں متعین تھی۔ اس نے ''پوچھا کیا آپ انہیں مشقیں کرتے ہوئے دیکھنا پسند کریں گے؟'' اس پر میں نے جھک کر رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرا بایاں ہاتھ پکڑا۔ دوسرے سے موہن کا دایاں ہاتھ پکڑا۔ اس طرح وہ داخلے کے دروازے پر پہنچا جب کہ وہ لوگ مارچ پاسٹ کرنے لگے۔ حکم فرانسیسی زبان میں دیا جاتا۔ مشق نہایت صحیح انداز میں پیش کی گئی۔ اس نے کہا کوئی غلطی ہو تو معاف کریں۔ میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے تو حیرت ہوئی ہے کہ فوج کو اس عمدگی سے یورپین جنگی چالیں سکھائی گئی ہیں۔'' اس پر اس نے سوال کیا کہ ''کیا آپ کے شہنشاہ کی فوجیں بھی اسی طرح مشق کرتی ہیں؟'' میں نے جواب دیا کہ ''یورپ کی تمام ریاستوں میں تنظیم (ڈسپلن) میں بہت زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اگرچہ آسٹرین فوج میں کچھ خاص خاص باتوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ہم یہ عمل تین مشقوں میں کرتے ہیں جبکہ فرانس والے دو مشقوں میں۔'' اس نے کہا ''آپ کو کتنی تنخواہ ملتی ہے؟'' میں نے جواب دیا کہ مجھے کچھ نہیں ملتا۔ دس سال ہوئے میں نے ملازمت چھوڑ دی تھی کیونکہ امن ہو جانے کے باعث اس میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ سرگرم کار افسروں یا ناکارہ ہو جانے والوں کے سوا، کسی کو کوئی ادائیگی نہیں کی جاتی۔ اس نے پوچھا ''آسٹرین کرنیل کی تنخواہ کتنی ہوتی ہے؟'' میں نے اسے بتایا کہ اسے انگریز کرنیل سے کم تنخواہ ملتی ہے لیکن چونکہ انہیں اپنی ترقی پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا اس لیے اصل میں انہیں زیادہ رقم مل جاتی ہے۔'' کیا آپ ولیم ہنٹنگ سے ملے ہیں؟''......

''نہیں، میرے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ کلکتے سے جاچکا تھا'' ...... ''کیا آپ مسٹر برنیز کو جانتے ہیں؟'' ...... ''صرف اس کی تحریروں کے ذریعے سے'' ...... ''کیا آپ میری فوجوں کو مشقیں کرتے ہوئے دیکھنا چاہیں گے؟'' ......اس پر مین نے کہا کہ ''یہ تو میرے لیے آں عالی مرتبت کی خصوصی نوازش ہوگی۔

جس دوران میں کہ سپاہی اس چھوٹے سے احاطے میں مارچنگ کر رہے تھے اس نے اپنے سوالات کا لامتناہی سلسلہ جاری رکھا اور آسٹریا، فرانس اور انگلستان کے فوجی وسائل کے متعلق استفسارات کرتا رہا اور دریافت کرتا رہا کہ یورپ کی مختلف ریاستوں کے ہاں ان فوجی دستوں کی تعداد کیا ہوگی جنہیں فارغ بھی کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ ''جب آپ پنجاب سے روانہ ہوکر یورپ جانے کی تیاری کریں گے تو موہن کا کیا بنائیں گے؟'' میں نے جواب دیا اب تک تو اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا، لیکن میری خواہش تو یہ ہے کہ اگر وہ میرے ساتھ جانا پسند کرے تو اسے ساتھ ہی لیتا جاؤں، کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس کی بھی یہ بڑی تمنا ہے۔ اب میں قیاس کر رہا تھا کہ مہاراجہ کیا سوچ رہا ہے چنانچہ اس نے فوراً ہی اس کا اظہار بھی کر دیا کہ ''آپ اس کی قسمت بنا دیں گے اگر اس کو میرے پاس چھوڑ جائیں، اس نوجوان کو میرے ہاں بھیج دیجیے اور میں اس کا خیال رکھوں گا۔''

اس کے بعد جب ہم دوبارہ آ بیٹھے تو اس نے کہا کہ ''آپ میرے تمام سوالات کا جواب دیتے دیتے تھک گئے ہوں گے؟'' میں بولا کہ یہ تو ناممکن ہے لیکن میں بھانپ گیا کہ اب مجھے رخصت ہونا چاہیے اور مہاراجہ مجھے دروازے تک چھوڑ گیا۔

فقیر صاحب کی اس گلفشانی کا ذکر جو انہوں نے ہمارے ساتھ جاتے ہوئے کی، وہ تو قریباً چھوڑ گیا ہوں۔ مینہ برسنا شروع ہو گیا اور ان کا ہاتھی میرے ہاتھی کے قریب ہی چلتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا ''آج تو جھڑی کا دن ہوگا'' فقیر صاحب فرمانے لگے ''جب گلستان یگانگت میں شاہوں کی ملاقات ہو تو سقایان سماوات پھولوں پر ترشح کر دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی تمام نکہت پیش کر دیں۔'' میں نے کچھ مایوسی کا اظہار کیا کہ میں مجبور سا ہو گیا ہوں کہ اپنے سیاہ سوٹ میں حاضر دربار ہوں گا کیونکہ لدھیانے سے میری یونیفارم اب تک موصول نہیں ہوئی تھی جس کے متعلق میں ہدایت بھیج چکا تھا کہ مجھے لاہور پہنچا دی جائے اس کے بعد اس نے ایک شیر کی لمبی

داستان چھیڑ دی۔ وہ کہیں ایک شہر میں آ نکلا اور ہر شخص اس سے دہشت زدہ ہونے لگا پھر کسی طرح اس ملک کے بادشاہ کو اس شیر کی کارروائیوں کی اطلاع ملی تو اس نے دیکھ لیا کہ اس کے تمام کارنامے شریفانہ اور معززانہ ہیں تو اس کی بدلی ہوئی ہیئت کذائی کے باوجود وہ اس کی اصل فطرت کو تاڑ گیا۔ اور جب اس نے اسے اپنے محل میں بلوا بھیجا تو اس نے پہچان لیا کہ شیر کے بھیس میں وہ تو ایک عظیم شہزادہ ہے۔" میں نے کہا کہ "اچھا! تو آپ مجھ کو شیر سے تشبیہ دے رہے ہیں۔" جواباً فرمانے لگے "آپ کے خاندانی کارنامے اور آپ کی دماغی صلاحیتیں آپ کا بھید کھول دیں گی۔ گویا مختصراً اس لفاظی سے پر داستان کا حاصل مطلب یہ تھا۔

جب ہم اس ملاقات سے واپس آئے تو میں نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ شہر کا نظارہ بھی کرنا چاہیے۔ کیونکہ محل تک جاتے ہوئے جو جنوب مغرب میں یا عین مغربی سرے پر واقع ہے، ہم جنوبی دروازے سے اندر داخل ہو گئے تھے۔ ایک غیر دلچسپ سی گلی کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ہندوستان بھر میں نہایت شاندار عمارتیں ایک عجیب تقابل پیش کرتی ہیں کیونکہ ان کے اردگرد کھنڈرات، کوڑے کرکٹ کے انبار اور ہر نوعیت کے ذلیل جھونپڑے ایک دوسرے کے اندر گھسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں لاہور تمام دوسرے شہروں پر فوقیت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ محل کے قریب ہی غلاظت کے ڈھیر اور کافی گہرے گڑھے موجود ہیں۔ پھر گارے کی افتادہ دیواریں اور بے شکل پتھروں کے انبار پڑے ہیں جن پر سے مسافر اور ہاتھی کا گزرنا مشکل ہوتا ہے۔ تباہی کے ان گڈمڈ آثار میں اکثر اوقات ہاتھی، گینڈے، شیر یا چیتے کی شبیہیں بھی ملتی ہیں لیکن ہاتھی انہیں ذرا بھی پہچانے بغیر بڑے دبے پاؤں وہاں سے گزر جاتا ہے۔ ان سے پار آخر آپ بازار میں پہنچیں گے جہاں بہت قیمتی سامان کی نمائش کی جاتی ہے۔ یہ ان گلیوں میں ہی پڑا ہوتا ہے جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک موسلا دھار بارش ہونے کے بعد دلدلیں بن جاتی ہیں۔ بدنصیب راہگیر کو ان میں سے پیدل گزرنا پڑتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ کہیں قدم رکھنے کو کوئی خشک جگہ مل جائے لیکن بے سود۔ اس کے سفید لباس پر ہر سوار کے گزرنے سے چھینٹے پڑتے ہیں اور اس سے پیشتر کہ وہ بازار سے نکل جائے، سر سے پاؤں تک تمام بدن پر گلکاری ہو جاتی ہے۔ نہایت مضبوط لیکن ہٹائے جانے والے چھجے ہر دکان پر اس طرح بڑھے ہوئے اور اس تنگ اور پیچیدہ گلی کی پوری چوڑائی پر سایہ فگن ہیں کہ ہاتھی کی پیٹھ پر

سوار کے لیے اتنی بلند و بالا حالت کو برقرار رکھنا کوئی کم مشکل نہیں ہوتا، خواہ دوسرے وجوہ سے اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ سوکھنے کے لیے لٹکائی ہوئی چیزیں، بیل گاڑیاں، گھوڑوں کے سوار، اونٹ، کوئی مخالف سمت سے آتا ہوا ہاتھی اور بے شمار مختلف قسم کی اشیاء پر پوری توجہ رکھنی پڑتی ہے تا کہ آگے بڑھا جا سکے یا ان کے رستے سے ہٹا جا سکے۔ اس اثناء میں بالا خانوں کے برآمدوں میں جن پر عمدہ نقش و نگار تراشے ہوئے ملے ہوتے ہیں، بازار کے دونوں طرف قریباً بازو کی پہنچ میں دولت مند بنیے اپنے رنگے ہوئے چہروں اور سرخ پگڑیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں جو اکثر اوقات جھک کر تعظیم بجالاتے ہیں یا بعض مقامی سیاہ فام حسینائیں مسافر کو تسلیم کے لیے کہتی ہیں ''سلام مہاراج''۔ اس بازار کی گلیاں بے حد پیچیدہ ہیں اور مجھے تو بڑی فرحت محسوس ہوئی جب میں ایک دروازے میں سے گزر کر دوبارہ باہر کی تازہ ہوا میں جا پہنچا۔

جب میں جنرل ونٹیورا کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ مہاراجہ کا قاصد آیا ہوا ہے۔ یہ خلیفہ صاحب کے بڑے بھائی عزیز الدین تھے جو امور سیاسی کے زیر ہیں، انہوں نے مطلع کیا کہ ''مہاراجہ کو آپ کی ملاقات سے بہت سی خوشی ہوئی ہے اور انہیں امید ہے کہ آپ لاہور میں دیر تک قیام کریں گے۔'' وہ میرے لیے بارہ ٹوکرے بھی لایا جو کابل، کشمیر اور لاہور کے بہترین پھلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دو سو پچیس روپے نقد میرے خدمتگاروں کی ایک دن کی تنخواہ کے عوض بھی شامل تھے۔

تینوں بھائی یعنی عزیز الدین سکتر خفیہ امور، خلیفہ صاحب مارشل (مدار المہام افواج) اور امرتسر کے گورنر اکثر میری صحبت میں رہتے تھے اور میری رائے ہے کہ مہاراجہ ان تینوں مسلمانوں پر بہت زیادہ اعتماد رکھتا ہے اور وہ اپنی قابلیت اور اعلیٰ کردار کے باعث اس کے خوب مستحق ہیں۔ ان کو عموماً فقیر صاحب کے لقب سے پکارا جاتا ہے اور وہ اپنی اس نام نہاد مفلسی پر فخر کرتے ہیں حالانکہ تینوں دولتمند آدمی ہیں۔ ان کا آقا رنجیت سنگھ ہر لحاظ سے، خصوصاً ہندوستانی ہو کر، ایسے غیر معمولی کردار کا حامل ہے کہ میں نے آگے چل کر کافی تفصیل سے اس کے حالات قلمبند کیے ہیں۔

دن چھوٹے تھے اور جب میرے ملاقاتی رخصت ہو گئے تو جلد ہی شام اڈنے لگی۔ میں دریا کے کنارے میدان میں اور بعض دلکش سرسبز کھیتوں میں غروب آفتاب تک سیر میں

مصروف رہا۔

بدھ وار..... ۴ جنوری: مجھے جگا کر اطلاع دی گئی کہ عزیز الدین صاحب نصف گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ مہاراجہ کے ہاں سے پیغام لے کر آئے ہیں۔ میں نے جلدی سے کپڑے پہن لیے اور فوراً اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں رسمی تسلیمات کے بعد، جن میں کمال تکلفات سے کام لیا جاتا ہے، مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔ فقیر صاحب نے پہلے تو مجھے یقین دلایا کہ مہاراجہ نے پیشتر ازیں کبھی ایسے شخص سے ملاقات نہیں کی جس کی دانشوری نے ان کو اتنا حیرت میں ڈال دیا ہو۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ ان کے ہاں ٹھہر جائیں۔ یہ تو ان کو خوب معلوم ہے کہ کوئی نقدی یا کوئی منفعت بخش عہدہ آپ کے لائحہ عمل کو متاثر نہیں کر سکتا، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ آپ رہیں تو لاہور میں اور خرچ کے لیے رقم اپنے وطن سے منگوائیں۔ اس لیے وہ آپ سے فرمائش کرتے ہیں کہ اگر آپ یہاں قیام کرنے کا ارادہ کر لیں تو معاوضے کے طور پر چھ ہزار روپے ماہوار بھتہ آپ قبول کر لیں گے۔

میں نے جواب دیا کہ مہاراجہ کی پیشکش میرے لیے قابل فخر ہے۔ اور اگر میں ذرا اور جوان ہوتا تو یقیناً اسے قبول کر لیتا۔ لیکن میرے خانگی حالات کا تقاضا ہے کہ کوئی وقت ضائع کیے بغیر واپس وطن پہنچ جاؤں۔ مجھے اب لازمی طور پر چھ ہفتے کے اندر اندر بمبئی پہنچنا ہے ورنہ مجھے ہندوستان میں مزید ایک سال کے لیے رکنا پڑے گا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ میری زندگی کا ایک سال اکارت گیا۔ فقیر صاحب نے مجھے ٹھہرنے پر آمادہ کرنے کی بڑی کشش کی لیکن جب انہوں نے مجھے ارادے کا پختہ پایا تو مزید اصرار نہ کیا۔ پھر فرمانے لگے کہ مجھے آپ سے کچھ جوابات لے کر مہاراجہ کو پہنچانے ہیں۔ میرے مہاراج نے مجھے سوالات کی یہ فہرست دی ہے جو اس نے بذات خود لکھوائی ہے۔ انہوں نے وہ جیب سے نکالی اور پڑھنا شروع کیا:

ا۔ مہاراجہ کو علم ہے کہ آپ نے دنیا بھر کی سیاحت کی ہے۔ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان تمام ممالک میں آپ نے کون سی چیزیں سب سے زیادہ قابل ذکر دیکھی ہیں؟

میں نے جواب دیا کہ میری سیاحت کی غرض و غایت میں گوناگوں مسائل شامل ہیں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ میں دور دراز ملکوں میں اخلاقی اور طبعی حالات سے واقفیت بہم پہنچاؤں جو نہایت غیر معمولی ہیں۔ مثلاً عمارات میں اہرام مصر اور تاج محل، ملکوں میں سے نیو ہالینڈ اور

کشمیر، اوراخیر میں سب سے بڑھ کر ساحل مالا بار پر رسم ورواج، ایسٹ انڈیا کمپنی جومہاراجہ کی اتحادی ہے اس کی عظمت وقوت اور حال ہی میں جو سلطنت رنجیت سنگھ نے قائم کی ہے، جس نے ایک ماہر کاریگر کی مانند اتنے بے حقیقت اور ردی ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک شاندار جامہ تیار کر دیا ہے، میری رائے میں تمام روئے زمین پر سب سے عجیب وغریب شے ہے۔

فقیر صاحب میرا جواب لکھتے جاتے اور اپنی حیرت کا اظہار کئی مرتبہ واہ واہ کہتے ہوئے کرتے جاتے تھے۔

۲۔ مہاراجہ صاحب اس سے واقف ہیں کہ آپ نے یہ سفر کوئی نفع کمانے کے لیے نہیں کیا اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ اپنے ملک میں ایک معزز اور اہم حیثیت کے مالک ہیں۔ پھر اتنے دور دراز سفر اختیار کرنے کی کیا غرض وغایت تھی؟

میں نے جواب دیا کہ جزوی طور پر تو میں نے اپنے دلائل کی وضاحت پہلے ہی کر دی ہے۔ اور یہ نہایت مشکل بات ہے کہ میں مشرق کے کسی باشندے کو ایک یورپین کی ذہنیت سے آشنا کرا سکوں۔ ہندوستان میں تو زندگی کے بس دو ہی مقصد ہیں یعنی جسمانی یا اخلاقی مسرت، جو یا تو طاقت حاصل کر کے انسانی خواہشات کی تکمیل پر قادر ہو جانے میں ہے یا پھر ایک دوسرے جہان میں کہیں زیادہ راحت حاصل کرنے کی امید پر، فی الوقت نفس کشی اور اعمال صالحہ میں مصروف ہو جائے۔ یورپ میں انسان کی توجہ ایک تیسرے مقصد کی طرف بھی ہوتی ہے جس کے لیے اسے ہمہ وقت مصروفیت مل جاتی ہے اور وہ ہے سائنسی تحقیق، ان مضامین و مسائل پر جو ایک ایشائی کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اسی رجحان طبع کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہے کہ یورپیوں نے تمام مفید ترین اور غیر معمولی ایجادات کی ہیں۔ اور میری اپنی جہاں گردی جزوی طور پر اسی رجحان پر مبنی ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ وجوہات ہیں جو ان لوگوں کے لیے جن کے معمولات مختلف ہوں بہت کم قابل فہم ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ مہاراجہ صاحب کو میرا یہ جواب پہنچائیں کہ میرا خاص مقصد مختلف ممالک کے عجیب وغریب رسم ورواج کا مشاہدہ اور جہاں تک ممکن ہو انہیں اپنے ملک کے مفاد کی خاطر کام میں لانا ہے۔

۳۔ مہاراجہ اسے ممکن خیال نہیں کرتے کہ آپ نے جو اس قدر خطرناک سفر اختیار کر رکھا ہے یہ کسی ایسی چیز کے بغیر ہو جو بیماری سے آپ کی حفاظت کر سکے۔ غالباً آپ اپنے

ساتھ کوئی ایسی دوائی لائے ہوں گے جو آپ کی زندگی کی محافظ ہوگی۔ مہاراجہ صاحب معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا ہے، بشرطیکہ اسے بتانے میں آپ پر جو ساحرانہ اثر ہے اس کی قوت میں کمی نہ آئے؟

اس سوال پر چہرے پر مسکراہٹ تک لائے بغیر، کیونکہ ایسی صورت میں تمام حاضرین کو موقع مل جاتا کہ وہ بھی اس میں شریک ہو جاتے، میں نے جواب دیا کہ یورپ میں اب ہمارا ان باتوں پر اعتقاد نہیں رہا کہ کوئی خاص دوائیاں زندگی کو بڑھا سکتی ہیں۔ لیکن جب بہت اصرار کیا گیا تو میں نے تسلیم کر لیا کہ اپنی صحت کو بحال کرنے کے لیے میرے پاس ایک دوائی ہے جس کے استعمال سے ہمیشہ کامیابی ہوئی ہے۔ یہ دو صورتوں میں ملتی ہے، ایک تو گولیوں کی شکل میں اور دوسری جو فوری طور پر اور زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے سفوف کی شکل میں۔ فقیر صاحب نے میرا زبانی جواب لفظ لفظ تحریر کر لیا۔

۴۔ مہاراجہ صاحب کو معلوم ہے کہ یورپین لوگ ایک مختلف قسم کے خوراک کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اپنے سفروں کے دوران میں آپ نے یہ ضرورت کس طرح پوری کی؟ خصوصاً گائے کا گوشت حاصل کرنے کے لیے آپ نے کیا وسائل اختیار کیے۔

میں نے جواب دیا کہ کسی خاص قسم کی خوراک کے لیے میں نے کم ہی پروا کی ہے اور جو میسر آتا رہا ہے اسی پر گزراوقات کر لی ہے۔ لیکن یورپ میں خاص طریقہ استعمال ہوتا ہے جس سے خوراک کو ٹین کے ڈبوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور وہ سالوں تک تر و تازہ رہتی ہے۔

۵۔ کسی دشمن پر یقینی طور پر فتح پانے کے کیا طریقے ہیں؟

اس کے جواب میں میں نے بیان کیا کہ میری رائے میں پنجاب کے لیے تو بہترین حکمت عملی یہ ہوگی کہ سپاہیوں کو ڈسپلن (تنظیم) کے زبردست ماتحت ہونا چاہیے اور جب جرنیل فوج کو اس معیار پر پہنچا لے کہ ساری جمعیت کی حرکت اس کی اپنی تلوار کی مانند ہو جائے گویا دس ہزار بازوؤں والی روح بن جائے تو اسے اپنی فتح پر یقین کر لینا چاہیے۔ فقیر صاحب بے اختیار پکار اٹھے ''واہ! واہ! کیا عجیب و غریب بات ہے! کیا حیرت انگیز بیان ہے!'' اور پھر مسٹر میکے سن سے مخاطب ہو کر پوچھا ''کیا یہ رائے ان کی اپنی ہے؟'' اور جب انہوں نے سنا کہ واقعی یوں ہی ہے تو بار بار کہہ اٹھے ''واہ! واہ!''۔ جب انہوں نے میرا جواب مناسب الفاظ

میں قلمبند کرلیا تو مجھ سے جانے کی اجازت چاہی۔ اور جاتے جاتے مشرقی اداب کے انتہائی مبالغہ آمیز تعریفی الفاظ کا ایک سیلاب رواں کر دیا۔

میں نے یہاں اس وقت تک قیام کے تمام انتظامات کر لیے جب تک کہ مجھے اطمینان نہ ہو جاتا کہ میرے تمام آدمی لدھیانے پہنچ گئے ہیں۔ میں لاہور سے اس مقام تک تین دن میں پہنچ سکتا تھا۔ وہاں میری فراہم کردہ تمام اشیاء کو باندھنا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ ہر منزل کے لیے مزدوروں کو اجرت پر لگانے کا بندوبست کرلیا جائے اور اس طرح تمام اسباب دہلی جائے وہاں سے بمبئی پہنچ جائے۔ آج ہی مجھے اطلاع ملی کہ وہ لوگ اب تک امرتسر بھی نہیں پہنچے۔ جو راستہ ان کے لیے متعین کیا گیا تھا، اس طرف سے انہیں اس مقام تک اس روز پہنچنا چاہیے تھا جب میں لاہور پہنچا تھا۔ امرتسر سے لدھیانہ آٹھ منزل ہے۔ چنانچہ میں نے ارادہ کرلیا کہ بائیس تاریخ تک لاہور میں قیام کروں گا اور پھر میں ان کے لدھیانے پہنچنے کا مزید انتظار نہیں کروں گا۔

مہان سنگھ گورنر کشمیر کے خاندان کا ایک وفد، اس کے بیٹے کی سرکردگی میں آج آ پہنچا تا کہ جس انداز میں میں نے اس کے باپ کے متعلق رنجیت سنگھ سے ذکر کیا تھا اس کے لیے میرا شکریہ ادا کرے۔ اس میں مہاراجہ کے اس سوال کا حوالہ تھا جس میں اس نے پوچھا کہ کیا مہان سنگھ کو کشمیر سے ہٹا دیا جائے۔ میری رائے تھی کہ جہاں اس صوبے کے لیے زیادہ مستعد گورنر کی ضرورت ہے وہاں موجود گورنر کی جگہ بہتر آدمی ملنا بھی تو مشکل ہے۔ میں نے اس نوجوان کو جو ابھی تیرہ چودہ سال کی عمر کا ہے بتایا کہ کم از کم اس کی نیت تو نیک ہے اس لیے اپنے والد کو یقین دلا دیں کہ میں کبھی بھی رنجیت سنگھ کو اس کے خلاف بدظن نہیں کرسکتا۔ جمعدار کا بیٹا بھی میری ملاقات کو آ گیا۔ وہ چودہ سال کی عمر میں جرنیل ہے لیکن اپنی جواں سالی کے باوجود اس کیف راست، بشاشت اور معلومات حاصل کرنے کے شوق سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے کارنامے سرانجام دے گا۔

آج شدید سردی کا دن تھا۔ جب میں اپنے کاغذات کو ترتیب دے رہا تھا، میری انگلیاں قریباً منجمد ہو رہی تھیں۔ میں نے کئی مرتبہ چبوترے کے چکر کاٹے تا کہ دھوپ سے اپنے جسم کو گرما سکوں۔ شام کو ہمارے ہاں ناچ تھا۔ اس موقع پر بھی مہاراجہ تحائف بھیجنے سے نہ

چوکے اور تین ناچنے والی لڑکیاں بھی بھیج دیں۔

جمعہ......١٥ جنوری: فقیر عزیز الدین صبح سویرے ہی پہنچ گئے تاکہ مہاراجہ کی طرف سے میرے جوابات کا، جو میں نے اس کے سوالات کے دیئے تھے، شکریہ ادا کریں۔ مشرقی رواج کے مطابق انہوں نے یہ شکریہ تین بار ادا کیا اور ساتھ ہی کہا کہ مہاراجہ چاہتے ہیں کہ آپ لاہور میں کچھ مدت قیام کریں۔ اس سلسلے میں اگر شہنشاہ آسٹریا کی اجازت کی ضرورت ہوئی تو وہ خود ایسی درخواست کرنے کو تیار ہیں۔ بہر حال انہیں امید ہے کہ آپ کئی مہینوں تک لاہور چھوڑ کر نہیں جائیں گے اور جیسی تجویز آپ نے پیش کی ہے اس کے مطابق ایک رجمنٹ تیار کر دیں گے، اس سلسلے میں اگر آپ کو باقاعدہ تنخواہ وصول کرنا گوارا نہ ہو تو یہ معاملہ آپس میں اور طریقے سے بھی طے ہو سکتا ہے۔

جب صدق دل سے یہ پیشکش جسے میں نے رسمی سی بات سمجھا تھا پھر دہرائی گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ مہاراجہ اس معاملے میں سنجیدہ ہے۔ اور میں صاف صاف اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے ایک لحہ اس پر غور کرنا پڑا کہ یہ جو کشائش قسمت کا موقع ملتا ہے یہ تو میری توقعات سے کہیں بعید ہے۔ اگر وسطی ایشیا میں مہم پر جانے کی میری آرزو تھی تو اس میں اب کوئی مشکل در پیش نہیں ہو گی، جب میں ایک فوج کے ساتھ چڑھائی کر رہا ہوں گا جو اس علاقے میں میری اپنی تشکیل کی ہوئی ہو گی۔ مختلف قسم کی معلومات جو میں بہم پہنچا چکا ہوں شاید اتنی مکمل نہ ہوں پھر بھی ان کے ذریعے سے میں مہاراجہ کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتا ہوں۔ جب تمام ضروریات میسر ہوں، نقد رقم بھی موجود ہو اور ایک حکمران کی رضامندی بھی حاصل ہو تو ایک آدمی کی کوششیں بھی تہذیب انسانی کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے میں بار آور ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب تصور میں میری ماں کی شکل سامنے آئی کہ ضعیفی کے عالم میں کس طرح میری واپسی کی امید لگائے میری راہ تک رہی ہو گی، تو وہ اس منصوبے میں پوری طرح حائل ہو گئی۔ اس لیے میں نے دوبارہ شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی کہا مکہ مہاراجہ صاحب کو یقین دلا دیں کہ شدید مجبوری کے سوا ایسی پیشکش کو میں کیسے قبول کرنے سے باز رہ سکتا تھا۔ اب مجھے فقیر صاحب نے مجھے بتایا کہ ''آپ کے کل کے جوابات سے آپ کی فراست کے متعلق مہاراجہ نے نہایت اعلیٰ رائے قائم کی ہے اور میرے ذمے یہ بات لگائی ہے کہ آپ سے ان کی صحت کے متعلق مشورہ کروں۔''

میں نے کہا ''پھر اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کیا فخر کی بات ہوسکتی ہے۔ اگرچہ میں کوئی ڈاکٹر نہیں لیکن اکثر ذہین یورپینوں کی طرح میں نے علم ڈاکٹری پر گاہے بگاہے توجہ دی ہے۔''

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، مہاراجہ ایک قسم کے فالج میں مبتلا تھا۔ اس کی عام ہیئت کذائی سے سے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی جسمانی کمزوری کا نتیجہ نہیں بلکہ کسی عارضی صحت کی خرابی کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ میں نے فقیر صاحب سے اپنی رائے کا اظہار کیا اور (بیماری کے) حملے سے پیشتر اس کی صحت کا حال دریافت کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ برسات کا موسم شروع ہونے سے پہلے ایک دن بڑی گرمی اور حبس تھا۔ گزشتہ سال برسات سے پیشتر غیر معمولی طور پر گرمی بڑی شدید تھی۔ مہاراجہ صاحب سارے کا سارا دن ہی گھوڑے کی پشت پر سوار رہے۔ اس طرح تھک کر چور اور گرمی سے بے حال ہو گئے۔ خوراک کے سلسلے میں ان کی طبیعت عموماً بے پروا ہے۔ اس دن انہوں نے اور تو کچھ نہ کھایا البتہ انہیں تربوز مل گئے جس پر دل کھول کر ہاتھ صاف کیا۔ سہ پہر کے وقت سخت طوفان آ گیا، موسلا دھار بارش ہوئی اور کشمیر کے پہاڑوں سے تیز وتند ہوا چلنے لگی، جس سے درجہ حرارت میں تکلیف دہ حد تک خنکی پیدا ہو گئی۔ مہاراجہ صاحب اس طوفان میں دیر تک قدم قدم کی چال سواری کرتے رہے یہاں تک کہ ایک جھونپڑی میں پہنچے۔ البتہ یہاں بھی دیواریں انہیں شدید ہوا سے خاطر خواہ طور پر پناہ نہ دے سکیں۔ اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں ہی میں وہاں بیٹھے رہے اور ہوا کے جھونکے تھے کہ جسم میں سرایت کر رہے تھے۔ اس کا لازمی اثر تھا کہ تمام بدن ٹھٹھر گیا۔ رات ہونے سے پہلے وہ اپنے خیمے تک بھی نہ پہنچ سکے۔ پھر کسی قسم کی ترغیب انہیں دوائی کھانے یا اور کسی قسم کے علاج پر بھی مائل نہ کر سکی۔ اب معدے میں شدید درد وقفے وقفے کے بعد پیدا ہونے لگا جس سے نیند میں بھی سخت بے چینی رہی۔ اور جب وہ کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہتے تو منہ میں زبان کو بڑا گراں محسوس کرتے اور بائیں ہاتھ کی طاقت تو بالکل سلب ہو گئی تھی۔ جب ایک خدمتگار پہنچا اور انہیں اس حالت میں دیکھا تو اس نے فوراً عزیز الدین صاحب کو اطلاع دی جنہوں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر کافی تناؤ نمودار ہو گیا ہے اور زبان بند ہونے کی وجہ سے حالت خراب ہو چکی ہے۔ میں تو نہ سمجھ سکا کہ انہوں نے کیا طریقہ علاج استعمال کیا لیکن غالباً ہندو رواج کے مطابق مشک کی زیادہ مقدار میں خوراکیں دی ہوں گی۔ انہیں اٹھا کر لاہور لے آئے۔ حالت کچھ بہتر

ہوگئی۔ ڈاکٹر میگر یکر کولدھیانے سے بلوالیا گیا اور اس کے زیر نگرانی علاج ہونے لگا۔ اب وہ گھوڑے پر سواری کر لیتے ہیں لیکن ہلنے جلنے سے تکلیف محسوس ہوتی ہے اور لکنت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی آنکھ کو بھی ضرر پہنچا ہے اور اب تک صحیح حالت پر نہیں آئی۔ کوئی ناواقف تو دیکھ کر ہی اندازہ لگائے گا کہ بینائی بالکل جاتی رہی ہے۔ اگر انہیں کسی چیز کا مشاہدہ کرنا ہوتا ہے تو اسے آنکھ سے دو انچ کے قریب تر لے آتے ہیں لیکن آٹھ یا دس قدم کے فاصلے پر وہ چہرے کے آثار سے آدمی کے خیالات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔'' اس سارے بیان سے میری رائے کو اور تقویت پہنچی کہ اس تکلیف نے ابھی گہری جڑیں نہیں پکڑیں جیسا کہ اس قسم کے مریضوں میں اکثر ہو جاتا ہے۔ عزیز الدین صاحب کی فرمائش تھی کہ میں مہاراجہ کے لیے کوئی نسخہ تجویز کر دوں۔ جب میں نے دریافت کیا کہ خورد ونوش کے سلسلے میں ان کا معمول کیا ہے تو معلوم ہوا کہ وہ صحت کے لیے نہایت مضر ہے کیونکہ جو کچھ کھاتے ہیں وہ تو سادہ غذا ہے لیکن شراب جس مقدار میں پیتے ہیں وہ تباہ کن ہے۔ پھر جو شراب (برانڈی) اس کے لیے تیار کی جاتی ہے اس کے اجزائے ترکیبی مجھے بتائے کہ اس میں تیز ترین ماء اللحم کی آمیزش ہوتی ہے جو گائے کے گوشت کو چھوڑ کر ہر قسم کے جانوروں کے گوشت سے کشید کیا جاتا ہے اور پھر موتی، جواہرات، مشک، افیون اور کئی قسم کی جڑی بوٹیاں ملا کر ایسی پینے کی چیز تیار کی جاتی ہے جو تندی میں الکحل کے برابر ہوتی ہے، اس شیطانی مشروب کو میں نے بھی ایک شام چکھ کر دیکھا تھا لیکن اگلی صبح میں نے طبیعت میں نہایت کسل محسوس کیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ یہ ''شاہانہ شراب'' جو اسی نام سے یہاں موسوم ہے، بکثرت استعمال کرتا ہے؟ تو مجھے جواب ملا کہ 'ہاں'۔ میں نے کہا کہ ''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شراب نوشی کا یہ سلسلہ تو نہایت خطرناک ہے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ بیماری کے گزشتہ حملے کا سبب بھی یہی ہو۔ کیونکہ وہ سالہا سال سے اس کے پینے کا عادی ہے۔ میری رائے میں اس کا یکلخت چھڑانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ بلکہ احتمال ہے کہ اس کی تمام طاقتیں جواب دے جائیں۔ فقیر صاحب نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر میگر یکر نے تو اس شراب کے استعمال سے بالکل منع کر دیا تھا لیکن جب مہاراجہ نے اس مشورے پر عمل کیا تو کمزوری اتنی زیادہ ہوگئی کہ اس نے پھر اسے پینا شروع کر دیا۔ فقیر صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ ''آپ کے خیال میں کتنی مقدار میں پی لیا کریں کہ ان کی صحت کے لیے مضر نہ

ہو؟'' جواباً میں نے معذوری ظاہر کی کہ میں اس کی مقدار متعین نہیں کر سکتا۔ میرے اپنے لیے تو ایک پیانہ بھی بہت تند ثابت ہوا تھا۔ لیکن چونکہ مہاراجہ زیادہ مقدار میں پینے کا عادی ہو چکا ہے اس لیے شروع شروع میں تو بس اتنی ہی مناسب ہو گی کہ جس قدر کم پی جائے اتنی ہی بہتر ہے۔

رنجیت سنگھ کی خواہش تھی کہ ان ادویات میں سے جن کا میں نے ذکر کیا تھا اور جو میں استعمال کرتا رہا ہوں اسے بھی کچھ حصہ مل جائے کیونکہ میں خواہ کچھ کہوں، وہ ضرور حیات بخش ہوں گی ورنہ میں ایسا نادان تو نہ تھا کہ اپنی ہستی کو محض تجسس کی خاطر اس طرح خطرے میں ڈالتا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ رنجیت سنگھ یا فقیر صاحب کو اس کا قائل کرنا کہ میرے پاس آبِ حیات قسم کی کوئی چیز نہیں، میرے بس کی بات نہیں، اس لیے میں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی ادویات کا ذخیرہ اپنے ملازمین کے ساتھ لدھیانے بھیج دیا ہے۔ صرف چند ایک گولیاں میرے پاس رہ گئی ہیں لیکن وہاں سے میں وہ ادویات منگوا سکتا ہوں۔ اس دوران میں جو تھوڑا سا ذخیرہ موجود ہے وہ مہاراجہ صاحب کے خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے سربمہر محفوظ خوراک کی فرمائش کی لیکن اس میں سے میرے پاس کچھ بھی نہ بچا تھا۔ میں نے باقی ماندہ نصف درجن بلو پلز (نیلی گولیاں) جو میرے پاس موجود تھیں اور مسٹر وائنے نے جو کیلومل کا ایک پیکٹ مجھے دیا تھا، اسے دے دیا۔ ان کی خوراک کی مقدار بھی واضح طور پر بتا دی۔

فقیر صاحب نے مجھے بتایا کہ مہاراجہ نے معائنے کے لیے آج کا دن مقرر کیا ہے۔ احکام صادر ہو چکے ہیں۔ اسے امید ہے کہ آپ بھی تشریف لائیں گے۔ دوپہر کے وقت توپخانے کی سلامتی سے پتہ چل جائے گا کہ مہاراجہ محل سے روانہ ہو گیا ہے۔ اور خلیفہ کو آپ کے لانے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔ میں نے فقیر صاحب کو کہہ دیا کہ میں ان کے بھائی کی معیت میں جانے کو تیار رہوں گا۔ پھر انہوں نے اجازت چاہی اور رخصت ہوتے ہوئے خوب شکریہ ادا کیا۔

بارہ بجے سے بہت پہلے فقیر صاحب آ پہنچے۔ تین ہاتھی، دو قیمتی ساز و سامان سے آراستہ گھوڑے، پالکیاں وغیرہ ان کے ساتھ تھیں۔ میں نے تو ہاتھی پر سوار ہونے کو ترجیح دی کیونکہ گھوڑے یا پالکی کی سواری میں چالیس یا پچاس گھڑ سوار جو ہمراہ تھے وہ جو گرد و غبار اڑاتے

میرے لیے نا قابل برداشت ہوتا، جنرل ونٹیورا گھوڑے پر سوار تھے اور جونہی کہ سلامی کی توپیں سر کی گئیں مسٹر میکے سن اور میں ایک ہی ہودے میں سوار ہو گئے۔ مسٹر وائنے دوسرے ہودے میں تھا۔ یہاں سے ہم شہر کی بیرونی فصیلوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور اس شاندار عمارت کے پاس سے گزرے جو کبھی جہانگیر کی مسجد ہوا کرتی تھی۔ دھوپ کی تمازت اور بہار کی آمد آمد سے وہ علاقہ نہایت سحر آفریں منظر پیش کر رہا تھا۔ ہندوستانی نباتات کی روئیدگی کا بالکل آغاز ہی تھا جس کی بے نظیر سرسبزی نے سارے میدان کو مزین کر دیا تھا۔ یہاں درخت یورپین مذاق کے مطابق تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگائے گئے تھے اور فی الوقت ان کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ ان کے علاوہ تفریح کے لیے مکان بنے ہوئے تھے جن کا سلسلہ راوی کے کناروں تک چلا گیا تھا۔ یہ تمام چیزیں مل کر منظر میں نہایت حسین بوقلمونی پیدا کر رہی تھیں۔ قرب وجوار کا علاقہ نہروں کے ذریعے منقسم تھا اس لیے کسی ایک جگہ بہت بڑی جمعیت کا اکٹھا ہونا خارج از امکان تھا۔ اس وقت جو نظارہ میرے پیش نظر تھا نہایت ذوق برق، شاندار اور اتنا اثر آفریں تھا کہ مجھے اپنی زندگی میں اس قسم کی نمائش دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں جیتے جاگتے کرداروں کے انداز بیان کروں، میں اجازت چاہتا ہوں کہ ان بے جان عناصر کا چند الفاظ میں ذکر کرلوں۔ پہلے جب ہم شہر کے قریب پہنچے تو ہمارے پیش نظر وہ خوبصورت عمارتیں تھیں جو جہانگیر نے تعمیر کرائی تھیں۔ یہ شہنشاہ بانو کی موسم سرما کی اقامت گاہ تھی جہاں رنگا رنگ آرائشوں کی وہ فراوانی پائی جاتی ہے جو اس مرد کی دریا دلی کی مظہر ہے جو صرف ارادہ ہی نہیں کر چھوڑتا بلکہ عملاً اپنی محبوبہ پر واضح کر سکتا ہے کہ اس کا عشق یہاں تک کامل ہے کہ دنیا کے تمام خزانے اس میں سما جائیں، جہانگیر نے یہ شاندار محل اس لیے تعمیر کرایا تھا کہ نور جہاں کو بڑا شوق تھا کہ لاہور میں قیام کرے۔ اس کی دیواریں زیادہ تر سنگ مرمر کی تھیں اور مختلف عمارتیں اس انداز میں ایک دوسرے سے سر بلند تھیں کہ درمیانی احاطہ ایک وسیع تماشا گاہ کا منظر پیش کرتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ان میں کئی اور عمارتوں کا اضافہ تو ضرور کیا ہے جو اپنے غیر معمولی ہونے میں یا ان پر گرانقدر رقم صرف کرنے میں تو کسی طرح کم نہیں لیکن ان میں بدذوقی نمایاں ہے۔ ان جدید وقتوں کی بے ربط سی عمارتوں کا اگر ان محلات سے موازنہ کیا جائے تو ہم پر اس کا پس منظر عیاں ہو جائے گا کہ یہ سب اس شخص کی پسند کے مطابق ہیں جو کسی ذوق کی تربیت کے بغیر،

یک لخت ملک پر قابض ہو گیا ہو۔ مغرب کی جانب جو عمارتوں کے سامنے کے حصوں کا منظر تھا جن پر اس ساعت سورج کی روشنی پڑ رہی تھی جس کے ساتھ گہرے سایوں کی آمیزش بھی تھی۔ اس سے یہ منظر ایسا کمال دل آویز اور تصویر اتارنے کے لائق بن گیا تھا جیسا کہ تصویر میں لانا ممکن ہے۔ مسٹر وائنے تو اس پر بالکل مفتون ہو گیا۔ میں نے بھی اسے تاکید کی کہ جب تک لاہور میں ہمارا قیام ہے کوئی دن خالی گزرنے نہ پائے کہ تم اس شاندار تصویر کا کوئی نہ کوئی حصہ کاغذ پر نہ بنالو، کیونکہ اس کی تکمیل کے لیے کئی روز درکار ہوں گے۔

اس اثناء میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں معائنے کی تقریب منعقد ہو رہی تھی، پیدل فوج کی کئی رجمنٹیں صف آرا کی گئی تھیں۔ ان کے دائیں بازو پر سے اس نے تصور جما رکھا تھا، آہستہ آہستہ زائل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میرے اس سفر کی غرض و غایت محض اس کی ذات تھی اور اگرچہ میرا مدعا اس کی ملازمت اختیار کرنے کا نہ بھی ہو تو بھی میں کوئی خاص مقصد لے کر پہنچا تھا، خواہ وہ کوئی ظاہر بات ہو یا پراسرار قسم کا معاملہ۔ میں عموماً مسٹر میکے سن کی پرخلوص پیشکش سے فائدہ اٹھاتا اور اسے اپنا ترجمان بنالیتا۔ اس نے ضرور مہاراجہ کو یقین دلا دیا ہوگا کہ میرا کوئی مخدوش منصوبہ نہیں۔ ہندوستان یا انگریزی مقبوضات کے متعلق بمشکل ہی کوئی ذکر آیا ہوگا۔ زیادہ تر تو مہاراجہ اپنے ملک، اپنی فوج اور اپنی ملازمت میں یورپین افسروں کے متعلق میری رائے معلوم کرتا رہا، یا پھر غیر ملکوں کے منصوبوں کے متعلق پوچھتا رہا اور ان دور دراز ملکوں کے منصوبے دریافت کرتا رہا جن کا اس نے پہلے کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ میرے ذاتی حالات کی نسبت بھی بڑے انوکھے سوالات پوچھنے میں بھی کوئی کمی نہ کی، مثلاً استفسار کیا کہ آپ راجہ ذات کے ہیں یا وزیر ذات کے۔ ہر سوال کے نہایت مختصر الفاظ سے اندازہ لگایا کہ اس کے دماغ کو مسلسل لقموں کی ضرورت ہے۔ اسے کسی مسئلے کی تفصیلات سے سروکار نہیں تھا۔ اسے تو صرف سوال کے جواب کی ضرورت تھی۔ اسی جذبے کے مطابق میں بھی اپنے جوابات ڈھال لیتا، اور چونکہ وہ جوابات پہلے ہی میرے پاس تیار تھے میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ان کے زبان پر لانے میں ایک لمحہ بھی دیر نہ ہونے پائے۔ مختصر فقروں اور فوری جواب کی ایسے موقعوں پر خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے جب ترجمان کا وسیلہ اختیار کیا جائے تاکہ گفتگو ناقابل برداشت حد تک اکتا دینے والی نہ ہو جائے۔ آخر کار اس نے پوچھا کہ آیا آپ قریب سے

گھوڑوں کا ملاحظہ کرنا پسند کریں گے۔اور جب میں نے بھی اس کی فرمائش کی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا، ہاتھ میں میرا ہاتھ لیا اور چل کر شامیانے کے باہر پہنچ گیا، اور حکم دیا کہ سب کو باری باری پیش کیا جائے۔ان کی ذہنوں میں سے ایک کا مٹھا میرے لیے خاص طور پر قابل دید تھا۔اس پر مجھے ایک لعل نظر آیا جو دو انچ مربع تھا اور اس پر جہانگیر کا نام کندہ تھا۔ ڈاؤ (Dow) اپنی تاریخ ہندوستان میں بیان کرتا ہے کہ جب جہانگیر نے اپنا نام اس قیمتی پتھر پر کندہ کرایا تو مشہور عالم شہنشاہ بانو نور جہاں کہنے لگی کہ میرے لیے تو یہ باعث تاسف ہے۔اس پر اس نے جواب دیا: ''کسی تاریخی نوشتہ کی بجائے یہ لعل میرا نام آنے والی نسلوں تک بہتر طور پر پہنچائے گا۔'' تیموریہ خاندان کو زوال بھی آ جائے پھر بھی جب تک کوئی بادشاہ موجود رہے گا اس لعل کی قدر و قیمت بحال رہے گی۔ فی الوقت اس پر کئی اور نام بھی کندہ کیے جا چکے ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور احمد شاہ کا ہے جسے یہ مشہور تخت طاؤس پر نصب ملا تھا۔اس مور کی شکل کے تخت کو شاہجہان نے ۱۶۳۵ء میں آگرے میں بنوایا تھا۔ یہ ہیرا تیمور سے سن ۱۳۹۸ء میں دہلی میں چرا لیا گیا تھا اور جہانگیر نے اسے پھر سے خرید لیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے مجھے بتایا کہ پستولوں کا ایک شاندار جوڑا اسے لارڈ ایمہرسٹ سے ملا تھا۔اس نے خواہش کی کہ اسے پیش کیا جائے۔اس کے آدمیوں نے مختلف اسلحہ کے تھیلوں میں اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ نہ ملا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک گھوڑے کا نام لیا جہاں سے آخر کار وہ مل گیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا حافظہ کتنا تیز ہے اور اصطبل کے انتظامات کتنے ناقص ہیں۔ پستولوں پر سونے سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے جن میں فضول قسم کے ہیرے جڑے ہوئے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ ان پر بڑا نازاں ہے کہ یہ اسے تحفے کے طور پر لارڈ ایمہرسٹ سے ملے ہیں۔وہ مجھے کہنے لگا کہ ''جب آپ وطن پہنچیں تو اپنے ملک سے مجھے پستولوں کا ایک جوڑا بھیجنا۔'' اس کا میں نے وعدہ کر لیا اور اگر خدا کو منظور ا ہوا تو میں اسے بھولوں گا نہیں۔ جب ہم واپس شامیانے میں پہنچے تو میں نے اسے بتایا کہ اس کے گھوڑوں میں سے سب سے زیادہ مشہور گھوڑا تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔اور جب اس نے پوچھا کہ وہ کونسا ہے تو میں نے لیلیٰ کا نام لے دیا جس کی وجہ سے وہ یورپ میں ویسا ہی مشہور ہے جیسا کہ اپنی وسیع سلطنت کی وجہ سے۔اس نے وعدہ کیا کہ وہ کل دکھا دیا جائے گا۔ جب ہم واپس آ کر بیٹھ گئے تو اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا: ''مجھے یقین ہے

کہ آپ مشہور ہیرا دیکھنے کی خواہش رکھتے ہوں گے، کیا ابھی آپ کو دکھا جائے گا؟'' اس کے آدمی چار ڈھالیں لے آئے تھے جن پر نہایت اعلیٰ منتخب ہیرے جواہرات ٹکے ہوئے تھے، لیکن مشہور کوہ نور یعنی روشنی کا پہاڑ سب سے بڑھ کر میری طرف سے تعریف و توصیف کا مرکز بن گیا۔ یہ شکل اور حجم میں مرغی کے انڈے کے برابر ہے، کمال سفید اور ایسا چمکدار کہ نا قابل بیان ہے۔ یہ ایک بازو بند پر جڑا ہوا ہے جس کے دونوں پہلوؤں میں ایک ایک ہیرا لگا ہوا ہے۔ مہاراجہ نے مجھے بتایا کہ ان کے لیے مجھے امرتسر کے مقام پر بالترتیب ایک لاکھ تیس ہزار اور ایک لاکھ روپے ادا کرنے پڑے تھے۔ یہ دونوں شاہ شجاع کے قبضے میں تھے۔ کوہ نور کی تاریخ تو بیان کے قابل ہے کیونکہ اس سے رنجیت سنگھ کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ اس سے کوئی فائدہ مترتب نہ ہو پھر بھی کم از کم ایسی حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ اس پر چند کلمات تحریر کرنے مناسب ہوں گے خصوصاً کتاب کے اس باب میں جو اس کے ذکر کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ رنجیت نے یہ خزینہ میرے ہاتھوں میں دے دیا تا کہ میں اسے زیادہ قریب سے بغور مشاہدہ کر سکوں۔ مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس ایک ہیرے کی قیمت کا جو تخمینہ لگایا جاتا ہے اس رقم سے کتنے ہزار غریب گھرانوں کی خوشی کے سامان پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ یکلخت مجھے یہ ایسی چیز نظر آئی جس کی وقعت اس خاکی زمین کی قیمت سے کہیں زیادہ ہو۔ یہ وسیلہ راحت ہے لیکن اس کی برکتیں تو اس سے جدائی اختیار کرنے پر مضمر ہیں اور پھر جب یہ دوسرے ہاتھوں میں پہنچے گا تو ایک بے جان سرمایہ ہوگا، اس کا وجود تو اس وقت قیمتی ثابت ہو سکتا ہے جب یہ بنک کے نوٹ یا تبادلے کی ہنڈی کی مانند ایک کاروباری سے دوسرے کے پاس چلتا رہے۔ شاید یہ اچھی بات ہے کیونکہ ہر زمانے کے بادشاہوں نے خزانے جمع کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ یہ قیمتی پتھر اکٹھے کرتے رہے ہیں بجائے اس کے کہ سونے کرتے، کیونکہ سونے کی رواجی قسم سے اس کی قیمت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس خیال کے مطابق میں نے دونوں کا موازنہ کیا۔ جواہرات کی صحیح قیمت متعین کرنے کے لیے تو قدر شناس اور شوقین شخص کی ضرورت ہے جب کہ سونا جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ایک ذاتی قیمت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اپنی اپنی قیمت میں وہی مناسب رکھتے ہیں جو 'غیر معمولی ذہانت' اور 'عام سمجھ بوجھ' میں ہے۔ اب کتنے کم لوگ ہیں جو کہ اول الذکر کا اندازہ لگا سکتے ہیں حالانکہ موخر الذکر کی پہچان ہر کسی کو ہے۔

جب میں اتنی دیر تک اس کے خزینے کا بغور معائنہ کرتا رہا تو رنجیت سنگھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ میں جس خواب وخیال میں محو تھا اس سے ہوشیار کرتے ہوئے اس نے پوچھا کہ "آپ کو یہ کیسے پسند آئے ہیں؟" اس کے بعد وہ ایک ایک پتھر کی طرف خاص طور پر اشارہ کر کے ان کی سرگذشت سناتا رہا اور اس بڑے ہیرے کا تذکرہ سنایا جو مذکورہ بالا دہلی کے تخت طاؤس میں ایک طوطے کا جسم بنا ہوا تھا۔

اب تیس ہاتھی زرق برق لباس میں ملبوس ہمارے پاس سے گزرنے لگے۔ ان میں سب سے عظیم جو بے تحاشا بھاری بھرکم تھا اور جس کا نام 'سدار رجی' رکھا گیا ہے حال ہی میں نیپال کے بادشاہ نے رنجیت کو بھیجا ہے اور اسے مزین کرنے کے لیے اس پر شاندار سنہری ہودا کسا ہوا تھا جس کے گدے ارغوانی رنگ کی مخمل کے تھے۔ سرخ مخمل کا زین پوش نیچے گھٹنوں تک لٹک رہا تھا جس کے حاشیے اور جھالریں مطلا تھیں۔ اس کے طویل دانتوں کے اگلے سرے کٹے ہوئے تھے جیسے کہ تمام پالتو ہاتھیوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ان سروں پر سونا چاندی کے خول چڑھائے ہوئے تھے جن کو ایک سونے کی زنجیر سے ملایا گیا تھا۔ اس کے تختوں پر سونے کے وزنی کڑے تھے جیسے کہ ہندو پہنتے ہیں۔ ان کی ساخت بڑی عجیب تھی۔ اس ہاتھی کے زیورات کی قیمت مہاراجہ کے بیان کے مطابق ایک لاکھ تیس ہزار روپے یا (فلورن) تھی۔ یہ حیوان بالکل سیاہ تھا صرف چہرے اور سونڈ پر مختلف رنگوں کے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ شومئ قسمت سے اس کا سلسلہ نسبت گھٹیا ہے۔ یہ اپنا سر اٹھا کر نہیں چلتا۔ بجائے اس کے کہ ان نفیس تکلفات پر وہ کچھ فخر محسوس کرے اور ان زنجیروں سے کھیلے، اس کی چال ڈھال ایک رذیل آدمی کی مانند ہے جسے درباری لباس میں سجا کر پیش کیا جائے۔

مہاراجہ نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس ایک سو ہاتھی ہیں اور یہ وہ تعداد ہے جو گورنر جنرل کی سواری میں ہوتی ہے جب وہ سفر کرتا ہے۔ ایک ہزار راس گھوڑے اس کے ذاتی استعمال کے لیے ہیں، ۲۷۰۰ اس کی پیدل فوج کے لیے، اس کے مسلح دستوں کے لیے ۱۵۰۰۰ اور رسالے میں ۲۷۰۰۰ گھوڑے ہیں۔ یہ خدشہ محسوس کرتے ہوئے کہ شاید میں سمجھ نہ سکا ہوں گا اس نے یہ تذکرہ دہرایا جو بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بالکل درست تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے کہا کہ "میرا خیال ہے آپ میرے کچھ بہترین خیمے بھی دیکھنا پسند کریں گے" اور اس نے حکم دیا

کہ انہیں نصب کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی خواہش کے مطابق میں ان کا معائنہ کرنے لگا جبکہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ ان میں سے بعض تو کشمیری اون کے بنے ہوئے تھے، کچھ کسی اور چیز کے تھے جن میں چاندی کے تار بٹے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک کا جو مشاہدہ کیا تو دیکھا کہ اس کے کنارے موتیوں کے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی خاص بڑا نہ تھا دری کی جگہ ہر ایک میں کشمیری شال بچھائی گئی تھی۔ جب میں معائنے کے بعد واپس آیا تو ہماری سواری کے لیے گھوڑے آ گئے تا کہ ان پر چڑھ کر فوجی دستوں کو اچھی طرح دیکھا جا سکے۔ ان میں سے ایک کا زین اتنا قیمتی تھا کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن ایک یورپین کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ رنجیت سنگھ جھٹ سے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اس کی ڈھال اس کی پشت پر تھی اور اس کی ہیئت بالکل ایک عام سکھ کی سی تھی۔ اپنی پگڑی کا نچلا حصہ ٹھوڑی پر اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ جس اثناء میں ہم فوجی دستوں کی طرف سوار ہو کر جا رہے تھے تو ہمیں ایک نہایت وحشیانہ اور بے سرے، کہنے کو موسیقی کے بینڈ نے سلامی پیش کی۔ ہر سازندہ اپنے ساز کو اتنی بلند آواز سے بجا رہا تھا جتنا کہ ممکن تھا لیکن کسی دو کی سر تال میں ہم آہنگی نہ تھی۔ یہ میرے کانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ڈھولوں کی آواز بلند آہنگی میں ان تمام سازوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ ان کے سامنے جا کر مہاراجہ براجمان ہو گئے۔

ایسا خوفناک شور سننے کا اتفاق مجھے اس سی پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ طبیعت جو اس پر بے ساختہ ہنسنے پر مائل تھی سر پر قابو پانا بھی میرے لیے سخت مشکل تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں کھڑے رہنا بھی محض حماقت معلوم ہوتا تھا۔ ورنہ چاہیے تو یہی تھا کہ کانوں پہ ہاتھ دھر کے فوراً بھاگ جاتا۔ لیکن جہاں تک ممکن تھا میں نے اپنے جذبات کو دبائے رکھا اور اپنے سامنے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ مہاراجہ نے اشارہ کیا اور یہ دنیا سے انوکھا غل غپاڑا ختم ہوا۔ تب اس نے میری جانب توجہ کی اس کے خدوخال صاف کہہ رہے تھے کہ ''یہ دیکھا! مجھے یقین تھا کہ آپ کو کبھی اس کی توقع نہ ہو گی۔ آپ کو تو کبھی خیال بھی نہ آیا ہو گا کہ ہم لوگ یورپینی ہم آہنگی میں کتنی مہارت رکھتے ہیں۔'' پھر اس نے دریافت کیا کہ ''آپ کی اس موسیقی کے متعلق کیا رائے ہے؟'' اور جیسے کہ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں، میں نے کہہ دیا کہ ''اتنی اچھی ہے کہ حیران رہ گیا ہوں۔''

جب ہم فوجی صفوں سے گزرے تو جوانوں نے اسلحہ سے سلامی دی اور کمانڈنگ آفیسر

نے اپنی تلوار نیچے گرادی۔ مہاراجہ نے سلطان محمد خاں کے متعلق دریافت کیا۔ اس کے جلیسوں میں سے ایک نے بتایا کہ وہ کچھ دیر تو یہیں انتظار کرتا رہا ہے۔ اسی وقت وہ اپنے بیٹے کو لے کر پیدل آ گیا۔ میرے ساتھ اس کا تعارف اس طرح کرایا گیا:

''یہ سلطان محمد خان ہے، پشاور کا سردار اور دوست محمد خان کا بھائی۔ موجودہ وقت میں میں نے اسے تیس لاکھ کی جاگیر دے رکھی ہے۔'' سلطان محمد خان کی عمر اس وقت چھتیس سال ہو گی۔ اس نے کابلی طرز کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے لمبے لمبے کپڑے زربفت کے تھے اور ایک زرد شال بطور دستار سر پر لپیٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک لفظ زبان پر لائے بغیر بہت جھک کر تسلیمات بجالایا اور اس طرح ہمارا تعارف ختم ہو گیا۔ سلطان محمد خان، فتح خان کے پچاس بھائیوں میں سے ایک ہے۔ فتح خان محمد شاہ کا وزیر تھا جس نے اپنے آقا کے لیے کابل کی سلطنت فتح کی تھی جس پر محمد شاہ کا بھائی شاہ شجاع قابض ہو گیا۔ البتہ محمد شاہ نے فتح خان کو قتل کرادیا اور اس طرح اپنے تخت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ فتح خان کے بھائیوں نے فی الفور بغاوت کر دی اور وہ ملک کے ہر حصے میں پھیل گئے۔ ان سب میں سے طاقتور دوست محمد خان ہے جو اس وقت کابل میں رہتا ہے۔ ان میں سے دو بھائیوں نے رنجیت سنگھ کی طاقت کی آزمائش کر لی ہے یعنی جبار خان نے کشمیر پر اپنا تصرف جمالیا تھا اور یار محمد خان نے پشاور پر۔ پہلے کو تو ملک چھوڑ کر جانا پڑا کیونکہ اس نے مسلح تصادم کی راہ اختیار کی تھی اور دوسرا چونکہ وہ اپنے ہم مذہبوں یعنی یوسف زئی کے منہ زور قبیلے کے خلاف، جو پشاور کے شمالی پہاڑوں میں رہتے تھے، اپنے دفاع کے قابل نہ تھا، رنجیت سنگھ سے شرائط طے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس طرح ان دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے سکھوں کی اطاعت قبول کر لی۔ جب یار محمد خان فوت ہوا، اس وقت ونٹیورا پشاور میں تھا، جہاں وہ اس گھوڑے کی وصولی کے لیے پہنچا تھا جو رنجیت سنگھ کو مطلق العنان حاکم تسلیم کرنے کے بعد بطور خراج پیش کیا جانا تھا۔ یہاں اس نے مہاراجہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے متوفی کے بھائی سلطان محمد خان کو پشاور کا قبضہ دلا دیا۔ لیکن جلد ہی وہاں ہنگامے شروع ہو گئے اور سلطان محمد خان ان کی حمایت میں تھا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ وہ اپنی پشاور سے دست برداری کے عوض میں رنجیت سنگھ سے کچھ معاوضہ وصول کر لے۔ حقیقت یہ ہے کہ پشاور اس کے بڑے بھائی دوست محمد خان کی سرحدوں پر واقع ہے۔ اور گزشتہ لڑائی میں جو رنجیت سنگھ

اور اس کے مابین ہوئی تھی، محاذ جنگ عین پشاور کے گردونواح میں تھا۔ اس طرح سلطان محمد خان کو سخت مشکل صورت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر چہ وہ اس کا بھائی اور مسلمان تھا لیکن وہ رنجیت سنگھ کا حلیف بن کر ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ پشاور میں دستبرداری کے صلے میں جس پر قبضہ تو پہلے ہی کر لیا گیا تھا، سلطان محمد خان کو مسلسل جدوجہد کے بعد ایک علاقہ حاصل ہو گیا جس کے محاصل قریباً تین لاکھ ہوتے ہیں۔ اگر کہیں میرا آنا نہ ہوتا تو شاید اسے کچھ اور انتظار کرنا پڑتا، لیکن آج یہ معاوضہ ادا کر دیا گیا جس کا صاف طور پر یہ مقصد معلوم ہوتا تھا کہ غیر ملکی مہمانوں کے روبرو رنجیت سنگھ کی عظمت اور دریا دلی کا مظاہرہ ہو جائے۔

جب ہم ان فوجی دستوں اور توپخانے کے سامنے جا ٹھہرے تو فوجی مشقیں اور فنی آزمائشیں شروع ہو گئیں۔ توپوں کا سر کرنا بڑا با قاعدہ تھا۔ وہ لوگ ایک منٹ میں پانچ مرتبہ توپوں کو بھرتے اور چلاتے رہے۔ پھر ایک حادثہ پیش آ گیا جو اپنی نوعیت کا ٹھیک قدرت کے موافق تھا۔ ہاتھی جن پر شاہی سواری کے مختلف لوگ سوار تھے توپوں کے سامنے کھڑے تھے۔ جب پہلی مرتبہ گولہ سر ہوا تو انہوں نے بڑی بے چینی کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنی ٹانگیں چوڑی کر کے پھیلا لیں۔ ان کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور خوف زدہ ہو کر وہ بے طرح چنگھاڑنے لگے۔ فوراً ہی باوجودیکہ مہاوتوں نے انہیں چہروں پر ضربیں لگائیں اور انکس کی ہر ضرب سے ان کا خون بھی جاری ہو گیا، وہ بالکل الٹے مڑ گئے اور میدان میں ہر طرف بھاگنے لگے جب کہ ان کی دمیں پھیلی ہوئی تھیں اور سونڈیں پوری اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ خلقت جو وہاں جمع ہو گئی تھی یکلخت بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔

فن حرب کا مظاہرہ بس یونہی سا تھا، زیادہ تر اس میں نمائشی کارتوسوں کی کافی تعداد چلائی گئی۔ اور جب فوجی دستے مارچنگ کرتے ہوئے گزر گئے تو میں نے مہاراجہ سے رخصت چاہی اور مکان پر واپس آ گیا۔ یہ رنگا رنگ نظارہ جو دیکھ کر آیا تھا، طبیعت اس سے بے حد مسرور ہوئی۔ اپنی خاص وضع، زرق برق پوشاکیں اور اس پر قدرتی ماحول کا حسین منظر ایسے عناصر تھے جن کی وجہ سے یہ اپنی قسم کے تمام مظاہروں سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھا جو مجھے اپنی زندگی کے گذشتہ بیس سالوں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

جب میں واپس آیا تو دیکھا کہ ہندوستان سے خطوط آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سفر کے

دوران میں میرے لیے خیر وعافیت کی نیک تمنائیں تھیں۔ ان میں ایک کیپٹن ویڈ کی طرف سے دعوت نامہ تھا۔ اس کی دعوت تھی کہ میں فیروز پور پہنچوں اور وہاں سے اس کی معیت میں لدھیانے کا سفر طے کروں۔ فیروز پور ایک سکھ ریاست میں ستلج کے بائیں کنارے پر واقع ہے لیکن حال ہی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس ریاست کا الحاق کرلیا ہے کیونکہ اس کا سربراہ بغیر کسی صلبی وارث کے مر گیا تھا۔ اس کپتان کو وہاں قبضہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مسٹر میکے سن کو لاہور روانہ کیا گیا تھا تا کہ رنجیت سنگھ کے ساتھ، جو فیروز پور پر اپنے حق ملکیت کا دعویدار تھا، اس سلسلے میں جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان کا تصفیہ کر لے۔ میں اس دعوت کو بخوشی قبول کر لیتا کیونکہ اس طرح مجھے بہت جلد لدھیانے پہنچنے کے وسائل حاصل ہو جاتے لیکن میں گووند گڑھ اور امرتسر دونوں مقاموں کے دیکھنے سے محروم رہ جاتا، کیوں کہ یہ دونوں اس سڑک پر واقع ہیں جو لاہور سے سیدھی لدھیانے جاتی ہے۔

سہ پہر کو فقیر خلیفہ صاحب راجہ کا ایک اور پیغام لے کر آ گئے۔ اس نے پہلے تو یہ دریافت کیا کہ کیا معائنے کی تقریب سے مجھے تھکاوٹ تو نہیں ہوگئی۔ اس کا میں نے یہ جواب دیا کہ گزشتہ پانچ سالوں نے مجھے کافی حد تک سخت جان بنا دیا ہے اور میں ہر تھکاوٹ برداشت کر سکتا ہوں۔ بلکہ رنجیت سنگھ کے دربار کی شان وشوکت نے مجھے اتنا متاثر کیا ہے کہ حیران ہو گیا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ "مہاراجہ نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ سے فرمائش کروں کہ اس دوائی میں سے جو آپ ہمیشہ ساتھ لیے پھرتے ہیں، کچھ عطا کر دیں بشرطیکہ آپ کی یہ نوازش آپ پر بہت زیادہ گراں نہ گزرے۔ اسے معلوم ہوا ہے کہ جو سفوف کل بھیجا گیا تھا، وہ مسٹر وائینے نے دیا تھا اور آپ نے نہیں دیا تھا۔" جواباً میں نے وعدہ کیا کہ جونہی میں واپس لدھیانے پہنچوں گا، اس کی کچھ مقدار بھیج دوں گا۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ مہاراجہ نے گولیوں کی ایک خوراک اپنے افسروں میں سے ایک کو کل صبح کھلا دی تھی لیکن ابھی تک اس نے کوئی اثر محسوس نہیں کیا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ دوائی کے تند و تیز نہ ہونے کی وجہ ہے اور شاید اس سے خفیف سا افاقہ محسوس ہو لیکن اگر وہ افسر پہلے ہی تندرست وتنومند ہے تو پھر شاید وہ اس تبدیلی کو محسوس ہی نہ کرے جو اس کے اثر سے پیدا ہوگی۔

یہ ذکر کرنا تو میں چھوڑ ہی گیا کہ صبح کے وقت رنجیت سنگھ نے اپنی جسمانی حالت کے متعلق مجھ سے مشورہ لیا تھا۔ اسے شکایت تھی کہ اس کے جسم کا دایاں حصہ کمزور ہو گیا ہے۔ اس کی نبض جیسی کہ ایک بوڑھے آدمی کی قدرتی طور پر ہوتی ہے ویسی ہی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ کی جلد تو بے حس نہیں ہو گئی؟ وہ یہ سنتے ہی کہنے لگا کہ 'بس ایسا ہی معاملہ ہے۔' میں نے مشورہ دیا کہ ''کسی تیز سی مرہم کی مالش کرائیں تاکہ قویٰ میں جوش پیدا ہو اور جان پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد اس نے اپنی زبان کی تکلیف بیان کی جس پر اسے پورے طور پر قابو نہ رہا تھا اور جس کی جڑ کو وہ محسوس کرتا تھا کہ لکڑی کی طرح سخت ہو گئی ہے۔ میں نے اسے حوصلہ دلایا اور امید دلائی کہ یہ تو پٹھوں کے سست پڑ جانے کی وجہ سے ہے اور جب اس کے پہلو میں ہیجان پیدا کیا گیا تو اس عارضے کا از خود علاج ہو جائے گا۔

ایک اور بات کا ذکر بھی بیان کر دوں جو اس کے متواضع ہونے کا ثبوت ہے۔ معائنے کی تقریب کے دوران میں ایک رکابی میں اسے ایک درجن کابلی انگور پیش کیے گئے۔ ان کے کھانے کے لیے اس نے مجھ سے اجازت چاہی۔ جس صورت میں وہ سوال ترجمہ کر کے مجھ سے پوچھا گیا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ خوراک کے متعلق یہ میری ہدایت کا نتیجہ ہے کہ مجھ سے اب طبی مشورہ لیا جا رہا ہے۔ اس لیے میں نے جواب دیا کہ میرا خیال نہیں کہ چند انگور کے دانے ضرر کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کون سی بات غلط ہو چکی تھی اور جھٹ سے کہنے لگا ''کمزور صحت والے شخص کو ضرور معذرت کر لینی چاہیے جب بھی وہ کوئی ایسی بات کرے جس سے اسے منع کیا گیا ہو۔''

اپنی پہلی ملاقات کے موقع پر میں کوئی تحفہ ساتھ نہ لے جا سکا، اگرچہ ہر ملاقاتی سے اس قسم کے آداب کی توقع کی جاتی ہے۔ بات یہ تھی کہ مجھے کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس کے متعلق میرا خیال ہوتا کہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جنرل ونٹیورا نے آج مجھے ایک دوربین دی اور میں نے چاندی کی ایک مرصع دوات، جس کا ڈھکنا انڈیا ربڑ کے ذریعے خوب مضبوطی سے بند ہو جاتا تھا، 'بو کے ڈ ورا یو' خوشبو سے پُر کر لی۔ یہ میں اس کے ہاں لے گیا اور مشورہ دیا کہ آخر الذکر سر درد کا اچھا علاج ہے۔ لیکن اول الذکر اس کے لیے فوراً ہی جاذب توجہ ثابت ہوئی، اور اس میں سے اس نے فوجی دستوں کو دیکھا۔ البتہ اس کی آنکھ اس حد تک کمزور ہو چکی تھی کہ

اس کا استعمال اس کے بس کی چیز نہ تھی۔

شام کے وقت ناچنے والیاں پھر آ گئیں۔ان میں ایک تیرہ سالہ لڑکی تھی جس نے اپنے طنزومزاح سے ہمیں کافی حد تک محظوظ کیا۔اس کا تختہ مشق مسٹر فورنی تھا جو اپنی سفید داڑھی کے ساتھ اپنی خچر پاتریوں کی سی ٹوپی پہنے بیٹھا ہوا تھا۔اسے نہ تو ماحول کی کوئی پرواہ تھی اور نہ ہی ان طنزوں کی جو اس کی داڑھی پر کی جارہی تھیں کیونکہ اپنی نظر کی کمزوری کی وجہ سے وہ انہیں پوری طرح سمجھ نہ سکتا تھا۔مہاراجہ کی کچھ اپنی کنچیاں بھی موجود تھیں اور وہ شراب کی بے تحاشا مقدار پی گئیں لیکن کیا مجال جو مخمور ہوئی ہوں۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کہ تیز ترین برانڈی کی بہت مقدار یہ نگل گئیں مگر اس کا اثر بالکل ناپید تھا۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کے معمولات نے ان کے احساسات کو اس حد تک مردہ کر دیا ہے کہ کسی قسم کا جوش یا ہیجان ان میں زندگی کے آثار پیدا نہیں کر سکتا۔

ہفتہ......١٦ جنوری: مہاراجہ نے آج پیغام بھیجا کہ ''اگر آپ لاہور بالکل نہیں ٹھہر سکتے تو امید ہے کہ آپ کم از کم ہولی تک تو ضرور ٹھہریں گے جو فروری کے اواخر میں پڑتی ہے۔اس وقت سلطنت کے سب معززین اپنی پوری شان وشوکت سے لاہور پہنچ جائیں گے۔ہولی ایسا تہوار ہے جو کرشن اوتار کی یاد میں منایا جاتا ہے اور اس میں تمام ذاتوں کے ہندو شرکت کرتے ہیں۔اس میں انتہائی وحشیانہ کھیل اور لہو ولعب کے مشاغل ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھر میں اس کا تذکرہ سن چکا تھا کہ لاہور میں یہ تہوار بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے اور اس لیے مجھے بڑی حسرت تھی کہ میں اس کے دیکھنے سے محروم رہوں گا۔فقیر صاحب دو گھنٹے کے اندر ہی لوٹ کر آ گئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ مہاراجہ کا خیال ہے کہ آپ تہوار دیکھنے کے بہت متمنی ہوں گے، اس لیے وہ ناچنے والی لڑکیوں کو بھیج دیں گے اور سب ضروری چیزیں ان کے پاس ہوں گی۔اس طرح وہ مجھے دکھا دیں گی کہ کن طور طریقوں سے یہ تہوار منایا جاتا ہے۔اس پر میں نے ممنونیت کا اظہار کیا۔اس تقریب کے لیے جنرل ایلارڈ کا باغ مقرر کیا گیا اور ہم سب اس پر رضامند ہو گئے کہ ایک بجے وہاں جمع ہو جائیں گے۔وقت مقررہ پر ہم اس مقام پر پہنچ گئے اور مہاراجہ نے وہاں پہلے ہی سارا سامان بھجوا دیا تھا۔اس میں سنہری اور روپہلی گوٹا کناری بھیجنا بھی فروگزاشت نہ کیا گیا۔

یہ ہندو تہوار جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کرشن کی یاد میں منایا جاتا ہے جس طرح وہ اور اس کی محبوبہ ''سیتا'' اپنے ساتھیوں کے ساتھ رنگ رلیاں منایا کرتے تھے۔ سنگھاڑوں کی خاصی مقدار پکالی جاتی ہے اور انہیں زرد، سبز، سرخ اور نیلے رنگوں میں رنگ کر بڑے بڑے ٹوکروں میں بھر لیا جاتا ہیاور ان میں سنہری اور روپہلی گوٹے کے ٹکڑے ملا دیتے ہیں۔ کئی بڑے بڑے برتن جن میں انہیں رنگوں کا پانی بھرا ہوتا ہے پاس رکھ دیتے ہیں اور پانی پھینکنے کے چھوٹے چھوٹے آلات پاس ہی نصب کر دیتے ہیں۔ شریک ہونے والے سفید کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ تقریب کے آغاز میں ناچنے والی لڑکیاں آ کر بیٹھ جاتی ہیں اور اس ضیافت کی شان میں گیت گانا شروع کر دیتی ہیں۔ پھر رنگین کھانے کے ٹوکرے آگے بڑھاتے ہیں اور نازک نازک بلوریں گیندیں جن میں سنگھاڑے کا میدہ بھرا ہوتا ہے تقسیم کر دی جاتی ہیں۔ انہیں وہ ایک دوسرے کی طرف پھینکنا شروع کرتے ہیں۔ یہ خفیف سی جوٹ سی ٹوٹ جاتی ہیں اور ران کے ندر کی چیز سفید کپڑوں پر بکھر جاتی ہے اور انہیں رنگ دیتی ہے۔ جب یہ بلوریں گیندیں کام آ جاتی ہیں تو رنگ دار کھانے کی باری آتی ہے۔ پہلے تو جتنا انگلیوں میں آئے اتنا لیتے ہیں۔ پھر مٹھیاں بھر بھر کر استعمال کرتے ہیں اور اخیر میں وہ ٹوکروں کے ٹوکرے ایک دوسرے کے سروں پر انڈیلنے لگتے ہیں تا کہ تمام جسم ہی لت پت ہو جائے۔ اس تفریح کا سب سے غلیظ حصہ اس رنگ دار پانی کا ایک دوسرے پر چھڑکنا ہوتا ہے۔ بڑے گھرانوں میں ہولی عموماً زنانے میں کھیلی جاتی ہے اور اس موقعہ پر عورتوں کو اجازت ہوتی ہے کہ بیشک آ جائیں۔ شرابیں پی جاتی ہیں اور یہ رنگ رلیاں ان حدود سے کہیں تجاوز کر جاتی ہیں جو ہمارے یورپین شائستگی کا معیار خیال کرتے ہیں لیکن ہندو لوگ اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

ا۔ کرشن اوتار کی محبوبہ کا نام 'رادھا' ہے۔ 'سیتا' راجہ رامن چندر کی بیوی تھی۔ مہابھارت اور رامائن کے کردار خلط ملط ہو گئے ہیں۔ (م۔ح۔ص)

جنرل ایلارڈ کے باغ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت عمارت ہے جو اس نے خود تعمیر کرائی ہے۔ اس کی ہر دیوار پر عقاب کی شکل اور نپولین کا جھنڈا نمایاں ہے اور کہیں کہیں ان سپاہیوں کی تصویریں ہیں جو اس کے ماتحت خدمات بجالا چکے ہیں۔ اوپر کی منزل میں صرف چند کمرے ہیں جو آئینوں سے مزین ہیں اور انہیں گھر کی مستورات کے استعمال کے لیے الگ کر دیا

گیا ہے۔ بڑی عمارت کے عین سامنے اس کی نوجوان بیٹی کا مقبرہ ہے۔ ایک انوکھی سی لیکن پختہ یادگار ہے جو مسلمانون کے مذاق تعمیر کے مطابق ہے لیکن اسے صلیب کے نشان سے آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ آنجہانی کے باپ کے مذہب کی علامت ہے جبکہ طرز تعمیر ماں کے مذہب کی مظہر ہے۔

شام کے قت تمام ناچنے والیاں جنہوں نے ہولی منانی تھی آ گئیں۔ ان تمام کو ہمیشہ گاڑیوں میں بٹھا کر ادھر ادھر لے جاتے ہیں۔ یہ گاڑیاں ڈھکی ہوئی ہوتی ہین اور انہیں بیل کھینچتے ہیں۔ عموماً یہ مسلح پولیس کے دستے کی حفاظت میں جاتی ہیں کیونکہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ ہیرے جواہرات جن سے یہ لڑکیاں سج دھج کر نکلی ہیں کہیں ڈاکو چھین کر نہ لے جائیں۔ پولیس کو اس خدمت کا نقد معاوضہ مل جاتا ہے۔ ایک یورپین کی نظر میں اس سے بڑھ کر عجیب منظر نہیں ہوسکتا جب وہ ان جلوسوں میں کسی کو آتے ہوئے یا جاتے ہوئے دیکھ پائے۔

اتوار...... ۱۷ جنوری: شالیمار باغ لاہور کا ایک قابل دید مقام ہے۔ اس نام کے تین مشہور باغ ہیں۔ ایک دہلی میں جو اصل ہے جبکہ دوسرے اس کی نقل ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پر ایک کروڑ فلورن خرچ آئے تھے۔ دوسرا لاہور میں ہے جو نور جہاں نے بنوایا تھا۔ اور تیسرا جو سب سے زیادہ مشہور ہے کشمیر میں ہے جو جہانگیر نے لگوایا تھا۔ چونکہ مجھے فراغت کا دن مل گیا، میں نے جنرل ونٹیورا سے درخواست کی کہ مجھے اپنی گاڑی دے جو مجھے وہاں لے جائے۔ میں اس کے برادر نسبتی اور وائنے کی معیت میں روانہ ہوا۔ یہ باغ شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور سڑک ایک پرانی سرائے، محلات اور کھنڈرات میں سے ہو کر گزرتی ہے جو تعداد میں اتنے زیادہ اور پھر اتنے وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں کہ دیکھنے سے ہی یقین آتا ہے۔ یورپ میں کھنڈر دیکھیں تو تعجب اور حیرانی کے احساسات پیدا ہوتے ہیں اور تصورات کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتاہ، اور ہم ماضی پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ان عجیب ہستیوں کا خیال آتا ہے جو ان دیواروں کے اندر آباد تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھنڈرات اتنی اکثریت میں نہیں پائے جاتے اور جہاں کہیں ملتے ہیں تو ان سے ہم ایام رفتہ کی یادوں اور تاریخی روایات میں کھو جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں یہ اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ ہم ہزاروں کے پاس سے گزر جاتے ہیں اور جذبات میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں سے بمشکل ہی کوئی ایسا ہو

گا جس کی تاریخ سے وابستگی نہ ہوگی، ماسوائے ان آثار کے جن کا تعلق مسلمانوں سے قبل زمانے کے ساتھ ہے۔ اور جہاں تک ہندو کھنڈروں کا حال ہے ان کے متعلق نہایت عجیب و غریب روایات کا ذخیرہ بن گیا ہے لیکن ان کی تعداد اور بعض اوقات ان کی حال ہی کی تاریخ تعمیر زائرین کی دلچسپی کا موجب تو ہوسکتی ہیں لیکن ہمارے لیے نہیں۔ اہل لاہور میں سے اب تک کئی لوگ بقید حیات ہوں گے جنہوں نے ان میں سے اکثر عمارتوں کو اس وقت دیکھا ہوگا جب یہ قابل فخر حالت میں تھیں لیکن اب ان کی دیواریں خستہ سے چور ہو کر بے ڈھب سے ڈھیروں کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ یہاں پر دل و دماغ میں اس عظمت رفتہ اور زمانے کی تباہ کاریوں میں سرعت، اور انسان اور اس کے کارناموں کی ایسی بے ثباتی کے خیالات ضرور آتے ہیں جہاں یورپ میں جب ہم کھنڈرات دیکھتے ہیں تو ہم انہیں ایک طاقتور زمانے کی یادگار سمجھتے ہیں جس کا نعم البدل ہمیں زیادہ مہذب اور بہترین چیزوں کی صورت میں مل چکا ہے۔

ان گڈمڈ کھنڈرات میں کچھ مضبوط عمارتیں سربلند ہونا شروع ہوگئیں ہیں۔ ان کی رفعت و وسعت خواہ کتنی ہی ہو لیکن امیں قدرت کی کارفرمائی کا کوئی دخل نہیں۔ ان کی موجودگی کا سبب پختہ اینٹیں ہیں۔ اور جب ہم اس مسالے سے تیار کی ہوئی بے شمار عمارتوں کے کھنڈر یہاں پاتے ہیں تو ان نئی عمارتوں کی یہاں موجودگی کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے۔ ان کے قریب ہی نئے محلات کا ایک جھرمٹ ملتا ہے جو بدترین ذوق کا مظہر ہیں۔ یہ کرپارام کی ملکیت ہیں (وہ سابق گورنر کشمیر سے مختلف شخص تھا)۔ اس ویرانے کے عین درمیان ان کا منظر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی روما کے کلوسیم میں تاش کے پتوں سے گھروندا تیار کر دے۔ لاہور سے چار میل کے فاصلے پر سڑک نور جہاں کی سرائے میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ یہ ایک قلعہ نما عظیم عمارت تھی کہ سارے کا سارا باغ جو طول میں قریباً ڈیڑھ میل اور عرض میں چوتھائی میل ہے ایک عمارت کی شکل میں ہے اور اسے تفریح کا میدان نہ سمجھا جائے۔ اس کے داخلے کا دروازہ جو عمدہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اس کا حسین ترین حصہ ہے لیکن موجودہ وقت میں یہ غریب مالی کے کنبے کے استعمال میں آرہا ہے۔ اس مقام سے باغ کی زمینی سطح نیچی ہوتی چلی جاتی ہے، اور آگے چوتھائی میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑا حوض ہے جو وسعت میں ایک جھیل کے ہم پلہ ہے۔ اس کے قریب کئی عمارتیں بنی ہوتی ہیں جن میں سے بعض حسن ذوق کا مرقع ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ فی الواقع

لوئیس چہار دہم کے زمانے کے تفریحی باغ کا اچھا نمونہ ثابت ہوسکتا ہے۔ شالیمار کی خوب نگاہداشت کی جاتی ہے اور کئی قسم کے نہایت عمدہ پھل خصوصاً سنترہ یہاں باافراط پیدا ہوتے ہیں۔ رنجیت سنگھ اکثر ایک دودن کے لیے یہاں آتا رہتا ہے۔

یہاں کے مالی نے پھلوں کا ایک خوبصورت ٹوکرا میرے قدموں میں لا رکھا۔ میں نے باغ میں ہر طرف گشت کی اور اس طرح عمارت کو چل پھر کر دیکھا۔ میرا ارادہ تھا کہ خوب تیز تیز چلوں کیونکہ ان دنوں کے تساہل سے، جبکہ اس سے پہلے میں متواتر ورزش کا عادی ہو چکا تھا، طبیعت بہت بے چینی محسوس کر رہی تھی، یہاں تک کہ یہ آسودگی میرے لیے تکلیف کا باعث ہو چکی تھی۔

اسی باغ میں نور جہاں جہاں سالانہ میلہ لگوایا کرتی تھی جہاں دیوانہ وار خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ اس ماحول میں جہاں شاہانہ شان وشوکت کا دور دورہ رہ چکا ہے، رنجیت سنگھ نے بھی ایک پھوس کا جھونپڑا بنوا رکھا ہے۔ جب ہم واپس ہوئے تو میں نے خواہش ظاہر کی کہ جنرل ونٹیورا کا باغ بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ سڑک بڑی غضبناک ہے کیونکہ قدیم شہر کے کھنڈرات پر سے ہوکر گزرتی ہے جو موجودہ شہر سے اس جانب، پرانے قلعے سے چار پانچ میل کے فاصلے پر، راوی کے کنارے، نصف دائرے کی شکل میں آباد ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ لاہور اس وقت بھی بہت بڑا شہر ہے لیکن اس پہلے زمانے یہ کم از کم دس گنا وسعت میں پھیلا ہو ہوگا۔ ہم باغ میں پہنچ تو گئے لیکن ذرا مشکل سے کیونکہ ایک سکھ جرنیل کے لیے یہ جگہ ایسی دل آویز تھی کہ اس نے اپنا خیمہ یہاں نصب کرا لیا تھا، اور اس کے گھوڑوں نے جگہ نہ چھوڑی تھی کہ ہم اپنی گاڑی صدر دروازے کے قریب لے جاسکیں۔ اس باغ کا محل وقوع بڑا خوبصورت ہے۔ پہلے حصے میں داخل ہوتے ہی بہت بڑا اور خوبصورت دالان ہے۔ دوسرے حصے میں زنانے کے کمرے بھی خوب ستھرے ہیں۔ جیکوئے مانٹ نے جو اس کا حال تحریر کیا ہے اس میں اس نے تخیل سے بہت زیادہ کام لیتے ہوئے اسے الف لیلہ ولیلہ کا رستانی محل قرار دیا ہے۔

شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ جو ایک میل تک ہماری سواری گئی اور ہم اپنی قیام گاہ سے کوئی زیادہ دور بھی نہ تھے کہ مجھے ایک سیاہ فام فقیر نظر آیا جو اپنی ستار بجاتا ہوا محو رقص تھا اور گووند سنگھ کی تعریف میں گیت گا رہا تھا۔ وہ ایک خوبصورت مقبرے کے سامنے، جس میں وہ رہائش پذیر تھا،

ایک بلند چبوترے پر کھڑا تھا۔اس کے لمبے سیاہ پیراہن کا حاشیہ سرخ تھا۔ایک سیاہ وسفید پٹی، جس پر جوتش کی علامات نمایاں تھیں اس کے دائیں کندھے سے لٹک کر بائیں پہلو تک چلی گئی تھی ،اورایک لمبوتری سی جادوگروں کی ٹوپی نے اس کے بانکپن کی ہیئت کی تکمیل کردی تھی۔اس کے سامعین میں عورتوں نے اس کے گرد حلقہ بنایا ہوا تھا۔ میں اپنی گاڑی سے اتر پڑا تا کہ اس عجیب وغریب منظر کواور قریب ہوکر دیکھ سکوں۔ میں حیران تھا کہ کس خوبی سے وہ ایک نہایت سریلی آواز کی تال پر ناچ رہا ہے۔

گھر واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ فقیر صاحب میرا انتظار کررہے ہیں۔وہ رنجیت سنگھ کی طرف سے ایک فرمائش لے کر آئے تھے کہ میں اس کے لیے نیک نامی کی چٹھی یا سند تحریر کر دوں۔میں ذرا مشکل ہی سے سمجھ سکا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مجھ سے یہ تحریر حاصل کی جائے کہ میں دونوں یعنی مہاراجہ اور کمپنی کو مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں کہ ان کے درمیان جو دوستی ہے وہ بہت مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔اس کے علاوہ جس خوبی سے میرا استقبال کیا گیا ہے میں اس کا اعتراف کروں۔اس اچھوتے خیال پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی اور میں نے فقیر صاحب سے دریافت کیا کہ ایک غیر اہم سا پردیسی جس کا سرکار انگلشیہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں،اس کی سند کا رنجیت سنگھ کے لیے مفید ہونے کا کیا امکان ہوسکتا ہے۔بہرحال میں نے توقف نہ کیا کہ وہ اس فرمائش کا اعادہ کریں اور وعدہ کرلیا کہ کچھ اس قسم کی دستاویز کا خاکہ تیار کر رکھوں گا اور اگلے روز صبح کو جب وہ آئیں گے تو ان کی رائے کے لیے پیش کر دیا جائے گا۔شام کو پھر ہمارے ہاں ناچ تھا۔اس تفریح میں میرے لیے تو کوئی کشش نہ تھی لیکن وہ لوگ ہر اجنبی کے لیے اس قسم کا استقبال ضروری خیال کرتے ہیں۔

مسٹر میکے سن آج شام فیروز پور روانہ ہو گئے اور میری طرف سے کچھ خطوط میرے یورپین نامہ نگاروں کے نام لیتے گئے۔میں نے انہیں وداع تو کیا لیکن ان سے جدائی کا بہت رنج ہوا۔وہ بہت ملنسار اور دانا آدمی ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کے بغیر میری رنجیت سنگھ سے ملاقات اور گفتگو اتنی آسانی سے نہ ہوسکتی تھی۔

سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب
بشکریہ: مجلس ترقی ادب لاہور

سفرنامۂ پاکستان

کیمی میرپوا
ترجمہ: محمد حسن

کیمی میرپوا بحیرہ عرب کے راستے کراچی آئیں وہ نیویارک کی رہنے والی تھیں۔ یہ 1958ء کا زمانہ ہے۔ انہوں نے اپنے سفرنامہ میں پاکستان کے تمام اہم شہروں کا تذکرہ کیا ہے جہاں وہ بغرض سیاحت رہائش پذیر رہیں۔ یہاں انہوں نے لاہور کے بارے میں جولکھا اسے قارئین کی دلچسپی کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔

عظمت ووقار کا شہر لاہور

مغل شہنشاہوں کے اس قدیم شہر کا ایک اپنا مقام ہے۔اس کے گلی کوچوں کی ایک اپنی انفرادیت ہے۔ بازاروں میں بڑی گہما گہمی رہتی ہے گلبرگ کے درختوں سے گھرے ہوئے علاقے میں زندگی بڑی پُرسکون ہے اور شہر کے بڑے بازاروں میں جہاں نئی اور پرانی دکانیں ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہیں ہر وقت رونق رہتی ہے۔ پھیری والے، رس بھرے پھل، کھلونے، چمکتے، دمکتے ہار اور دوسری چیزیں بیچتے پھرتے ہیں۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔گلی گلی آلتی پالتی مارے درزی بیٹھے ہیں جو ہر کام کرنے کو تیار ہیں خواہ ٹوٹا ہوا بٹن لگانا ہو یا اچانک پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت۔

لاہور میں ہر طبقے کے لوگ آباد ہیں۔ باہر سے آنے والوں سے نہایت محبت سے پیش آتے ہیں۔ فطرتاً صاف گو ہیں اور ہر بات پر اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ

داستانوں کے رسیا ہیں۔ یہاں پرانے دور، خوشیوں، جنگوں اور روحانی کہانیاں آج بھی سننے کو ملتی ہیں۔ اس علاقے کے رومان کو ہمایوں، اقبال اور موجودہ دور کے شاعروں نے شاعری کے روپ میں ڈھالا ہے اور یہ نغمے آج بھی گائے جاتے ہیں۔

سایہ دار درختوں سے ڈھکی، بل کھاتی مال پر دھیمی دھیمی باتوں کی آواز آتی ہے اور ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ صبح نور کے تڑکے سے شام ڈھلنے تک لاہور کی اس سیر گاہ پر رونق رہتی ہے۔ یہ سابق پنجاب کا علاقہ ہے اور مغربی پاکستان کا دارالحکومت پنجاب کے لوگ لاہور کو "پاکستان کا دیوان خانہ" کہتے ہیں۔

لاہور کے باسیوں کو اپنے شہر سے اس قدر محبت ہے کہ وہ ساری دنیا گھوم آئیں اور دوسرے ملکوں کی خوبصورتی سے متاثر بھی ہوں لیکن واپسی پر یہی کہتے ہیں "مشرق ہو یا مغرب، لاہور لاہور ہے۔" شام کو شیزان یا ہیکو (Hico) ریستوران میں چائے پیتے ہوئے آپ پنجاب کے جوانوں، سیاحوں اور پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگوں کو شلوار قمیض پہنے دیکھ سکتے ہیں۔ ساڑھیوں میں ملبوس خواتین مغربی لباس پہنے مردوں کے ساتھ آتی ہیں۔ شوٹنگ کا لباس زیب تن کیے فلمی ستارے بڑی بڑی دکانوں میں خرید وفروخت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ شہر اس قدر خوبصورت ہے کہ وہ سیاح بھی جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ہر چیز دیکھ رکھی ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ قیام پسند کرتے ہیں اور اگر موقع مل جائے تو کون نہ ٹھہرے؟ لاہور میں نئی نئی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ گلیوں میں رہنے والی لڑکیاں پردۂ سیمیں کی شہزادیاں بن جاتی ہیں اور دلفریب ماحول میں اجنبی خود کو بڑا بلند محسوس کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے رات کو معجزے ظہور میں آتے ہیں اور سیر کرنے والا وسیع حال اور ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ فضا کی سنجیدگی دل اور رُوح پر چھا جاتی ہے۔

کراچی سے سات سو پچاس میل دور لاہور مغربی پاکستان کی سیر کی خصوصیت ہے۔ کراچی سے جدید ایئر کنڈیشنڈ ریلیں چلتی ہیں اور سفر چوبیس گھنٹے سے بھی کم کا ہے۔ راستے میں ٹرین مختلف اسٹیشنوں پر رکتی چلتی ہے جہاں لوگ چوڑیاں، پھل اور نوادرات بیچتے ہیں۔ پی آئی اے کے جہاز سے یہی سفر دو گھنٹہ پچیس منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ جہاز روزانہ صبح چھ بجے روانہ ہوتا ہے اور لاہور پہنچنے سے پہلے بڑا لذیذ ناشتہ دیا جاتا ہے۔

لاہور مغلیہ فنِ تعمیر کا شہر ہے۔ تاریخی طور پر راجہ جے پال کے عہد میں (۹۰۰ء سے ۱۰۰۲ء تک) یہ طاقت کے مرکز کی حیثیت سے ابھرا۔ بعد میں جے پال کی فوجوں کو شکست ہوگئی اور لاہور فاتحین کا دارالخلافہ بن گیا۔ اگلی پانچ صدیوں میں لاہور پر خاندانِ غلاماں، تغلق، سید اور لودھی بادشاہوں نے باری باری حکومت کی۔ لودھی خاندان کا خاتمہ اس وقت ہوا جب پنجاب میں دولت خاں لودھی نے کابل کے بادشاہ کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ ترکستان میں پیدا ہونے والے بابر نے جو چنگیز خاں کے خاندان سے تھا، یہ درخواست قبول کرلی اور دشمن بادشاہ کو شکستِ فاش دی، بابر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ۱۵۲۶ء میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۵۳۰ء میں بابر کے انتقال کے بعد تخت اس کی اولاد کو ملا۔ انہوں نے پنجاب اور کابل پر حکومت کی اور مشہورِ زمانہ جرنیلی سڑک تعمیر کرائی۔ ۱۵۸۵ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے لاہور کو اپنا دارالمقام بنایا۔ لاہور کے قلعہ کی مضبوطی اور خوبصورتی اکبر کی مرہونِ منت ہے جس نے مٹی کے قلعہ کی پتھر سے دوبارہ تعمیر کرائی۔ اکبر کے بیٹوں اور پوتوں نے اپنے عہد میں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ سیّاح قلعہ میں شیش محل کی صناعی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ محدب شیشوں کے ٹکڑے آج بھی صدیوں پہلے کی طرح جگمگاتے ہیں قلعہ میں ایک قابلِ ذکر چیز شاہ برج دروازہ ہے جس کی دیواروں میں تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ پلاسٹر پر بنی ہوئی یہ تصویریں مغلوں کے کھیلوں کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔

اکبر کے عہد میں ایک رقاصہ انارکلی اس کے بیٹے شہزادہ سلیم جو بعد میں جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ شہزادہ نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ اکبر نے ایک دن جب انارکلی اور شہزادہ کو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے دیکھا تو اسے ان کی محبت کا علم ہوگیا۔ اکبر کو یہ دیکھ کر سخت طیش آیا کہ ایک کنیز اس کے بیٹے سے محبت کرنے کی جرات کرسکتی ہے۔ اس نے انارکلی کو سزائے موت دی اور حکم دیا کہ اسے دیوار میں زندہ چنوا دیا جائے۔ اس افسوسناک واقعہ سے شہزادہ سلیم کا دل ٹوٹ گیا۔ کئی سال بعد جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے مقبرہ پر نہایت خوبصورت سفید اور قرمزی گنبد تعمیر کروایا۔ یہ یادگار لاہور کے وسط میں آج بھی قائم ہے اور انارکلی کے مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہزاروں سیّاح اسے دیکھنے آتے ہیں۔ مقبرہ کے ایک طرف خدا کے ننانوے صفاتی نام لکھے ہوئے ہیں اور دوسری طرف جہانگیر

کے اشعار ہیں جو اس کے دُکھی دل کی پکار ہیں............

''آہ، اگر ایک بار میں اپنی محبوبہ کا چہرہ اور دیکھ سکتا تو قیامت تک خدا کا شکر ادا کرتا۔''

وقت گزر گیا ہے لیکن انار کلی کی یاد آج بھی باقی ہے ایک بڑا بازار اس کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں امیر و غریب سب ہی آتے ہیں اور صبح سے شام تک خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جہانگیر کا مقبرہ، جو ۱۶۳۷ء میں اس کے بیٹے شاہجہاں نے تعمیر کرایا، وسیع باغوں کے درمیان واقع ہے جو روایتی مغلیہ انداز میں بچھائے گئے ہیں۔ روزانہ یہاں سینکڑوں لوگ آ کر دعا مانگتے ہیں اور سرسبز میدانوں میں پکنک مناتے ہیں۔

لاہور کی عظمت کا اندازہ خوبصورت شالا مار باغ کو دیکھ کر ہوتا ہے جو شہر کے مشرق میں تین میل دور جرنیلی سڑک پر واقع ہے۔ یہ شاہی باغ بادشاہوں کی لاہور میں آمد کے موقعہ پر رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسے ۱۶۶۷ء میں شہنشاہ شاہجہاں نے تعمیر کرایا۔ یہ ایرانی انداز میں بنا ہوا ہے۔ باغ کے چاروں طرف پختہ دیوار ہے جس کے کونوں پر گنبد بنے ہوئے ہیں۔

خوبصورت نہروں کے درمیان سنگِ مرمر کا پویلین ہے جگہ جگہ فوارے لگے ہیں اور چاروں طرف سرو کے درخت ہیں۔ اس باغ کا نقشہ مشہور انجینئر علی مردان خاں نے بنایا تھا جسے پنجاب کا مغل وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ باغ میں سات تختے تعمیر کیے گئے تھے جن میں سے چالیس ایکڑ کے رقبہ میں تین تختے آج بھی باقی ہیں۔ چار تباہ ہو گئے ہیں۔ شالا مار باغ سترہ مہینہ اور چار روز میں تعمیر ہوا اور اس پر چھ لاکھ روپے صرف ہوئے۔

یہ مستطیل نما باغ مربعوں میں بٹا ہوا ہے۔ درمیان میں پانی کا تالاب ہے جس کے چاروں طرف کنگورے دار حاشیہ ہے اور جا بجا فوارے لگے ہوئے ہیں۔ پانی آبشار کی صورت میں سنگِ مرمر کے ٹکڑوں پر سے بہتا ہے جن کے پیچھے بلب لگا کر روشنی کی جاتی ہے۔ باغ کی فقید المثال خوبصورتی سے متاثر ہو کر شہنشاہ اورنگ زیب کی شاعرہ بیٹی زیب النسا نے لکھا!

''اے آبشار! تو کس کی یاد میں آنسو بہاتی ہے؟
کس کی یاد نے تیرے ماتھے پر بل ڈال دیئے ہیں؟

وہ کیا درد ہے جس سے تو میری طرح مجبور ہو کر تمام رات پتھر سے اپنا
سر پٹکتی ہے اور آنسو بہاتی ہے؟''

شالامار میں ہر سال مارچ میں میلہ چراغاں منعقد ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ غریب اور امیر سب ہی تفریح کے لیے آتے ہیں۔ میلہ میں داخلہ کا کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ مغل بادشاہوں کی بنوائی ہوئی عمارات قیمتی ورثہ ہیں۔ آخری عظیم مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی بادشاہی مسجد عظمت کا مرقع ہے۔ سرخ پتھر سے بنے ہوئے اس کے چار بلند مینار سنگ مرمر کے تین گنبدوں کے مقابلے میں بڑا خوبصورت تضاد پیش کرتے ہیں۔ مسجد کی بائیں جانب فلسفی شاعر علامہ اقبالؒ کا مزار ہے جس نے سب سے پہلے پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ لاہور میں بے شمار مساجد ہیں۔ اسی دور سے تعلق رکھنے والی دائی انگا کی مسجد اور چوبرجی اپنے خوبصورت فن تعمیر کے لیے مشہور ہیں۔ غالب نے اس سے متاثر ہو کر لکھا تھا: ''مسجد کے سائے میں محبت، جذبات اور گناہ کو بھی پروان چڑھنا چاہیے تاکہ زندگی کے پلڑے برابر ہو سکیں۔'' انگریز شاعر ملٹن نے کافی وقت لاہور میں گزارا اور اپنی تحریروں میں اس کی تعریف کی۔ رڈیارڈ کپلنگ لاہور کے مشہور اخبار سول ملٹری گزٹ کا ایڈیٹر تھا۔ اب یہ اخبار مالک اور کارکنوں کے تنازعہ کی وجہ سے بند ہو چکا ہے۔ مالک نے ان کے حقوق پر پیسے بچانے کو ترجیح دی۔ بہرحال دروازے پر اب بھی ایک تختی لگی ہے جس پر لکھا ہے۔ ''یہاں رڈیارڈ کپلنگ نے کام کیا۔''

پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزوں نے لے لی ہے۔ ۲۶ نومبر ۱۹۶۴ء کو لاہور میں ٹیلیویژن شروع ہو گیا۔ اس سے اب لوگوں کی معلومات اور سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوگا۔ پروگراموں کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں دلچسپی کی بے شمار چیزیں ہیں۔ چیکوسلاواکیہ کی حکومت نے کٹھ پتلیوں کی نمائش کی ہے۔ یہ مظاہرہ مال روڈ پر پاکستان آرٹس کونسل میں مفت کیا گیا تھا۔

لاہور کے لوگ، خواہ وہ جواں ہوں یا بوڑھے، بسنت پنچمی کے زمانے میں، جو جنوری کے ختم پر ہوتا ہے پتنگ اڑاتے ہیں۔ اس موقعہ پر جوش و خروش دیکھنے والا ہوتا ہے لوگوں کے گروہ مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے منٹو پارک، بھاٹی اور موچی دروازہ پر جمع ہو جاتے ہیں یہ

مقابلے اتنے مقبول ہیں کہ صرف ایک دن میں پچیس ہزار لوگوں نے بیس ہزار روپیہ داخلے کے ٹکٹوں پر صرف کیا۔ ہر سال زیادہ سے زیادہ لوگ اس تہوار میں شرکت کرتے ہیں، جس کی ابتدا انیسویں صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں ہوئی تھی۔ ایک اور مقبول مشغلہ دریائے راوی میں کشتی رانی ہے۔ یہ دریا میلوں بل کھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ دریا میں جگہ جگہ کشتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ دسمبر سے مارچ تک لاہور میں اچھی خاصی سردی پڑتی ہے۔ موسم بہار کی گرم گرم دھوپ میں سارا شہر نہا جاتا ہے اور سردیوں میں بھی روز دھوپ چمکتی ہے اپریل کے بعد موسم گرم ہو جاتا ہے لیکن یہ گرمی بھی صحت بخش ہے جولائی اور اگست میں بارش ہوتی ہے۔

فروری میں لاہور میں ہارس شو ہوتا ہے جو دنیا بھر میں مشہور ہے اس موقعہ پر ہمیشہ بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ افتتاح کے وقت عظیم الشان بینڈ دھنیں بکھیرتا ہے اور سارا منظر اس قدر پرسکون ہوتا ہے گویا مغل شہنشاہ زمین پر اتر آئے ہوں دوسرے سازوں کے ساتھ بیگ پائپ (Beg Pipe) بھی ہوتے ہیں اور گھڑ سواروں کی وردی ایسی ہوتی ہے گویا کوئی رسم تاجپوشی ہو رہی ہو۔ بہترین بیلوں، گھوڑوں اور گائیوں کے انتخاب کے علاوہ رقص کرتے ہوئے اونٹ، پھولدار چادروں سے ڈھکی ہوئی گھوڑیاں اور سفید عربی گھوڑے بھی دیکھنے کی چیز ہیں۔

گلستان فاطمہ کے اوپن ایئر تھیٹر میں منعقد ہونے والے ڈرامے اور موسیقی کے مقابلے بھی دلچسپی کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ لاہور جمخانہ کا ماحول بڑا دوستانہ ہے اور مہمانوں کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا ہے یہاں اکثر باہر سے آنے والے طائفے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں عجائب گھر اور آرٹس کونسل کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں یہاں ہر ہفتہ نمائشیں ہوتی ہیں۔ حکومت کی کھولی ہوئی دست کاری کی دکانیں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، ایک اور قابل دید جگہ پنجاب پبلک لائبریری ہے جو ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہ تاریخی عمارت وزیر خاں نے تعمیر کرائی تھی جس نے مشہور مسجد وزیر خان بھی بنوائی تھی۔ لائبریری میں مشرقی علوم پر کتابیں ہیں جن میں عربی فارسی، ترکی اور اردو کی کتابیں شامل ہیں ان کے علاوہ برطانوی عہد کی بے شمار کتابیں ہیں اور اس دور کے متعلق سرکاری گزٹ ہیں عربی کی چار ہزار کتابوں کے علاوہ محققوں کے لیے سنسکرت، بدھ مت اور عیسائیت پر نایاب نسخے ہیں، تقریباً آدھی کتابیں قرآن حکیم کی تفسیریں ہیں۔

لاہور اپنی تعلیمی سہولتوں کے لیے مشہور ہے اور یہاں دور دور سے طالب علم آتے ہیں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی، ایڈورڈ میڈیکل کالج، لڑکیوں کے لیے کوئین میری کالج، لاکالج، اورینٹل کالج، انجینئرنگ کالج اور لاتعداد سکول ہیں۔ فنی تعلیم کے لیے بہت سے ادارے، ریڈیو انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل آرٹس کالج ہے۔ تعلیم کے معاملے میں لاہور تمام شہروں پر فوقیت رکھتا ہے۔

لاہور کا ماحول ثقافتی ہے اور پاکستان میں کوئی دوسرا ضلع ایسا نہیں جو سیاسی اور روشن خیالی کے اعتبار سے اس سے لگا کھاتا ہو۔ لاہور ہی میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں پاکستان کی تاریخی قرارداد اختیار کی تھی۔ لاہور ہی وہ شہر ہے جہاں سب سے پہلے ہندوستان کے ظلم وستم کے ستائے ہوئے مہاجرین آئے اور ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء کے بعد سے لاہور، جو پہلے پنجاب کا دارالخلافہ تھا، مغربی پاکستان کا سرکاری دارالحکومت بن گیا۔ یہاں گورنر رہتا ہے جو کمشنروں اور دوسرے قابل افسروں کے ساتھ تمام انتظام سنبھالتا ہے۔

لاہور میں بے شمار اچھے ہوٹل ہیں اور بہت سے نئے بن رہے ہیں۔ پارک لگژری (جو کراچی کے مشہور ہوٹل بیچ لگژری کے مالک مسٹر اویری کی ملکیت ہے) وسیع باغات سے گھرا ہوا ہے اور اس کے کمرے چھوٹی چھوٹی کٹیاؤں کی طرح ہیں۔

مشہور قدیم ہوٹل فلیٹیز میں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ یہاں ہر رات کیبرے ہوتا ہے۔ نوجوان فنکاروں پر مشتمل بڑا عمدہ آرکسٹرا ہے جو بلیو نوٹس (Blue Notes) کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی یادداشت بے حد تیز ہے۔ جب کبھی کراچی یا دنیا کے کسی حصہ سے آیا ہوا مہمان کھانے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو سوچتا ہے! ''میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتا، میں اس کونے میں بیٹھ جاؤں گا'' اچانک اس کا محبوب نغمہ فضا میں گونجتا ہے۔ ''یہ میرا نغمہ ہے'' وہ خود سے سرگوشی کرتا ہے۔ ''انہیں اس کا علم کیسے ہو گیا؟''

یہ لوگ صرف مہمان کو پہچانتے ہی نہیں بلکہ اس کی پسند بھی یاد رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے وسیع میدانوں اور صاف ستھرے کمرے دیکھ کر بڑا سکون ہوتا ہے۔ فلیٹیز میں ہی لوگ اپنے دوستوں سے ملنے کا پروگرام بناتے ہیں۔

ہوٹل کے برآمدے میں نوادرات کی دکان ہے جس کا نام اورینٹل سٹورز ہے۔ اس کے خوش مزاج بوڑھے مالک کو اس بات کی پرواہ نہیں کہ آیا آپ کچھ خریدتے ہیں یا نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ آپ دکان میں گھومیں، چیزوں کو چھو کر دیکھیں، انہیں پرکھیں اور خریدنے سے پہلے انہیں پسند کریں۔ وہ تو کہتا ہے "اگر اس وقت آپ کے پاس پیسے نہیں تو کوئی حرج نہیں آپ چیز لے جائیے۔" اسے معلوم ہے کہ دوبارہ آنے پر آپ حساب چکا دیں گے۔ جب میں آخری بار وہاں گئی تو اس کا نوجوان بھانجا ان تمام خوبیوں کے ساتھ دکان چلا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں اپنے پرانے گھر لوٹ آئی ہوں لیکن بوڑھا مالک جنت کو سدھار چکا تھا۔ مجھے یہ جان کر بے حد افسوس ہوا لیکن اس کا جذبہ اور خیالات آج بھی موجود ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ دکان میں موجود ہے جس سے اسے بے حد محبت تھی۔

نئے ایمبسڈر ہوٹل میں کرایہ چالیس روپیہ یومیہ ہے۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ ہے اور تمام سہولتیں میسر ہیں۔ ہوائی اڈہ کے نزدیک زنوبی کا ماحول بڑا مانوس ہے اور امپریل اور والڈورف میں کرایہ پچیس روپیہ یومیہ ہے جس میں ناشتہ بھی شامل ہے۔

خوشنما انڈس ہوٹل میں ساڑھے تیئس روپیہ میں کمرہ مل جاتا ہے جس میں سروس کے علاوہ ناشتہ بھی شامل ہے اس کا ماحول بڑا عمدہ ہے اور ان کے گیلکسی (Galaxy) ریسٹورنٹ میں مشرقی اور مغربی طرز کے لذیذ کھانے ملتے ہیں یہاں فلمی دنیا کے تمام لوگ آتے ہیں۔ انڈس مال روڈ کے وسط میں واقع ہے اور یہاں سے ہر جگہ نزدیک ہے اس کے خوش مزاج منیجر سردار طفیل ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ مہمانوں کو ہر قسم کا آرام میسر ہو۔

کم خرچ کے لیے، برگینزا اور رینٹ میں بالترتیب بارہ اور تیرہ روپے لیے جاتے ہیں۔ یہ کشادہ ہوٹل ہیں اور کمرے آرام دہ ہیں۔ مناسب ہوگا کہ آپ کمرے پہلے سے مخصوص کرا لیں۔ اوپر دیئے ہوئے کرائے غیر ایئر کنڈیشنڈ کمروں کے لیے ہیں۔ اچھے ہوٹلوں میں ایئر کنڈیشنڈ کمرے دس روپیہ زیادہ پر مل جاتے ہیں۔

سواری کے لیے لاہور میں رکشہ اور ٹیکسیاں ہیں جن کا فی میل کرایہ بے حد سستا ہے۔ انتیس راستوں پر ساڑھے تین سو بسیں چلتی ہیں اور سارے شہر کا چکر لگاتی ہیں۔

لاہور سے بے شمار اخبارات نکلتے ہیں۔ انگریزی کے روزنامہ پاکستان ٹائمز میں تمام

تازہ خبریں اور بیرونی نمائندوں کی بھیجی ہوئی خبریں ہوتی ہیں۔ نوائے وقت اور اردو کے دوسرے اخبارات صبح اور شام شائع ہوتے ہیں ان کے علاوہ اردو، پنجابی، پشتو اور انگریزی کے پچاس کے لگ بھگ ماہنامے بھی نکلتے ہیں۔ لاہور میں ستر چھاپہ خانے ہیں جن میں پیکجز لمیٹڈ، فیروز سنز، مکتبہ جدید پریس اور گورنمنٹ پرنٹنگ پریس شامل ہیں۔ یہاں پاکستان کے تمام مشہور ناشروں کے صدر دفتر بھی ہیں چالیس کے قریب نئے اور پرانے سینما گھروں میں تازہ ترین فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔

لاہور میں ہر سیّاح کی دلچسپی کا سامان موجود ہے انہیں فلمی نگار خانوں کی سیر بھی کرائی جاتی ہے یہاں ہالی ووڈ کی طرح تمام ساز و سامان موجود ہے گو اتنے بڑے پیمانے پر کام نہیں ہوتا۔ لاہور میں سیّاحوں کے لیے نگار خانوں کی سیر کرنا اور فلمیں بنتے دیکھنا برطانیہ اور امریکہ کی نسبت بے حد آسان ہے۔ پنجابی بڑے یار باش اور دوست نواز لوگ ہیں اور آپ کی دلچسپی کو اپنی دلچسپی سمجھتے ہیں۔

یہ دلچسپی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک روز میں پی آئی اے (PIA) کے دفتر سے نکل رہی تھی کہ میری جیکٹ دروازے میں اٹک گئی توبہ، توبہ، کس بری طرح پھٹی ہے! میں اس حلیے میں عجب ہی دکھائی دیتی تھی اور اب آگے سیر کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ اچانک میری نظر ایک درزی پر پڑی جو شاہ دین بلڈنگ کے دروازے میں قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے میری پریشانی بھانپ لی اور چند ہی منٹ میں اس نے کھونچ کو نہایت نفاست سے سی دیا۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ اس کے ہر ٹانکے میں خلوص پرویا ہوا تھا۔ وہ اس کام کے پیسے بھی نہیں لینا چاہتا تھا اس کا نام ویر تھا۔ اس کا تلفظ ڈیر (dear) سے ملتا ہے اور میں بھی اسے ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔ چند روز بعد میں اس کی چھوٹی سی دکان میں گئی اور اپنے لیے بہت سے کپڑے سلوائے۔ دوسرے ممالک میں یہ بات یقیناً اتنی آسان نہیں تھی۔ تمام سیّاحوں کے لیے خواہ وہ پاکستانی ہوں یا غیر ملکی یہ درزی نہایت عمدہ کام کرتے ہیں۔

جب آپ لاہور آتے ہیں اور ہوٹل کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تو اس بات کا اطمینان کر لیجیے کہ آپ کے پاس یوتھ ہوسٹل کا کارڈ موجود ہے (یہ کارڈ ساری دنیا میں کارآمد ہے) اکیس سال تک کے لوگوں سے ایک روپیہ، چوبیس سال تک کے لیے دو روپیہ اور اس

سے زیادہ عمر کے لوگوں سے ممبر بننے کے پانچ روپے لیے جاتے ہیں۔ آپ ساٹھ سال کے ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی یوتھ ہوسٹل میں شامل ہو سکتے ہیں اور اس کارڈ کے ذریعہ تمام یورپ، امریکہ، مشرق بعید، برطانیہ، متحدہ عرب جمہوریہ اور بہت سے ممالک کے علاوہ آپ تمام پاکستان میں کسی بھی یوتھ ہوسٹل میں ٹھہر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بڑا سستا سودا ہے اور اس میں لطف بھی بے حد آتا ہے۔ ہر عمر کے لوگوں سے ملنا ہو جاتا ہے اور مختلف اقوام کے لوگوں سے واقفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اس صدر دفتر لاہور میں ہے پتہ کے لیے صرف سیکرٹری پاکستان یوتھ ہوسٹلز ایسوسی ایشن لاہور لکھ دینا کافی ہے یا ۶۸۸۰۵ پر فون کر لیجیے اور آپ کو تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ ابتدا میں یوتھ ہوسٹل صرف طالب علموں کے لیے شروع کیا گیا تھا، لیکن اگر آپ کی امنگیں جوان ہیں تو یہ آپ کے لیے بھی حاضر ہے۔

خوبصورت بازار لاہور کی بے شمار دلچسپیوں میں سے ایک ہیں۔ زیورات، عمارتی لکڑی، برتن، مشینری اور بہت سی چیزوں کے علیحدہ علیحدہ بازار ہیں۔ دہلی دروازے کے باہر کھالوں اور چرم کا بہت بڑا بازار ہے جس کے گرد بیٹھے ہوئے سبزی اور پھل فروش بالکل الف لیلوی ماحول پیش کرتے ہیں۔ خرید و فروخت کرتے ہوئے سیاح سیخ کباب کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں دہکتے ہوئے انگاروں پر دنبہ بھنتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں گرم گرم روٹیوں کے ساتھ اس کا بہت لطف آتا ہے۔ اس کے ساتھ دہی بھی دی جاتی ہے جو اس مشرقی کھانے کی لذت کو دوبالا کر دیتی ہے۔

لاہور کے گرد و نواح میں چمڑے اور جوتے بنانے کے باٹا اور سروس کے بڑے بڑے کارخانے ہیں باٹا کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے شہر سے دس میل دور باٹا پور ہے جسے عمدہ جوتوں کا شہر کہا جاتا ہے یہ شہر سارے پاکستان کے لیے جوتے مہیا کرتا ہے پچیس سال پہلے اس کا نام و نشان بھی نہ تھا یہ سارا قطعہ بالکل بنجر تھا اور گھاس کی ایک پتی تک نہ اگتی تھی چند غریب دیہاتی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور آس پاس کا علاقہ اس قدر ویران تھا کہ یقین نہیں آتا کہ زندگی سے بھرپور یہ شہر کس طرح ابھر آیا۔ کہانیوں میں پنوکیو (pin - nochio) کا دادا جو موچی تھا، جوتے بناتے وقت ہزاروں لوگوں کو مسحور کر دیتا تھا۔ اب باٹا کے لاتعداد کام کرنے والے اپنی مشینوں کے استعمال سے ہزاروں دیکھنے والوں کو مسحور کرتے ہیں۔

باٹا کا ادارہ، جو اپنے ترقی پسند نظریہ کی بنا پر ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ہندوستان اور مشرقِ بعید کے ممالک کو جوتوں کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے عشرے کے آخر میں ہندوستان میں کارخانہ شروع کیا گیا۔ اس کے جوتوں کو فوری مقبولیت حاصل ہوئی اور ۱۹۴۲ء میں لاہور کے باہر ایک گودام قائم کیا گیا۔ آزادی کے بعد اس کی توسیع کی گئی جو آج بھی جاری ہے۔

اس زمانے میں اس کے ڈائریکٹر نوجوان اور پرجوش مسٹر ڈولیزل تھے جو چیکوسلاواکی نژاد پاکستانی شہری ہیں باٹا فیکٹری قائم کرنے کی راہ میں بے شمار دشواریاں تھیں لیکن چند یورپی ماہروں کی مدد سے انہوں نے ان تمام مشکلات پر قابو پالیا جنہیں دیکھ کر بہت سے لوگ ہمت ہار بیٹھتے۔ جلد ہی اس ملک میں مشینوں سے آراستہ پہلی جوتوں کی فیکٹری قائم ہوگئی اور گاؤں کے لوگوں کے لیے ملازمت کے دروازے کھل گئے۔ ڈولیزل کو معلوم تھا کہ اگر کارکنوں کو خوش رکھا گیا تو پیداوار بہت بڑھ جائے گی۔ انہوں نے بچوں کے لیے سکول تعمیر کرائے اور جلد ہی برادری کا ماحول پیدا ہوگیا کچھ عرصہ بعد مسجد، ڈاکخانہ اور ہسپتال تعمیر کیے گئے۔ کھیلوں اور تفریح کے لیے میدان بنائے گئے اور لاہور کے اس نواحی ویران علاقہ میں زندگی پیدا ہوگئی اور اس کا نام باٹا پور پڑ گیا۔ لوگوں کی زندگی پرسکون اور سودمند ہے اس کے تین ہزار چھ سو ملازم پاکستان کے دونوں صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں یہ لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر باٹا پور کے بیس ہزار مکینوں کی مدد کرتے ہیں جن میں سے بہت سے دکاندار ہیں۔ ان کی دکانوں میں روزمرہ کے استعمال کا تمام سامان موجود ہے۔ باٹا کے کارکنوں کے چار سو بچے جدید طرز کے باٹا مڈل سکول میں پڑھتے ہیں تمام بچے جوتے پہنتے ہیں جس کی کسی زمانے میں انہیں عادت نہیں تھی۔

نوّے ایکڑ کے علاقے میں، جو ہندوستان کی سرحد سے صرف چار میل دور ہے، خوبصورت مکانات بنے ہوئے ہیں، عملہ کے پچاس فیصد لوگ کمپنی کے گھروں میں رہتے ہیں۔ گھروں کے گرد پھول لہلہاتے ہیں۔ پچھلے صحن میں مرغیاں اور بکریاں پالی جاتی ہیں اور پھولوں کے ساتھ ساتھ سبزیاں اُگی ہوئی ہیں۔ تمام ملازمین کمپنی کی کوآپریٹو سوسائٹی کے منافع میں حصہ دار ہیں۔ باٹا پور ایک بڑے خاندان کی طرح ہے۔ تعلیم مفت ہے، طبی امداد بھی مفت ہے اور انتظامیہ ہر کام میں والدین کی طرح ذاتی دلچسپی لیتی ہے۔ باٹا کے ڈائریکٹروں نے

باہمی مشاورتی ادارہ قائم کیا ہے جس کے تحت مجلس عمل، سپورٹس کلب، سکول اور باٹا کے ملازمین کی بیماروں کی بہبود کی سوسائٹی(Sickness Benefit Society) کام کرتے ہیں۔ ان اداروں کے زیر نگرانی مزدوروں کی شکایات، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا خیال رکھا جاتا ہے جو باٹا جیسے بڑے ادارے میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کارکنوں کے معاملات سے یہ دلچسپی باٹا کے انتظام اور ترقی میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی ہے ماہرین ملازمین کو ہر کام خود کر کے سمجھاتے ہیں باٹا پور کا اپنا ٹریننگ سکول ہے جہاں ٹیلیفون ایکسچینج کو سنبھالنے سے لیکر جوتے بنانے تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۱۹۵۰ء میں باٹا نے سائیکل کے ٹائیر اور ٹیوب بنا کر مقامی صنعت کی تاریخ میں نیا مقام حاصل کیا۔ یہ شعبہ کمپنی اور پاکستان دونوں کے لیے بیش قیمت اثاثہ ہے کیونکہ اس کی برآمد سے کثیر زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے گزشتہ دو سالوں میں یہاں بالترتیب دس لاکھ ٹائر اور بیس لاکھ ٹیوبیں ہر سال تیار ہوئیں ہر ہفتہ یہاں دو لاکھ سے اوپر ربڑ اور چمڑے کے دیدہ زیب جوتوں کے جوڑے تیار ہوتے ہیں ان کا ایک حصہ برآمد کیا جاتا ہے جس سے ملک کی معیشت کے لیے روپیہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ اس کمپنی کا حیران کن کارنامہ ہے جس کا کچھ عرصہ پہلے اس ملک میں نام ونشان تک نہ تھا۔

کمپنی کے موجودہ ڈائریکٹر جناب جے۔ بیرک(J-BericK) انتھک ہمت کے مالک ہیں۔ وہ نہایت جوش سے ان دکانوں، ایجنسیوں اور تقسیم کاروں کا ذکر کرتے ہیں جو باٹا نے پاکستان میں قائم کی ہیں انہیں وہ لوگ چلاتے ہیں جن کا کسی زمانے میں خیال تھا کہ ننگے پیروں سے صحت قائم رہتی ہے۔ بیرک صاحب ان دکانوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جو نئی آبادیاں قائم ہونے پر کھولی جائیں گی۔ وہ کارکنوں سے مشورہ طلب کرتے ہیں اور ہر ایک کو باہم موقع دیتے ہیں خواہ وہ معمولی مزدور ہو یا بڑا افسر مزدوروں کو ترقیاں دی جاتی ہیں اور عملہ کے پرانے لوگ نئے مزدوروں کو اپنے شعبہ میں لے لیتے ہیں۔ کام کے بعد مزدوروں کی تفریح کے لیے کھیلوں کے میدان ہیں صحت مند مزدوروں کو کام کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی حصہ لینا چاہیے۔ عام تعطیلات کے علاوہ ہفتہ اور اتوار کی چھٹی ہوتی ہے ان دنوں میں لائبریری کینٹین اور باٹا سینما لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں معقول تنخواہ پانے کی وجہ سے ہر شخص اپنی پسند

کی تفریح کا انتخاب کرسکتا ہے۔اس معاوضہ سے مزدور لوگ اپنے مستقبل کے انتظام کے لیے جائداد بھی خرید سکتے ہیں باٹا پور کے آس پاس کے علاقوں میں پکنک منائی جاتی ہے غیر شادی شدہ مردوں کے لیے الگ جگہ ہے اکثر اس کا کوئی نہ کوئی فرد کم ہو جاتا ہے اور باٹا کے کارکنوں کے خاندانوں کے درمیان شادیاں بڑی پرلطف ہوتی ہیں لاہور اور دوسرے مقامات سے آنے والے لوگوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے ایک آدمی ان کا خیر مقدم کرتا ہے اور تمام جگہوں کی سیر کراتا ہے دروازے پر میلہ کا سا سماں ہوتا ہے اور دیواروں پر یہ فقرے لکھے ہوتے ہیں:۔

''آپ عمدہ جوتوں کے شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔کیا یہ ایک حقیقت ہے؟''

کیا یہ سب کے ساتھ یکساں ہے؟ کیا یہ خیر سگالی پیدا کرے گی؟''

اندر ایک کھڑکی میں باٹا کے تمام جوتے نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔مشرقی، مغربی اور تمام نئے ڈیزائن موجود ہیں۔دیکھنے کی سب سے بڑی چیز وہ سنجیدگی ہے جو سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔

بیس ہزار لوگوں کا یہ شہر انسانی دلچسپی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جو دو ہزار سال پرانے ''پاکستان کے دیوان خانہ'' میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔لاہور اس مہمان نواز خاتون کی طرح ہے۔جس کے خاندان کے افراد خود کو سب کے برابر سمجھتے ہیں اور جن کا خلوص تمام آنے والوں کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

سفرنامۂ پاکستان
کیمی میرپوا (ترجمہ: محمد حسن)
بشکریہ: بک ہوم (۲۰۰۵ء)

سیکنڈ انٹرنیشنل تھاپ ہسٹری اینڈ آرٹ کانفرنس

ادارہ تاریخ

دوسری انٹرنیشنل تھاپ ہسٹری اینڈ آرٹ کانفرنس
کے انعقاد پر کانفرنس میں شریک ہونے والے
تمام مندوبین کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تاریخ:

۱۱ تا ۱۸ نومبر ۲۰۱۱ء

بمقام:

۴۳ جی گلبرگ لاہور

برائے مزید معلومات

THAAP PUBLICATIONS

43-G Gulberg III, Lahore

Tel: 042-35880822, Fax: 042-35725739

E-mail: thappublications@gmail.com

لاهور۔یادداشتیں

سوہنا شہر لاہور

طاہر لاہوری

اللہ تعالیٰ نے اس شہر کی دھڑکنوں میں مہکتی فضاؤں کا نور بھرا ہوا ہے، خیر و برکت کے انوار کی بارش، محبت کی خوشبو کے جھونکے، وفاؤں کے دلگداز ابلتے چشمے، اس کے کوچہ و بازار کے ہر ذرے کے دل سے پھوٹتے ہیں۔

لطافتوں کی مہک، انقلابات میں رحمتوں کا نزول، ہجوم حسن و عشق کی مشعل برداریاں، وقار علم کی محرابیں، روحانیت کے انوار کا سمندر، افکار کے سنگم پر مجتمع ہو جائیں اور ہر خوبصورت فقرے کے حرف اول کو شوق وصل کا عرفان حاصل ہو جائے تو لاہور کے چہرے کا حسن نمایاں ہو جاتا ہے۔

یہ شہر رام چندر کے بیٹے نے آباد کیا ہو یا اس سے پہلے اس کی بنیاد رکھ دی گئی ہو، لاہور اپنی تابانیوں کے عروج و زوال کے سفر پر رواں دواں رہا۔ یونانیوں، غزنویوں، تاتاریوں، غلاموں، سکھوں اور انگریزوں کی یلغار کے وار سینے پر سہتا رہا مگر اس شہر کی عظمتوں کے چراغ کبھی گل نہیں ہوئے بستیاں آباد ہوتی رہیں، عبادت گاہیں تعمیر ہوتی رہیں، درسگاہوں کے چاند روشن ہوتے رہے حسین عمارتوں سے تعمیراتی حسن فن کے ستارے بکھرتے رہے۔ مشائخ باصفا جسمانی فنا سے بقا کی منزلیں طے کرتے رہے ان کی مدفنوں سے پھوٹنے والی کرنیں روحانیت کے موتی بکھیرتی رہیں۔ ان کے آستانے مرجع خلائق بنتے رہے۔ مسجدوں، مندروں اور گوردواروں، کلیساؤں کے مینار، گنبد اور برجیاں عروج و زوال کی آندھیوں میں، ظلمت و نور کی مسندوں پر بیٹھی رہیں اور صلیبوں پر چڑھتی اور اترتی رہیں مگر لاہور کے گلی کوچوں

اور بازاروں سے اٹھنے والے قہقہے، دلوں کے آنگنوں سے ٹکراتے رہے اور محبتوں، وفاؤں اور اپنی خوبصورت روائتوں کے ٹھنڈے سائے میں ہمتوں کے قافلوں کی صدا اٹھتی رہی قدم بڑھتے رہے، گجر بجتے رہے، ہنگاموں کے طوفان اٹھتے رہے۔ خون آشامیوں کی ہوا چلتی رہی، باغات اجڑتے رہے، بستے رہے مگر اس شہر کی عزت وعظمت کا سورج کبھی غروب نہ ہوا۔ اس شہر میں حسن کے سورج کبھی نہیں ڈوبے۔ لاہور کے پانی اور مٹی میں محبت کے اجزاء جس کثرت سے پائے جاتے ہیں، دوسرے شاید ہی کسی خطے کے حصے میں آئے ہوں، ہر آس لے کر آنے والا، ہر بے سہارا، بے کار، علم کا پیاسا، محبتوں وچاہتوں کا متلاشی، اس شہر کی گود میں پرورش پاتے رہے، پلتے رہے، سیراب ہو کر چلے جاتے یا ہمیشہ کے لیے اسی شہر کے ہو کر رہ جاتے۔ یہاں روحانیت کے دریا بھی بہتے ہیں اور تشنہ کام صبح وشام سیراب ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ مادیت کے پرستار زروجواہر کی جھولیاں بھر بھر کر لوٹتے، سیدھے سادھے، ذہین لوگ مقدر کا کورا کاغذ لے کر دیہاتوں سے آتے اور سر، خان بہادر، رائے بہادر اور سردار بہادر، ڈاکٹر آف فلاسفی جیسے عظمتوں کے سنہرے حروف قسمت کے کورے کاغذ پر لکھا کر لے جاتے۔

اور ایسا بھی ہوتا کہ ماجوں اور ساجوں کے اِس شہر میں پردیسی محبتوں کے داغ دے کر بھی چلے جاتے۔ اس شہر پر جن رحمتوں کا سایہ ہے وہ براہ راست مکے اور مدینے کی فضاؤں سے نور ونکہت کے خزا لے کر آتی ہیں۔ گرونانک کے واحدنیت کے اجالے امرتسر اور پنجاب کے اطراف وجوانب میں اپنے دام پھیلائے ہوئے ہیں۔ متھرا، گنگا وجمنا کے کنارے سے اٹھنے والے ٹھنڈے سانسوں کی مہک لاہور کے مندروں کی کلیسوں کے قدموں میں پھول بکھیرتی رہی۔ لاہور کے بلند بام کلیساؤں کے سینے میں ابن مریم کے اعجاز کو دیواروں پر آویزاں صلیبوں کی دل دوز صداؤں سے سوز وگداز کے ترانے پھوٹتے ہیں مگر یہ شہر خود ایسا پھول ہے، جس کی خوشبو سے صدیوں کے چہرے مہک رہے ہیں سینے کی دھڑکنوں سے خوشبو کے کارواں چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت کے ماحول کی عکاسی کی جائے تو حسن فطرت کے خارجی ماحول کی ہر سانس سے خوشبوؤں کے چشمے پھوٹ پڑیں اور شہر کے داخلی ماحول کے سینے سے حقیقتوں کی روشنی میں سادگی اور حیا کے خوبصورت چہرے دکھائی دینے لگیں۔

بجلی کی روشنی ابھی شہر کے اندر نہیں آئی تھی، گلیوں اور بازاروں میں گیس اور لیمپ جلتے تھے۔ بازاروں میں لکڑی کے لمبے لمبے پول لگے ہوتے تھے، میونسپل کمیٹی کے ملازمین سرشام سارے شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں میں پھیل جاتے۔ گلیوں میں مٹی کے تیل کے بڑے بڑے خوبصورت لیمپ جلتے تھے۔ کمیٹی کا عملہ کندھے پر ایک چھوٹی سی سیڑھی اٹھائے ہوتا، اسے لگا کر لیمپ میں تیل ڈالتا اور اسے جلا دیتا۔ لکڑی کے پول پر ایک بڑی قندیل کے اندر لیمپ رکھتے ہوتے، چاروں طرف شیشے کی چار کونوں والی قندیلیں ایک مقررہ فاصلے اور گلیوں کے موڑوں پر لگی ہوتی تھیں۔ بازاروں میں اونچے اونچے لکڑی کے پول تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے ہوتے۔ کمیٹی کا آدمی آتا، بچوں کی پہنچ سے اونچی ایک گراری لگی ہوتی جسے گھما کر گیس بھر کر شیشے کی گول چمنی والے اس بڑے گیس کی گراری کو گھما کر اوپر کر دیتا کہیں کہیں یہ گراری پول کے ساتھ ایک لکڑی کے ڈبے میں بند ہوتی جسے چھوٹا سا تالا بھی لگا ہوتا۔ گھروں میں لوگ لالٹین، لیمپ، مٹی کے تیل کے دیئے اور کڑوے تیل کے دیئے جلاتے۔ امیر لوگوں کے گھروں میں خوبصورت قندیلوں میں گیس لیمپ روشن ہوتے تھے۔ مسجدوں میں کڑوے تیل کے چراغ جلتے تھے، یہ تیل محلے کے لوگ ڈال آتے۔ مسجدوں میں چھوٹی چھوٹی محرابیں دیواروں میں بنی ہوتی تھیں جن میں مٹی کے بنے ہوئے لوٹے یا کوزے پڑے ہوتے۔ مسلمان محلوں کے لوگوں نے مسجد میں چراغ جلانے کی منتیں مانی ہوتیں وہ کڑوا تیل ان میں ڈال جاتے۔ اس طرح مسجدوں کو روشن رکھا جاتا۔ مندروں میں بھی روشنی کے انتظامات اسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مزاروں اور سمادھیوں پر بھی اس طرح چراغاں ہوتا تھا۔ میلادالنبیؐ، معراج شریف، شب برات، عروس اور دیگر اسلامی تہواروں پر، مٹی کے چھوٹے چھوٹے دیئے جلا کر چراغاں کیا جاتا یا موم بتیاں جلائی جاتیں۔

دیوالی پر سارا شہر چراغاں سے جگمگا اٹھتا۔ جنم اشٹمی، لوہڑی، دوسہرا جیسے تہواروں کے علاوہ میلوں ٹھیلوں پر بھی لوگ چراغاں کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش پر اندرون لاہور کے عیسائی بھی چراغاں کرتے البتہ گرجوں کے اندر کہیں کہیں بڑی بڑی موم بتیاں رات کو روشن کی جاتیں۔ مطالعہ کرنے والے طالب علم اور دوسرے لوگ بھی مٹی کے تیل کے لیمپوں یا کڑوے تیل کے دیئے جلا کر ہی مطالعہ کرتے مگر ان لوگوں کے گلے اور ناک سے

صبح کھنکاڑنے سے تھوک کے ساتھ سیاہی آتی رہتی۔ تہواروں میں سب لوگ مل جل کر شرکت کرتے۔ ہندو، مسلم فساد بھی ہوتے اور ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت بھی کرتے، دوستوں میں تحفے تحائف کے تبادلے بھی ہوتے۔ انفرادی طور پر ہندو اچھے دوست بھی تھے، اجتماعی طور پر متعصب تھے۔ ہندو گھروں میں، ذہنوں میں، دلوں میں ظاہری اور باطنی طور پر چھوت چھات پر سختی سے کاربند تھے۔ اس کے باوجود انسانی فطرت کی سطح پر، روحانی اور جسمانی محبتوں اور چاہتوں کے سلسلے میں چھوت چھات اور پاکیزگیوں کی سب دیواریں مسمار ہو جاتیں سب پردے چاک ہو جاتے۔ عجیب ماحول تھا، اچھا بھی تھا اور برا بھی تھا اور لوگوں کو یاد بھی آتا ہے۔

لاہور دنیا میں ایک منفرد شہر ہے۔ لاہور میں صدیوں سے آباد لوگوں کا اپنا ایک مزاج ہے، اپنا منفرد کلچر ہے، رہنے سہنے کا ایک پیارا انداز ہے، عزت و آبرو کے جذبوں میں اپنا جداگانہ ڈھنگ ہے زبان و بیان میں اپنا ایک خوبصورت رنگ ہے، ہنسی مذاق کے انداز، لباس، خوراک اور چال ڈھال کے اپنے انداز اپنا وقار اور اپنے جذبات ہیں۔ غیرت، ناموس، ہمدردی، انس، محبت اور دوستی کا اپنا ایک الگ خوبصورت انداز ہیں، حتیٰ کہ مادیت اور روحانیت میں اشتہا اور سوز و گداز کا بھی عجیب اور والہانہ انداز ہے، مہربانی، مہمانی اور مخیرّانہ سلیقہ بھی منفرد ہے۔ اس شہر کے اصلی لوگ صرف عورت مرد کے افسانوی اور رومانوی انداز میں ہی عشق، محبت کے تصور پر ہی مٹنے والے نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر محبت کا جذبہ بھی ان کے اندر موجزن ہے۔ یہاں کسی دوست کی جدائی میں بھی آنسو بہانے والے ہیں، ایسا بھی تھا کہ کسی مسلمان نے کسی ہندو عورت کو یا کسی ہندو نے کسی مسلمان عورت کو بہن کہا تو عمر بھر اس کا پالن کیا۔ تحفے تحائف تہواروں پر اور شادی پر باقاعدہ بہن کا بھائی بن کر حق ادا کیا، اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا کیونکہ مرد اور عورت کے فطری جذبوں اور محبتوں میں مذہب و ملت اور سماجی پابندیوں کی دیوار ازل سے ہی ریت کی دیوار ثابت ہوتی رہی ہے مگر اس راستے میں کردار کی مضبوطی، ضبط اور ننگ و ناموس کے تحفظ میں بھی توفیق خداوندی شامل ہوتی ہے کیونکہ اس شہر کے لوگ صحت کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس لیے بھی جسمانی سرحدوں کی حفاظت کا رجحان زیادہ مضبوط ہوتا تھا، ورزش کا شوق اور موسیقی سے وابستگی اس شہر کی روایت تھی۔ سر کے مارے ہوئے لوگوں میں

محبت اور وفا کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ علم و ادب میں اس شہر کو صدیوں سے ایک دریا کی سی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جس کی تہہ میں ایسے ایسے گوہر نایاب پائے جاتے ہیں جن کی روشنی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ماند نہیں پڑی۔ عالموں اور فاضلوں کے اس شہر کو مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پنجاب ہی نہیں برصغیر کے اطراف و جوانب سے علم و فن کی روشنی بکھیرنے والے اس شہر کی جانب کھنچے چلے آتے تھے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ علم و فن کی ذہن و دل میں جو چنگاریاں دبی ہوتی تھیں ان کی اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں شعلوں کی صورت اسی شہر کی فضاؤں میں نور افشانیاں کر سکتی تھیں، یہ شہر اپنی دلفریبیوں اور حسن کے اعتبار سے بھی اس خطے میں سبد گل کی حیثیت رکھتا تھا۔

عمارتوں کا حسن، باغات کا حسن، چہروں کا حسن، انسانی وجاہتوں کا حسن، غرض اس شہر نے ہر حسن اپنے اندر سمو رکھا تھا۔ شہرتوں اور ناموریوں کے چراغ جلتے تھے، ہر فن اور ہر ہنر اور ہر شعبہ زندگی کے در و بام پر چراغاں کرنے والوں کی داستانیں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔ پہلوانی کا شوق اس وقت جنون کی حد تک تھا، چھوٹے بڑے بچے بوڑھے تمام اس شوق سے سرشار تھے۔ پہلوانوں میں خوراک کے سلسلے میں خاص ذوق تھا، ویسے تو یہ شہر خوش خوراکی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ بڑے پہلوانوں کی خوراک خاصی مہنگی تھی۔ ان کی سردائی میں بیسیوں قسم کے طاقتور اجزاء ہوتے تھے۔ اس دور کے لحاظ سے اس سردائی پر کافی خرچ ہوتا تھا۔ بڑے پہلوان تہجد سے پہلے اٹھتے۔ قریباً دو ہزار ڈنڈ اور دو ہزار بیٹھک لگاتے اور سورج نکلنے سے پہلے اپنے تمام معمولات ختم کر لیتے۔ صبح و شام اکھاڑے میں بسر کرتے اور استادوں اور خلیفوں سے استفادہ کرتے، بڑے پہلوان اکھاڑوں میں خاص خاص مواقع پر آتے، خاص طور پر جب کوئی بڑا دنگل قریب ہوتا۔ آج جس انداز میں بچے، جوان اور بوڑھے کرکٹ، فلموں اور ٹی وی پروگرام پر باتیں کرتے ہیں رائے زنی کرتے ہیں دلچسپی لیتے ہیں۔ اسی طرح اس شہر کے بچے جوان اور بوڑھے پہلوانی، دنگلوں اور پہلوانی کے داؤ پیچ پر اظہار خیال کرتے تھے۔ یہ تبادلہ خیال، یہ بحث مباحثے کہاں ہوتے تھے؟ دوست ہمجولی کہاں ملتے تھے کہاں اکٹھے ہوتے تھے؟ دن کے وقت نوجوان تو کاروبار اور کام کاج میں لگے رہتے۔ بچے سکول چلے جاتے البتہ بوڑھے لوگ وہاں ٹکڑیوں میں بیٹھتے، مختلف ٹولیوں میں بیٹھتے۔ شہر کے باہر، دروازوں کے باہر

خوبصورت باغات میں، خوشبودار پھولوں کے پودے، اونچے اونچے گنجان ٹہنیوں والے سایہ دار درخت، سبز گھاس پر چٹائیاں، نہر سے کچھ دور ہٹ کر یہ بزرگ بیٹھتے کیونکہ نہر پر کپڑے دھونے والی خواتین کا قبضہ ہوتا تھا یا بچے نہر میں نہاتے چھلانگیں لگاتے تھے۔ بزرگوں کی ایک ٹولی کے درمیان حقہ کی مدھم گڑگڑ کی آواز، کسی ٹولی کے قریب سردائی گھوٹنے والا کونڈا اور ڈنڈا۔ کونڈا مٹی کا ہوتا کچھ چوپٹ، پاشہ اور تاش والوں کی ٹولیاں مگر کچھ ٹولیاں ایسی تھیں جہاں رونق کچھ زیادہ ہوتی وہاں یا کوئی بزرگ ہیر پڑھ رہا ہوتا یا یوسف زلیخا، سیف الملوک، یا گل بکاؤلی ایک آدمی پڑھ رہا ہے اور چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے کوئی دردناک مقام ہے تو سامعین رو رہے ہیں، آہیں بھر رہے ہیں، پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھ رہے ہیں، ناک صاف کر رہے ہیں، رقت آمیز منظر ہوتا، راہ گیر کھڑے ہو جاتے۔

ایک مرتبہ بھاٹی دروازے کے باہر اکھاڑا گھروشاہ کے قریب اسی نوعیت کا دردناک منظر تھا۔ ایک بزرگ ترنم سے پڑھ رہا تھا اور سارا مجمع رو رہا تھا۔ سسکیوں کی آوازیں اٹھ رہی تھیں ٹھنڈی آہیں بھری جا رہی تھیں۔ باغ کے درمیان لوگ چھوٹی سڑک پر آ جا بھی رہے تھے۔ رونے والوں میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر ناک صاف کرنے آیا ایک راہ گیر نے پوچھا، بابا جی! کیا ہو گیا ہے، سب لوگ کیوں رو رہے ہیں؟ بابا جی نے روتے ہوئے کہا یار شہزادہ تاج الملوک اور گل بکاؤلی کو دیوؤں نے قید کر لیا ہے ہمالہ دیونی بھی رو رہی ہے راہ گیر بھی آہ بھر کر چلا گیا۔

شہر کی فصیل تو بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ دروازے اپنے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھے اور شہر کا سارا حسن بیرونی باغات میں سمٹ کر آ گیا تھا۔ باغات کے درمیان چھوٹی سڑک تھی اس کے دونوں جانب سبزے کی پٹی سارے شہر کو آغوش میں لیے ہوئے تھی۔ شہر والوں میں غریب طبقہ کو ایک سہولت یہ بھی تھی کہ نہر بارہ ماہ جاری رہتی، اس میں صبح سویرے بچے بوڑھے جوان نہا لیتے ہاتھ منہ دھو لیتے، پانی زیادہ گندہ نہیں ہوتا تھا اور نہر کی صفائی بھی ہوتی رہتی تھی، پھر دن میں اس نہر پر عورتوں اور بچوں کا راج ہوتا تھا۔ عورتیں کپڑے دھوتی تھیں، بچے نہاتے تھے، جب عورتیں کپڑے دھوتیں اور انہیں ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کے ڈنڈوں سے کوٹتیں تو ٹھک ٹھک کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی دوسرے بیبیوں کی اپنی دکھ سکھ کی باتیں بھی چلا چلا کر اسی موقع

پر ہوتیں اور کبھی کبھی یہ ڈنڈے کپڑوں سے ہٹ کر آپس میں بھی چل جاتے تھے۔ دو تین بجے کے بعد عورتیں چلی جاتیں کیونکہ پھر آدمیوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی تھی۔ انہی باغوں میں بچے پل گولی، اخروٹ، کوڈیاں، گلی ڈنڈا اور لٹو گھمانے کے کھیل بھی کھیلتے تھے۔ دن ڈھلے اکھاڑوں کی رونقیں بڑھ جاتیں، شام کے وقت منڈوے پر لوگ آنے جانے شروع ہو جاتے۔ منڈوے یا سینما بھاٹی گیٹ کے باہر زیادہ تھے یا ہیرا منڈی میں دو سینما تھے یا پھر میکلوڈ روڈ پر تھے خاموش فلموں کا دور تھا اس لیے ان پر زیادہ لے دے نہیں ہوتی تھی۔ شام کے بعد زیادہ تر لوگ تھڑوں پر بیٹھتے، حماموں میں بیٹھتے، تھڑوں کی زندگی اس شہر میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ شام کے بعد نوجوان تھڑوں پر بیٹھ کر دنیا بھر کی باتوں پر تبادلہ خیال کرتے، انہی تھڑوں پر دوستیاں اور محبتیں پروان چڑھتیں، انہی تھڑوں سے دشمنیاں اور لاگ ڈانٹ کے شعلے پھوٹتے۔ لوگ لمبی چوڑی ہنگامہ آرائیوں کے بجائے پرسکون ماحول کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ سردیوں میں حماموں کی رونقیں بڑھ جاتیں۔ بیت بازی، شعر و شاعری گانا بجانا، داستان گوئی، تھیٹریکل کمپنیوں کا دور تھا۔ اس لیے تھیٹر کے ڈائیلاگ بولے جاتے اور گانے گائے جاتے، رات آدھی سے زیادہ گزر جاتی، تھڑوں اور حماموں کی رونقیں ختم نہ ہوتیں دکانیں صبح کی اذانوں تک کھلی رہتیں۔ ایک دو بجے منڈوے ٹوٹتے تو دکانداروں کی بکری خاصی بڑھ جاتی اگر کوئی پچیس پارٹ کی لمبی اور مسلسل فلم چلتی تو صبح تک چلتی رہتی۔ شہر ساری رات کھلا رہتا رات کسی وقت بھی آنے جانے والوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا تھا۔ بھاٹی دروازہ، لوہاری دروازہ، شاہ عالمی دروازہ، موچی، یکی، مستی، شیرانوالا ہر دروازے کے لوگ سینما گھروں کے علاوہ ہیرا منڈی کی جانب زیادہ آتے جاتے تھے۔ گیتی تھیٹر اور عزیز تھیٹر کی رونق ہیرا منڈی کی اپنی رونق، گندی گلی کی رونق لوگ بڑی سہولت سے، آزادی سے ہر کام کرتے گھومتے پھرتے۔ منٹو پارک، حضوری باغ، شہر کے باہر باغات میں قریباً آٹھوں پہر چل پہل رہتی۔

صبح سے پہلے لاہور میں ایک عجیب سماں ہوتا، ایک رومانی کیفیت ہوتی ویسے تو لوگ رات بھر پھرتے پھراتے رہتے مگر جو جلدی سونے کے عادی تھے وہ رات دو تین بجے جاگ اٹھتے۔ گلیوں بازاروں کوچوں اور باغوں میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ جاتا مسلمان خدا کا نام لیتے ہوئے مسجدوں کو جا رہے ہوتے۔ ہندو رام رام کرتے ہوئے دریا کی جانب رواں

رواں ہوتے، ہندو مرد عورتیں سب منہ اندھیرے دریا پر جاتے، اشنان کر کے پاپ جھاڑتے۔ اذان شروع ہو جاتی، مندروں میں گھنٹیاں اور سنکھ بجنا شروع ہو جاتے کچھ ہندو گھر پر نہاتے وہ پانی استعمال کرنے میں بھی بخیل سے کام لیتے، پانی کم ڈالتے رام رام زیادہ کرتے۔

دریا پر جانے والی ہندو خواتین بھی بوڑھی عورتیں زیادہ سویرے اٹھ کر دریا پر جاتی تھیں ان کے ہاتھ میں پیتل کی گڑویاں ضرور ہوتیں ان میں پانی بھر کر لاتیں اور گھروں میں چھڑک کر ہندو انہیں پوتر کرتے یعنی پاک کرتے۔ اندھیرے میں اگر کسی بوڑھی ہندو عورت کو معلوم ہو جاتا کہ کوئی مسلمان گزر رہا ہے تو وہ دور ہٹ کر کھڑی ہو جاتی چھوت چھات کا یہ انداز بھی تھا اکثر ہندو عورتیں صبح سیاہ صوف کے گھگھوے پہنتی تھیں، پو پھٹنے سے پہلے دریائے راوی پر میلہ سا لگ جاتا اکثر نظر بازوں کی ٹولیاں بھی دریا پر پہنچ جاتیں پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ عورتوں کے نہانے کے لیے دریا کنارے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا جہاں ہندو عورتیں آزادی سے نہا لیتیں۔

اس کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی رات کے آخری پہر میں اٹھ بیٹھتا۔ یہ منڈی جانے والے مزدور اور سبزی فروش تھے ان کی زبانوں پر بھی ایک دل میں اتر جانے والی آواز ہوتی، ایک صدا ہوتی۔ خاص پاکیزہ الفاظ ہوتے وہ آوازیں بھی بستر میں دبکے ہوئے لوگوں کے دلوں میں رس گھولتیں۔ سب دا بھلا، سب دی خیر۔ انہی الفاظ کے ساتھ ٹوکری اٹھائے دروازوں کے باہر پہنچ جاتے، وہاں جو یکوں، رہڑوں یا ٹمٹموں پر جانا چاہتے ان پر بیٹھ کر منڈی جاتے، اس طرح ایک پاکیزہ ماحول صبح کے جھٹ پٹے میں پیدا ہو جاتا۔ ان کے علاوہ ایک طبقہ اور تھا جو منہ اندھیرے اٹھتا وہ فقیر اور بھکاری تھے۔ صبح کے وقت گلی کوچوں میں ان کی آوازیں بھی سننے کے قابل ہوتیں۔ ہندوؤں اور مسلمان بھکاریوں کے علیحدہ علیحدہ سلوگن تھے ہندو بھکاریوں کا ہر دن کے ساتھ علیحدہ سلوگن ہوتا تھا۔ جیسے ''منگل دی وارائے ڈھلے سریوں بھارائے'' چھنچھر وار (سنیچر) اتوار، سوموار، منگل، بدھ، ویروار اور شکروار۔ منگل کو زیادہ کڑوا تیل مانگتے، یہ آواز بھی آتی تیل تانبے دی آواز اے۔ ڈھلے سریوں بھارائے) یعنی تیل اور تانبے کے پیسے دان کرو بلا ٹل جائے گی۔ ہندو بھکاری مندروں کے باہر بھی ہوتے تھے۔ مسلمان صبح کے وقت کم اور شام کو زیادہ گلی کوچوں میں مانگتے تھے۔ ایک بوڑھے کی صبح کے وقت

آواز ہوتی تھی، (تینوں غافلا جاگ نہ آئی وے چڑیا بول پیاں) مسلمان بھکاری رات کو گلی کوچوں میں روٹی مانگتے تھے ان میں زیادہ تر پردیسی ایسے بھی ہوتے تھے جو دن میں مزدوری کرتے تھے اور رات روٹی مانگ کر کھاتے۔ مشہور تھا کہ ان لوگوں کے خط آتے ہیں تو ان میں یہ تاکید لکھی ہوتی ہے کہ (دھاڑ لگے نہ لگے پننے دا چارا کرنا) یعنی اگر دھاڑی نہ لگے تو نہ سہی بھیک مانگنے کی طرف توجہ دینا۔ بھیک مانگنے والوں میں اس وقت بھی ڈرامے باز اور چھری مار زیادہ تھے۔ شہر کے لوگوں کا دل ایسا نرم تھا کہ تنگ دست لوگ بھی خیرات دے دلی سکون محسوس کرتے تھے۔ دن میں بھی صبح سے شام تک عجیب ڈھنگ کے بھکاری بہروپیئے اور ڈرامے باز بازاروں اور گلی کوچوں میں بلند آواز سے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ ہندوؤں میں قطار باندھ کر بڑی لے تال میں بھیک مانگتے، سیکڑوں ڈھنگ اور سیکڑوں روپ کے لوگ تھے مگر لاہور کی آغوش ہر آنے والے حاجت مند کے لیے کھلی رہتی تھی۔

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے آستانے پر ہمیشہ سے لنگر جاری ہے، سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ اسی لنگر سے پیٹ بھرتے ہیں۔ اس طرح کے لنگر ہندوؤں نے بھی کھول رکھے تھے۔ سکھ عطر فروشوں کی مشہور دکان تھی ''بھائیوں کی دکان'' ان کی دکان پہلے شہر کے اندر ڈبی بازار میں تھی پھر روشنائی اور نوگزے پیر کی مزار کے پاس ان کی دکان آ گئی یہاں ایک بڑی بلڈنگ میں ان کا کاروبار تھا، ان کے ہاں بھی لنگر جاری رہتا تھا۔ ویسے تو لاہور میں ہر روز کوئی نہ کوئی میلہ ہوتا یا کسی بزرگ کا عرس ہوتا۔ اس طرح شہر میں ہر قوم کے لنگر بارہ ماہ جاری رہتے۔ آخری چہار شنبہ کو جگہ جگہ نذر نیاز پکتی، خاص طور سے موچی اور شاہ عالمی کے درمیان ایک سو دیگیں بریانی کی پکتی تھیں۔ خلق خدا صبح سے شام تک کھاتی تھی لیکن لنگر ختم نہیں ہوتا تھا۔

نذر و نیاز کے سلسلے مدتوں سے جاری ہیں۔ محرم پر دس دن تک شیعہ، سنی دل کھول کر نیاز دلاتے، کچی ٹھوٹھی کا زیادہ رواج تھا، دیگیں پکتیں، امامین کا ختم گھر گھر دلایا جاتا۔ شیعہ نواب بڑے فراخدل تھے، تعصب نام کو نہ تھا ہر فرقے کا مسلمان ان کے ہاں سے کھانا کھاتا، سبیلیں نو اور دس محرم کو لگتیں۔ دسویں محرم کو ہندو بھی سبیلیں لگاتے۔ رائے بہادر رام سرن داس محر پر اکثر لال کوٹھی کے باہر سبیل لگاتے تھے۔ داتا دربار والی سڑک سے لے کر کربلا گامے شاہ تک لال کوٹھی تھی، ساتھ ہی میلا رام ملز تھیں، یہ سوتی کپڑے کی بہت بڑی مل تھی، سیکڑوں مزدور اس میں

کام کرتے تھے۔ میلا رام کا خاندان شہر کے بڑے رئیسوں میں شامل تھا۔ نیڈو ہوٹل، جہاں اب واپڈا ہاؤس ہے اور فلیٹی ہوٹل کے سامنے بھی تمام جائیداد میلا رام کے خاندان کی تھی۔ میلا رام کے بیٹے رائے بہادر رام سرنداس کے بیٹے روپ چند کی شادی ہوئی تو کئی دن تک لال کوٹھی میں جشن کا سا سماں رہا۔ رائے بہادر رام سرنداس نے موسیقی کی محفل میں فارسی کی غزلیں سنیں۔ کراؤن سینما بھی ان کا تھا۔ بھاٹی گیٹ کے اندر بہت سی جائیدادیں ان کی تھیں، یہ خاندان بھی متعصب نہیں تھا۔ اکثر مسلمانوں سے میل ملاپ تھا، ملازم بھی بہت سے مسلمان تھے، اب لال کوٹھی کی جگہ حزب الحناف کی تحویل میں ہے۔

عشرہ محرم پر دس دن تک مسلمان مل کر بڑی عزت و احترام سے مناتے۔ تعزیئے، چار چار پانچ منزل کے ہوتے تھے، کیونکہ بجلی شہر کے اندر نہیں تھی، اس لیے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی پھر جب بجلی شہر کے اندر آ گئی تو تعزیے اتنے اونچے ہی بنائے جاتے جو بجلی کی تاروں سے نہ ٹکرائیں۔ اس وقت گھوڑا صرف ایک ہی نکلتا تھا شہر کے اندر بجلی ۲۴۔۱۹۲۳ء تک آ گئی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں سارا اندرون شہر بجلی سے جگمگ کرنے لگا، شہر کی آبادی زیادہ نہیں تھی، اس لیے رہائشی مکانوں کی خاص قلت نہیں تھی، بلکہ کئی مالک مکان مفت غریبوں کو مکانوں میں رکھتے تھے تاکہ مکان آباد رہیں۔ ایک روپیہ یا دو روپیہ ماہانہ کے مکان بڑی آسانی سے مل جاتے تھے، گلیاں تنگ اور مکان چھوٹے تھے، کئی خاندانوں کے افراد زیادہ تھے۔ غریب بیشتر ایک ایک کمرے کے مکانوں میں گزارہ کر لیتے تھے، مگر ایک صورت یہ تھی کہ نیچے ایک چھوٹی چارپائی اس کے اوپر بڑا پلنگ یا چارپائی بچھا کر اوپر دو تین چارپائیاں مضبوطی سے رکھ لی جاتیں، سب سے اوپر والی چارپائی مضبوط رسے سے چھت کے شہتیر سے باندھ دی جاتی تاکہ گرنے کا احتمال نہ رہے کئی غریب خاندانوں میں جگہ کی تنگی کا ازالہ اس طرح بھی کر لیا جاتا، غریبوں کی راتیں یوں بھی گزرتیں تھیں پھر بھی لوگ مطمئن تھے۔

امیر اور رئیس لوگ بڑی بڑی حویلیوں، کوٹھیوں اور کئی کئی منزلہ عمارتوں میں عیش ونشاط کی زندگی بسر کرتے تھے، بڑے کاروبار والے لوگ، ملوں اور فیکٹریوں کے مالک بھی تھے۔ شہر کے چاروں طرف پھلوں کے باغ تھے۔ کھیتوں کی بہار شہر کے چاروں طرف تھی، کنوؤں سے زیادہ تر آبپاشی ہوتی تھی۔ میاں میر نہر سے چھوٹے چھوٹے سوئے اور کھالیں نکال کر بھی کھیتوں کو

پانی دیا جاتا تھا۔ شہر کے چاروں طرف زرعی زمینیں تھیں، پھلوں اور پھولوں کے باغات تھے، دریا کے آر پار گھنے جنگل تھے، بھنگ کے پودے حد نظر تک دکھائی دیتے، ان جنگلوں میں رات کو چوروں اور ڈاکوؤں کا راج ہوتا تھا، ان کی کئی خوفناک کہانیاں بھی مشہور تھیں مگر یہ بات بالکل سچی تھی کہ شام کے بعد ان راستوں سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ باغبانپورہ، کوٹ خواجہ سعید، چاہ میراں، سلطانپورہ یہ سب دیہات تھے، ہر طرف کھیت ہی کھیت تھے اور چھوٹی چھوٹی کچی سڑکیں تھیں۔ یکے اور تمٹمیں سواریاں بٹھا کر لاتے تھے، ان علاقوں کو شہر کا درجہ اس وقت زیادہ تر حاصل ہوا، جب مغلپورہ میں ریلوے ورکشاپیں بن گئیں، انجن شیڈ بن گیا، ورنہ گڑھی شاہو بھی شہر میں شامل نہیں تھی۔ دوسری طرف پیر مکی کے پاس عیسائیوں کا قبرستان تھا۔ اس سے آگے دریا تک کھیت اور گھنے سرکنڈے تھے، جن میں رات کو گیدڑوں کی بھیانک چیخیں سنائی دیتی تھیں، درمیان میں ایک چھوٹا گاؤں تھا گنج۔ اس کے گرد بھی باغ کھیت اور کنوئیں تھے۔ ہندوؤں کے مردے جلانے کا مرگھٹ تھا۔ موہنی روڈ کی آبادی کوئی نہیں تھی۔ دریا تک بھیانک سا ماحول تھا، اس طرف لوگ دن کو بھی نہیں آتے تھے۔ سانده، نواں کوٹ دور دراز کے گاؤں تھے۔ اچھرہ اور مزنگ بھی قصبے تھے۔ نہ ماڈل ٹاؤن تھا، نہ گلاب دیوی ہسپتال تھا، نہ ایئر پورٹ تھا۔ میلوں تک بھیانک اور خوفناک جنگلات تھے، درمیان میں ایک گاؤں تھا بھابھڑے۔ راستے خوفناک تھے۔ کافی دور ایک گاؤں تھا کوڑے۔ والٹن ٹریننگ سکول بننے کے بعد یہ علاقے آباد ہوئے۔ صدر اور چھاؤنی کا علاقہ آباد ہوا تو یہ علاقہ بھی بارونق ہو گیا۔ دریا کے نزدیک سرکنڈوں میں کئی مرتبہ بڑے بڑے سانپ اور کبھی ایک آدھ بھیڑیا بھی آ جاتا تھا۔ شاہدرہ بھی قصبہ تھا، اس کی رونق اور اہمیت مقبرہ جہانگیر، مقبرہ نور جہاں اور بارہ دری کامران کے باعث تھی، بارہ دری دریا کے پار کافی فاصلے پر تھی، اس کے چاروں طرف باغات اور کھیت تھے دریا کا رخ زیادہ تر شہر کے جانب تھا اکثر سیلاب کے دنوں میں نشیبی علاقے پانی میں ڈوب جاتے۔ ٹکسالی دروازے اور بھاٹی دروازے تک دریا کا پانی آ جاتا تھا لاہور کا شہر کافی اونچی جگہ پر ہے۔ شہر بسانے والوں نے پوری ذہانت سے شہر کو کافی اونچی جگہ پر بسایا ہوا ہے، البتہ بعد میں تعمیر کی گئی عمارتیں اور آبادیاں اکثر سیلاب کی زد میں آ جاتی تھیں۔ یہ بڈھا دریا بھی پرانے راوی دریا کے بہاؤ کی نشاندہی کرتا ہے طغیانی کے دنوں میں بڈھے دریا میں پانی کنارے تک

بہتا تھا اور کئی مرتبہ کناروں سے باہر بھی آ جاتا تھا، کئی مرتبہ کھیت ڈوب جاتے تھے، آہستہ آہستہ دریا نے اپنا رخ موڑ لیا اور دوسری طرف کنارے کٹ کٹ کر کامران کی بارہ دری دریا کے درمیان آ گئی۔ شہر کو بچانے کی ہر حکومت کوشش کرتی رہی مگر اب جو بند تعمیر ہے اس نے شہر کو بالکل محفوظ کر دیا ہے۔ ویسے بند مغلوں اور سکھوں کے دور میں بھی باندھے گئے مگر موثر ثابت نہیں ہوئے، اقتدار کے جھگڑوں میں فلاحی کاموں کی جانب کم دھیان دیا جاتا تھا، انگریزوں نے بھی اس جانب خاص توجہ نہ دی، انہیں قدم جماتے جماتے سو سال گزر گئے، پھر ہندوستان کے اندر سیاسی جماعتیں مضبوط ہو گئیں۔ دوسرے انگریز کو اس عرصہ میں دو عالمی جنگیں لڑنا پڑیں۔ ساری دنیا پر قابض ہونے کے باوجود بھی۔ دو بڑی جنگوں نے برطانوی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا۔ گو یہ دونوں جنگیں برطانیہ نے اپنے اتحادیوں کی مدد سے جیتیں پھر بھی ہندوستانی سپاہیوں نے انگریز کی فتح کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

دوسری جنگ عظیم میں خاص طور پر انگلینڈ کو جو نقصان، بمباری کے ذریعے نازیوں نے پہنچایا وہ ناقابل تلافی تھا مگر انگریزی قوم نے بڑے حوصلے، ہمت، بردباری، ایثار اور قربانی دے کر حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس جنگ کے بعد برطانیہ کی اپنی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ وہ ہندوستان جیسے برصغیر اور جنوبی ایشیا پر تسلط جمائے رکھنے کے قابل نہیں رہا تھا، اس لیے اسے ان علاقوں کو خالی کرنا پڑا۔ انگریز سے پہلے ہندوستان جدید ٹیکنالوجی اور سائنس سے کوسوں دور تھا، علم کا فقدان تھا۔ آئے دن کی جنگوں اور یلغاروں نے لاہور ہی کیا سارے ہندوستان میں ہلڑ بازی، لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ انگریز کے دور کو امن و امان کا دور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ انگریز نے جو کچھ ہندوستان کو دیا، وہ بھی بہت ہے، اس کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہے۔ انگریز کو تعصب سے ہٹ کر دیکھا جائے تو ایک ذہین، باصلاحیت، باسلیقہ، علم وفن سے مالا مال ہونے کے ساتھ بہادر قوم بھی تھی۔ وہ صرف ظالم دھوکے باز قوم ہی نہیں تھی، جنگجو بھی تھی، جدید سامان حرب کی موجد تھی۔ ہندوستان میں ریلوے، ڈاک، تار، عمارات، انصاف و قانون، تعلیم، انجینئرنگ، میڈیکل اور سب سے بڑھ کر انتظامی امور کی تمام مہارتیں ہندوستانیوں کو سکھا دیں۔ موٹر، موٹر سائیکل، بسیں، ہوائی جہاز نئی تہذیب و تمدن، ہندوستان کو انگریز نے دیا۔

ٹکسالی دروازے کے اندر بازار شیخوپوریاں اپنی قدیمی شکل وصورت میں تھا۔ عزیز تھیٹر کی باعث کافی رونق تھی، اس سے بڑھ کر رنڈیوں کی گندی گلی کے باعث لاہور کے سارے رنڈوے اور چھڑے سمٹ سمٹا کر یہاں آ جاتے، اس گلی میں بڑے بڑے ڈرامے ہوتے، جتنی بھیڑ اس گلی میں ہوتی تھیٹروں اور سینما گھرون کے باہر بھی اتنی رونق نہیں ہوتی تھی، بڑی بڑی حسین وجمیل لڑکیاں بکتی بکاتی دلالوں کے ہتھے چڑھ کر بالا خانوں کی زینت بن جاتیں، چند ہی سالوں میں ان کا رنگ روپ ختم ہو جاتا اور کسی نہ کسی جنسی بیماری کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے اندھیری کوٹھڑیوں میں سسک سسک کر مر جاتیں، کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ یہ عورت کہاں سے آئی تھی، کتنی جگہوں پر بکی کن بھائیوں کی بہن تھی، کس ماں باپ کی بیٹی تھی۔ بیشتر معاشرے اور حالات کی ستائی ہوئی عورتیں اس بازار میں اس گلی میں آتیں اور جسم فروشی کرتے کرتے مر جاتیں، جو بچ جاتیں، بوڑھی ہو کر طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہتیں۔ کوڑی کوڑی کو محتاج رہتیں اور اس کسمپرسی کے عالم میں بھی مجبوراً جسم فروشی سے گزراوقات کرتیں، اندھیری کوٹھڑیوں میں رہتیں، ایک مدھم سی لالٹین جلائے رکھتیں، اپنے تھڑوں پر اور کوٹھڑی کے سامنے پانی زیادہ چھڑکتیں۔ بالا خانے اور نچلے کمروں میں اگر بتیاں جلتی رہتیں۔ اس کے باوجود ایک عجیب قسم کی بدبو اور سڑاند اس گلی سے آتی رہتی تھی، اس گلی کی عورتوں کی جوانی بہت جلد ختم ہو جاتی۔ بھاٹی دروازے کے شرارتی لڑکے آتے ایک دم شور مچاتے ہوئے اس گلی میں داخل ہوتے، پولیس آ گئی پولیس آ گئی۔ چھاپہ، چھاپہ ایک دم افراتفری میں سب بتیاں بجھ جاتیں، دروازے بند ہو جاتے چالکے اور آنکھیں سینکنے والے سب بھاگ جاتے۔ کمزور اور بوڑھے تماش بین اکثر گر پڑتے، جوتے چھوڑ کر بھاگ جاتے، اکثر کی دھوتیاں کھل جاتیں، دھوتیاں ہاتھ میں پکڑے ہوئے بھاگ رہے ہوتے ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی بھاگتے ہوئے کی دھوتی گر گئی، شرارتی لڑکے دھوتی لے کر بھاگ گئے، پھر وہاں کے دلالوں کی شکایت پر وہاں پولیس کی گشت بھی جاری کر دی گئی، اس گلی میں ہر قسم کے لوگ آتے جاتے تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب آتے جاتے۔ کوٹھوں پر زیادہ تر پہاڑی علاقوں کی عورتیں ہی زیادہ ہوتیں۔ غربت کے مارے علاقوں سے بردہ فروش لڑکیاں اور عورتیں خرید کر لاتے، زیادہ عورتیں کشمیر کے دوردراز علاقوں سے لائی جاتیں، ان سب قباحتوں کے باوجود اس علاقے

نے شہر کی تمام غلاظتوں کو روکا ہوا تھا، پیسہ خرچ کرنے والے تماش بین آدھی رات کے وقت آتے تھے، اس وقت صرف آوارہ گردی کرنے والے چلے جاتے اور سینما کا آخری شو بھی ختم ہو جاتا گانے اور مجرے کا بازار الگ تھا، وہاں ناچ گانا سننے والے امیر لوگ ہی جاتے تھے۔ مغنیاؤں کے بالا خانوں میں شراب اور کباب کے دور کے ساتھ ناچ گانا رات گئے تک ہوتا، طبلے اور سارنگی کے ساتھ گھنگھروؤں کی چھنا چھن کی صدائیں اور نغموں کی محفلیں رات گئے قائم رہتیں لاہور کے بڑے بڑے رئیس اپنی دولت اس بازار میں ہی غرق کر کے خاک سیاہ ہو گئے۔ باہر سے راجے مہاراجے، نواب، امراء، لینڈ لارڈ بھی اس بازار کے انمول ہیروں کے ہی خریدار ہوتے تھے، کئی جاہ وجلال و کروفر سے طرے اور شملے بلند کیے آتے اور جوتیاں چٹخاتے ہوئے چلے جاتے، کئی رئیس، بائیوں کی چلمیں بھرتے بھی دیکھے گئے، ان کی بڑی عبرتناک داستانیں، ایک الگ بہت بڑا مضمون ہے۔ بہر حال اس بازار سے آواز کا جادو ہمیشہ سے اس انداز میں اٹھتا رہا ہے، جو دلوں میں اتر کر درد کے سمندروں میں طوفان برپا کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ یہ واقعی ہیروں کی منڈی ہے۔ اس کو ہیرا سنگھ نے آباد کیا یا مغل دور میں یہاں سچ مچ ہیرے فروخت ہوتے تھے کیونکہ یہاں مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے مسکن بالکل قریب تھے یا یہ کہ بالا خانوں میں بیٹھے ہوئے ہیرے جواہرات کے نام پر یہ ہیرا منڈی مشہور ہوئی، بہر حال اس بازار میں ایسے ایسے ہیرے جواہرات پلتے رہے اور صیقل یا پالش ہوتے رہے، جن کی ذہانتوں نے ہزاروں راجوں اور نوابوں کی اولادوں کو ادب، تہذیب اور آداب محفل کے سلیقے بتائے اور سکھائے، یہ ہیرے اور قیمتی پتھر ایسے ہیں، جن کی درد بھری آوازوں میں سوز بھری سروں نے یخ بستہ چٹانوں کو موم کر دیا، آنسوؤں کے سمندر بہا دیئے، آہوں کے لبوں سے شعلے بھڑکا دیئے مگر یہ خود ایسے قیمتی پتھر ہیں کہ جن پر چوٹ بھی پڑے تو صدا نہیں دیتے۔

ہیرا منڈی کے چاروں طرف کا ماحول اس قدر عجیب تھا۔ دریا سے لے کر بڈھے دریا اور بڈھے دریا سے لے کر ٹکسالی دروازے کے سامنے والی سڑک تک۔ کھیت اور کنوئیں تھے۔ شیخوپوریاں کے بازار کے عقب میں مغلوں کے دور کی ایک اونچی اور چوڑی دیوار تھی، جو خستہ ہو چکی تھی۔ اس کے آگے شاہی مسجد کے دامن تک کوئی عمارت کوئی سڑک نہ تھی۔ بارود خانے کے قریب کھائی تک سب کچی زمین تھی۔ قلعے کی سیڑھیوں تک سپاٹ اور ہموار

زمین تھی اور یہاں نوگزے پیر سے لے کر قلعے تک گھاس منڈی تھی۔گڈے کھڑے رہتے سبز چارااور گھاس کے ڈھیر لگے رہتے۔ یہ ریڑھے، گڈے اور ٹمٹمیں ایک کچی سڑک پر سے یہاں تک آتی تھیں۔ پانی والا تالاب، چونا منڈی اور اس طرف سید مٹھا بازار البتہ یہ آبادیاں تھیں، اس طرف کا علاقہ انتہائی خوبصورت تھا۔قلعہ شاہی کی فلک بوس دیواریں، حضوری باغ شاہی مسجد رنجیت سنگھ کی سمادھی، منٹو پارک، سارا قدرتی حسن اور خوبصورتی تو اسی علاقے میں سمٹ کر آ گئی تھی۔ دوسری طرف ٹبی تھانہ کی جگہ بہت کم تھی تحصیل بازار اس لیے کہلاتا تھا۔ تحصیلداروں کے دفاتر یہیں تھے۔ ٹبی تھانے والی یہ جگہ پر وسیع قطعہ میں تحصیلداروں کے دفتر تھے عمارتیں تو خستہ تھیں مگر رونق بہت رہتی تھی۔ قریباً ۱۹۲۳ء میں یہ دفاتر کچہری میں چلے گئے وہاں بھی انہیں کچی موٹی دیواروں والے کمرے ہی ملے، جہاں اب کچہری کی نئی خوبصورت عمارت بن چکی ہے۔ بازار حکیماں کی طرف سے آنے والا چوک بھی بارونق تھا۔ بازار لطیف جج، کٹڑی لطیف جج، آگے بھٹی ملاحاں اور اس کے آگے چومالہ کا علاقہ شروع ہو جاتا، جس کا تعلق بھاٹی گیٹ سے تھا، یہ ہیرا منڈی کا محلے وقوع تھا۔

ٹکسالی دروازے سے بھاٹی دروازے تک باغ سب سے زیادہ خوبصورت اور گنجان تھا، دورویہ مولسری کے درخت تھے۔ ننھے ننھے سفید پھول جن کی درمیان پیلی کٹوری سی ہوتی، ایسی مہک دیتے تھے کہ دل ودماغ معطر ہو جاتے تھے۔ گلاب کے پودے بھی تھے، بلند وبالا سایہ دار درخت بھی تھے نہر بھی بہتی تھی۔ پیراماؤنٹ سینما کوئی نہیں تھا۔ بھاٹی دروازے کے باہر بکر منڈی تھی، صبح سویرے یہاں بہت رونق ہوتی تھی، بکروں چھتروں کی خرید وفروخت ہوتی تھی دروازے کے باہر چوک تک منڈی کے سامنے زیادہ تر مٹی کے برتنوں کی دکانیں تھیں۔ مزنگ، اچھرہ اور دوسرے علاقوں کو یہاں سے جانے والے ٹمٹموں اور یکوں پر زیادہ جاتے تھے، شہر کے اندر یا باہر زیادہ تر لاہوری تانگے چلتے تھے۔ ان کی ہودیاں نیچی ہوتی تھیں، پشوری تانگہ کوئی کوئی تھا، ان میں زیادہ تر تماش بین یا امیر لوگ خاص طور سے بیٹھتے تھے۔ بھاٹی سے اسٹیشن تک کرایہ دو پیسے سواری تھا اس سے پہلے ایک پیسہ بھی تھا۔ صرف میلوں ٹھیلوں پر خاص طور سے میلہ چراغاں پر تانگوں کے کرائے بڑھ جاتے، تقریباً ہر دروازے کے باہر اسی نوعیت کی دکانیں ہوتی تھیں۔ ہر دروازے کے باہر اکھاڑ و ضرور ہوتا تھا، موچی دروازے کے باہر

چنے، مکھانے، مونگ پھلی وغیرہ کی دکانیں اسی دور سے آج تک ہیں۔ شاہ عالمی دروازے کے باہر مٹی اور چینی کے برتنوں کی دکانیں قدیم روایت کے مطابق ہی ہیں۔ لوہاری دروازے کے باہر زیادہ پھلیرے ہی ہوتے تھے موری دروازے کے باہر مچھلی کی دکانیں بھی اسی دور سے چلی آتی ہیں۔ دہلی دروازے کے باہر بارہ ماہ ایک میلہ سا لگا رہتا تھا ہر شے وہاں سے ملتی تھی۔ بچوں کے کھلونے بکتے، برتن، سبزی چنے، کباب، دودھ دہی ہر چیز ملتی تھی۔ یکی اور مستی کے باہر زیادہ تر گھاس منڈیاں ہوتی تھیں اور تانگوں کے اڈے تھے۔ تانگے دو روپے فی تانگہ مقررہ فیس کی علاوہ رشوت دے کر پاس کرانے پڑتے تھے، خاکی وردی، پگڑی اور پاجامہ ہر کوچوان کے لیے پہننا ضروری تھا۔ پگڑی کے اوپر ایک پیتل کا بلہ چوڑے سے بیلٹ پر لگا کر ضرور باندھنا ہوتا تھا، تین سواریاں اور چوتھا کوچوان ہوتا تھا۔ تانگے کے دونوں جانب سر شام لیمپ روشن کرنے ضروری تھے۔ بصورت دیگر چالان ہو جاتا چالان کی صورت جرمانہ ایک دو روپیہ ہوتا مگر چالان روکنے کی رشوت دو آنے تھی۔ سائیکل والوں کا چالان بھی ہوتا، سائیکل کی گھنٹی ضروری ہوتی۔ شام کے بعد لیمپ جلانا ضروری تھا، سائیکل پر دوسری سواری بٹھانا جرم تھا، عجیب دور تھا سائیکل کو خوب شنگارتے اور سجاتے تھے سجاوٹ کے لیے تین چار گھنٹیاں لگائی جاتی تھیں۔ سائیکلوں کو لوگ اس طرح سجاتے تھے کہ لوگ کھڑے ہو کر دیکھتے تھے بچہ سائیکل کو ہاتھ لگاتا تو مالک سختی سے منع کرتا۔ ولایت سے سائیکلیں آئیں تو ان کی قیمت قدرے زیادہ تھی جب یہاں سائیکلیں بننے لگیں، تو پندرہ بیس روپے میں سائیکل مل جاتی، بہرحال عجیب دور تھا، سستا زمانہ تھا، ہر چیز سستی تھی البتہ پیسہ بڑی مشقت سے حاصل ہوتا تھا۔ کلرک اور سپاہی کی تنخواہ دس بارہ روپے ہوتی تھی۔ مشہور ہے ایک آنہ روٹی دال مفت لیکن اس سے پہلے دور میں ایک پیسے کی دو روٹیاں اور دال مفت پھر مدت تک پیسے کی روٹی اور دال مفت ملتی رہی۔ اڑھائی آنے سیر بڑا گوشت، چار آنے سیر چھوٹا گوشت، آٹا دیہات میں ایک روپے کا من مگر لاہور میں ایک روپے کا تیس سیر تھا۔ دیسی گھی دس بارہ آنے سیر، کھانڈ روپے کی آٹھ سیر بکتی تھی مگر مہنگائی کا رونا اس وقت بھی تھا۔

اس طرح کا ناقابل یقین دور بھی لوگوں نے دیکھا ہے...... وقت بدلتا گیا انگریز کی غلامی سے لوگ مانوس ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا ظلم ستم، میسور میں انگریزوں کا قتل و غارت،

سلطان ٹیپوؒ جیسے مجاہد کی شہادت، جلیانوالہ باغ کی خونریزی، ۱۹۱۹ء کا مارشل لاء لوگ بھول گئے اور انہوں نے غلامی سے سمجھوتہ کرلیا۔ اس لیے کہ انگریز کے انتظامی امور، نظام تعلیم، عدالتی نظام، ڈاک کا نظام، لاء اینڈ آرڈر پر سختی سے عملدر آمد، سفری سہولتیں ان سب میں لوگ کھو گئے اور انگریز نے جو تاریخ مرمت کرائی جو نصاب تعلیم دیا۔ اس میں مجاہد آزادی اور تحریک آزادی کے متوالوں کو ظالم و جابر اور قاتل قرار دیا، بلیک ہول کے واقعہ کو خاص طور سے درسی کتابوں میں شامل کیا، یہ سب کچھ فاتح قوم کا حق ہوتا ہے اور اس کے بس میں ہوتا ہے۔

ایک بوڑھا سا بابا بچوں کو عجیب و غریب کہانیاں سنایا کرتے تھے، یہ بھاٹی دروازے اور موری دروازے کے درمیانی باغ میں بیٹھتا۔ کمزور اور نحیف ہونے کے باوجود آواز بڑی کڑاکے دار تھی اس نے انگریزوں کے مارشل لاء کی بڑی خوفناک کہانی سنائی کہ ہر چوک میں ٹکٹکی باندھ دی گئی تھی اور جو ان کے قابو آ جاتا اس کو ٹکٹکی سے باندھ کر تیل میں بھیگے ہوئے کوڑے اس کی پشت پر مارتے، چیخیں دور دور تک سنائی دیتیں۔ چھتوں پر عورتوں کی چیخیں یہ منظر دیکھ کر نکلتی تھیں۔ بڑا ظالم وقت تھا۔ بابا نے سنایا۔ بچو مگر ایک بات جو میں نے دیکھی وہ بھی عجیب تھی، ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو سپاہی پکڑ کر لائے، یہ بھاٹی دروازے کے تھانے کا واقعہ ہے، وہاں بھی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی۔ انگریز افسر کے سامنے اس شخص کی تلاشی لی گئی کرتے کے نیچے اس کے سلوکے کی جیبوں سے بائیس ہزار روپے نکلے، اس دور میں یہ رقم بہت ہی زیادہ تھی۔ انگریز نے پوچھا تم کام کیا کرتے ہو اس نے بتایا میں منڈی کا بڑا آڑھتی ہوں انگریز نے کہا اس کو چھوڑ دو، ایک سارجنٹ اور دو سپاہی اس کو ساتھ دیئے اور کہا اسے گھر پہنچا کر آؤ۔ اس کا نام بابا رفیع تھا مگر بچے اس کو بابا ٹوپی والا کہتے تھے وہ سر پر ٹوپی پہنتا تھا اس نے بچوں کو جلیانوالہ باغ کا ایک واقعہ سنایا کہ جب انگریزوں نے سیکڑوں ہندوستانیوں کو گولیاں سے بھون دیا، تو مقامی لوگوں نے بھی جو انگریز مرد عورت اکا دکا نظر آتا اس کو چیر پھاڑ دیتے ایک میم جان بچا کر بھاگی، اس پر ایک تانگے والے کو رحم آ گیا اس نے اسے اشارے سے بلایا تانگے کی ہودی میں اسے بٹھا کر اوپر اپنی گندی مندی چادر ڈال دی اور تانگہ بھگا کر اس کو امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیا۔ امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر انگریز فوجی موجود تھے۔ جس میم کی تانگے والے نے جان بچائی وہ کسی بڑے انگریز افسر کی بیوی تھی میم نے اس کا شکریہ ادا

کیا، اس کو تھپکی دی، اس کا نام لکھ لیا۔ اس کے تانگے کا نمبر لکھ لیا اور اسے ایک چٹ لکھ کر دی، جب سکون ہوا، امن وامان محال ہوا تو تانگے والے کو تلاش کیا گیا، وہ مل گیا اسے پوچھا گیا کہ تمہیں کیا انعام دیا جائے۔ اس نے کہا مجھے انعام نہیں چاہیے مجھے اس خاتون پر رحم آ گیا، میرے ہمت اور حوصلے سے اس کی جان بچ گئی، انگریز نے بہت اسرار کیا کچھ مانگ لو، جب اس نے زیادہ ہی کہا، تو تانگے والے نے کہا مجھے بس یہ چاہیے کہ ساری عمر میرے تانگے کا چالان کوئی نہ کرے۔ انگریز ہنسا، اس نے آرڈر کروا دیا اور سارے تھانوں میں بھجوا دیا کہ تاحیات اس کے تانگے کا چالان نہ کیا جائے، تو ایسا ہی ہوا۔ پولیس کو معلوم تھا اس کا کوئی چالان نہیں کرتا تھا۔

بابا گامی ٹوپی والا روز کوئی نہ کوئی دلچسپ بات ضرور سناتا۔ ایک دن اس نے بتایا، بھاٹی دروازے کے اندر ایک شادی چور رہتا تھا، دراصل وہ ڈاکو تھا، اور بڑا نامی گرامی ڈاکو تھا اس کا بڑا چرچا تھا، بڑی دہشت تھی لوگ اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ وہ دریا پر رکھ (یعنی جنگل) ہے اس میں سرشام چلا جاتا، اس وقت بھولا بھٹکا مسافر، آتا جاتا تو اس کو لوٹ لیتا، کئی ڈاکے اس نے شہر میں بھی ڈالے۔ لوگ دریا کے راستے شام کو آتے جاتے ہی نہیں تھے۔ ایک مرتبہ ایک دفعہ ایک بوڑھیا کو شہر میں سودا سلف خریدتے دیر ہو گئی، وہ افراتفری میں ہانپتی ہوئی جا رہی تھی، جب دریا کے پار جنگل کے قریب سے گزرنے لگی تو اسے ایک نوجوان ملا اس نے بڑے ادب سے کہا۔ ماں جی آپ پریشان کیوں ہیں؟ اس نے کہا بیٹا اللہ تیری زندگی کرے جوانیاں مانیں، میں نے بیٹی کی شادی کرنی ہے، سودا خریدتے دیر ہو گئی۔ وے پتر! شادی ڈاکو تو ڈر لگدا اے۔ نوجوان کے پاس گھوڑا تھا، اس نے کہا۔ ماں آپ ڈریں نہیں، آپ کو گھر پہنچا دوں گا۔ اس نے گٹھڑی گھوڑی پر رکھی اماں کو بھی گھوڑے پر بٹھا لیا اور بڑے آرام سے اس مائی کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ راستے میں بڑھیا کا سامان اس کو دیا، بڑھیا نے دعائیں دی۔ آخر پوچھا بیٹا تو کون ہے، تو بہت نیک ہے، اس نے مسکرا کر کہا اماں میں ہی شادی چور ہوں۔ مائی کا رنگ اڑ گیا مگر اس نے دلاسا دیا اور کہا، میں اتنا ظالم نہیں ہوں لوگوں نے مجھے ظالم مشہور کر دیا ہے بڑھیا دعائیں دیتی ہوئی گھر چلی گئی، ویسے اس کی جوے کی بیٹھک بھی تھی، مخیر بڑا تھا، رمضان شریف میر [illegible] لنبیؐ پر وہ ہر مسجد میں قرآن پاک تقسیم کرتا پیسے

دیتا، نان حلوہ پکا کر بانٹتا، تو وہ ڈاکو اس طرح کا تھا یہ محلّہ جوتیاں میں ماجا شادی والا اور پھجا شادی والا یہ اسی کے بیٹے ہیں۔ ایک اس کا بیٹا بودی تھا وہ جوانی میں ہی مر گیا تھا۔

بابا ٹوپی والا اس قسم کے قصے کہانیاں بہت سناتا، ان میں بہت سی باتیں سچی بھی ہوتی تھیں۔ لاہور کی اتنی داستانیں ہیں کہ ان کو قلمبند کرنا ایک طویل کام ہے۔ بابا ٹوپی ایک بنگالی بابو کا قصہ بھی سنایا کرتا تھا کہ اس کا مقابلہ پولیس سے ہو گیا، اس نے دوسری منزل سے پستول کے فائر کیے، ایک دو پولیس والے زخمی بھی ہوئے، اس نے تمام دروازوں کو مضبوط تالے لگائے ہوئے تھے، اس کے پاس پستول تھا۔ لہٰذا فائر بریگیڈ منگا کر جہاں سے وہ فائر کرتا وہاں بڑے پائپ سے پانی چھوڑ دیا، جب سیڑھی لگا کر اوپر گئے، وہ بنگالی مر چکا تھا اس کا قصور کیا تھا، اس کا پولیس سے کیوں مقابلہ ہوا۔ کیوں اس نے جان دے دی، اس کے خلاف کیا الزام تھا یہ کچھ معلوم نہیں یہ کہتے تھے کہ وہ جاسوس تھا۔ بابا گامی ٹوپی والا بڑے عجیب وغریب قصے سنایا کرتا تھا۔ بچے بڑی حیرت سے بابا کے قصے سنا کرتے تھے، اس کا اپنا ایک علیحدہ ڈیرہ تھا، ایک دن اس نے بتایا کہ انگریز افغانستان سے کابل کے ایک حکمران کو لائے، اسے لاہور میں بڑے اعزاز اور عزت سے رکھا۔ ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ لاٹ صاحب کو دفتر چھوڑ کر ڈرائیور کار واپس لا رہا تھا کہ سامنے سے افغان سردار بھی کار میں آ رہا تھا۔ لاٹ صاحب کے ڈرائیور کو یہ زعم تھا کہ میں لاٹ صاحب کا ڈرائیور ہوں، اس نے افغان امیر کو رستہ نہ دیا۔ امیر افغان کو غصہ آیا، اس نے کار سے اتر کر لاٹ صاحب کے ڈرائیور کو باہر کھینچ لیا۔ اس پر وہ ہنٹر برسایا، وہ ہنٹر برسایا کہ ڈرائیور کی چیخیں نکل گئیں۔ پولیس نے چھڑا کر ڈرائیور کو بھیج دیا اور امیر کو سلوٹ کر کے عزت سے رستہ دے دیا۔ ڈرائیور نے لاٹ صاحب سے شکایت کی، تو لاٹ صاحب ہنسے اور کہا، حکمران سے اسے مہمان کی حیثیت میں ہم یہاں لے آئے ہیں اور اس کا ہم کیا کر سکتے ہیں، شکر کرو اس نے تمہیں جان سے نہیں مار دیا۔ اس صورت میں بھی ہم اس سردار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے ایسے لوگوں کے لیے کسی بھی کام کے لیے براہ راست برطانیہ کے تاجدار سے حکم لینا پڑتا ہے۔ یہ لوگ شاہی مہمان ہوتے ہیں۔ بابا گامی کا قصہ سنانے کا انداز بڑا ڈرامائی ہوتا تھا۔ موقع محل کے مطابق ایکشن اور ایکٹنگ کے ساتھ صوتی اثرات بھی دیتا تھا۔ اسی لیے بچے بڑے ڈوب کر، انہماک سے سنتے، البتہ بابے گامی کی لال رومی ٹوپی کا کالا پھندنا جب جھولا

جھولتا تو بچے وہ ضرور دیکھتے۔ بابا بچوں کو تھیٹر کے ڈراموں سے ڈائیلاگ بھی سنایا کرتا تھا، جب وہ جوش جذبے سے یہ ڈائیلاگ بولتا ''توفیق کس حال میں شیر لوہے کے جال میں'' تو بچے تالیاں بجاتے۔''

ایک دن اس نے سنایا کہ انارکلی میں ایک انگریز گھوم رہا تھا، حکم تھا کہ انگریز عام جگہوں پر کم آئیں جائیں۔ ایک سکھ تھانیدار نے اسے چیک کرنے کی کوشش کی، انگریز نے پہلے تو اسے ٹال دیا، جب سکھ تھانیدار زیادہ ہی مصر ہوا تو انگریز نے اس کو مار مار کر ادھموا کر دیا۔ ٹھڈے گھونسے، تھپڑ مارے، انگریز جاندار تھا اور پھر انگریز بھی تھا۔ لوگ تماشہ دیکھتے رہے، کسی کو چھڑانے کی جرات نہ ہوئی مگر جیت انگریز کی ہوئی اور اعلان کر دیا گیا کہ کوئی دیسی افسر کسی انگریز کو چیک نہیں کر سکے گا۔ بچوں کے لاہور کے دلچسپ قصے سنانے والا مدتوں سکھوں کے دور کے علاوہ قلعہ لاہور کے مافوق الفطرت قصے بھی سناتا۔ شالیمار باغ کے جنوں اور پریوں سے منسوب قصے بھی سنایا کرتا تھا۔ دریا کے آر پار ڈاکوؤں اور چوروں کے قصے بھی سناتا تھا، وہ اس دور کی باتیں بھی بتاتا تھا، جب شہر کے لوگ اچھرہ یا کسی اور دور دراز آبادی کی جانب جانے والے رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں سے مل کر جاتے اور گناہ بخشوا کر جاتے اور خیریت سے واپس آنے کے لیے دعا کی تاکید بھی کرتے۔ کیونکہ راستے اجاڑ تھے۔ بیابان اور بھیانک تھے۔ بابا گامی بچوں کو جلد ہی داغ مفارقت دے گیا، جس کا بچوں کو بہت دکھ ہوا، اس کے بیٹھنے کی جگہ خالی دیکھ کر بچے مدتوں غم محسوس کرتے رہے اور اسے یاد کرتے رہے۔

مگر یہ دور تو ان بچوں نے بھی دیکھا کہ شام کے بعد یکے اور ٹمٹمیں اچھرہ اور نواں کوٹ وغیرہ نہیں جاتی تھیں۔ ایک تو واپسی پر سواری نہیں ملتی تھی، دوسرے راستے بھی محفوظ نہیں تھے، اکیلا آدمی آنے جانے سے گریز کرتا تھا ذخیرے اور جنگل راہزنوں کے مسکن تھے۔

مسجدوں سے ٹوپیاں اتارنے اور جوتے چرانے کا اس وقت بھی رواج تھا، جیب کترے بھی تھے مگر ماحول پھر بھی پرسکون تھا۔ لاہور کی گلیوں میں ایک اندھا یہ آواز لگاتا ہوا آتا تھا۔ (مائیاں بھیناں کتن تے میر تکلے وکن) وہ چرخوں کے تکلے بیچتا تھا، اس کے تکلے بہت بکتے تھے۔ ہندو، مسلم سب عورتیں اس کے تکلوں کی خریدار تھیں۔ اس وقت لاہور میں چرخہ کاتنے کا رواج تھا، دیسی کھڈیاں بھی عام تھیں کھدر، کھیس، چادریں دیسی کھڈیوں پر تیار ہوتی تھیں اس

دور میں تیور، بیور، رتجے پھلکاریاں استعمال ہوتی تھیں، داج میں دی جاتی تھیں پھر ان پر کڑھائی کا کام بھی لڑکیاں کرتی تھیں، لحاف اور رضائیوں کے استر اور ادرے بھی زیادہ تر کھدر کے ہوتے تھے اوروں پر اور چادروں پر لکڑی کے پھٹوں سے ٹھپکنے کا رواج عام تھا۔ ہندو عورتیں کالے صوف کے گھاگھری پہنتی اور گوالوں کی عورتیں دھاری دار رنگین موٹے کپڑے کے گھاگھرے پہنتیں تھیں، باقی عام عورتیں شلوار پہنتیں۔ دھاری دار سوتی کپڑے، سوسی، مارکین، ململ، لٹھہ اور ریشمی کپڑوں کا بھی عام رواج تھا، یہ سب کپڑے دو چار آنے گز کے حساب سے بکتے تھے۔ بہت بعد میں جاپانی کالٹھہ، ڈی ون کالٹھہ، چھبی کی ململ، بسکی، کریپ، موہنا وغیرہ لاہور میں عام پہننے کا رواج تھا۔ مردوں میں خاص طور سے بوسکی کی قمیص اور لٹھے کی سفید شلوار، شوقین لوگ پہنتے تھے۔ عورتوں کے لیے طرح طرح کی پھولدار ریشمی اور سوتی کپڑے ملتے تھے۔ عورتوں کے لیے خوبصورت گرم چادریں اور مردوں کے لیے گرم کمبل اور دھسے، گرم پٹی کے کوٹ اور فتوحیاں، روئی دار بنڈیاں پہننے کا بھی رواج تھا۔ دو گھوڑے کی بوسکی جب سات آٹھ آنے گز سے دس آنے گز ہوگئی تو مہنگائی کی پکار شروع ہوگئی، دو گھوڑے کی بوسکی آج بھی ملتی ہے مگر کوالٹی ویسی نہیں اور قیمت قریباً اڑھائی سو روپے گز ہے۔

لاہور کے لوگ قدرتی طور پر یا پانی اور مٹی کے اثر کے باعث یا ماحول کے باعث خوش خوراک ہیں۔ خوش گلو ہیں اور خوش پوش ہیں۔ صبح سویرے بچے، بڑے، بوڑھے، جوان سب دودھ دہی والی دوکانوں اور حلوائیوں کی دوکانوں کے گرد ہجوم کی صورت جمع ہوتے تھے۔ لسی کلچے کا ناشتہ، حلوہ پوڑی کا ناشتہ یا پھر سری پائے اور کلچے کا ناشتہ عام تھا۔ گھروں میں بھی سردی ہو گرمی ہو ناشتہ اسی صورت میں ہوتا تھا، البتہ کئی گھروں میں صبح سبز چائے اور پراٹھا کا ناشتہ ہوتا تھا، کئی گھروں میں ایک وقت روٹی اور شام کو چاول کھانے کا رواج تھا مگر عام طور پر چاول کم کھایا جاتا تھا۔ مٹھائی کی دکانیں زیادہ ہندوؤں کی تھیں مسلمانوں کی دکانیں کھیر، کھویا، گاجر کا حلوہ وغیرہ اور سیخ کباب اور شامی کباب کی تھیں اس کو ٹکی کباب کہتے تھے! گھی دکانوں پر اور گھروں میں دیسی استعمال ہوتا تھا۔ صبح دودھ دہی ہی زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ مٹھائی کی دوکانوں سے دور دور تک دیسی گھی کی مہک پھیلی رہتی تھی، سید مٹھا بازار میں نکو ساہ ہندو حلوائی تھا۔ گھٹی بازار کی گلیوں تک دیسی گھی کی خوشبو جاتی تھی اس دکان پر صبح گاہکوں کا میلہ لگا ہوتا

تھا۔ ہندو مسلمان سودا خریدتے تھے۔ اس سے ذرا آگے لوہاری منڈی کی جانب جائیں، تو لبا دھوبی پہلوان کی دودھ دہی کی دکان تھی، وہاں بھی کافی بھیڑ ہوتی۔ اکثر ہندو بھی پہلوان کی دوکان سے لسی پیتے تھے، اسی طرح کئی مسلمانوں کی مشہور دوکانوں سے ہندو بھی حلوہ پوڑی کھا لیتے تھے، انتہا کی چھوت چھات کے باوجود بھی اس طرح مخلوط سا ماحول بھی تھا، دوستی کے رشتے میں سب کچھ چلتا تھا یہ ایسا دور تھا کہ چوری چھپے ہندو گوشت کھانا شروع ہو گئے تھے، بلکہ کئی ہندو گھروں میں بھی در پردہ بکرے کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ قصائی سے مسلمان بچوں کے ہاتھ منگوا لیا جاتا تھا۔ خلیفہ کبابوں والا، بھاٹی دروازہ کے استاد پپو بھنے ہوئے گوشت والا، گھوٹا حلوائی بھاٹی گیٹ والا، حسین بخش حلوائی موچی دروازے والا، بہت بعد میں مشہور ہوئے، البتہ ڈبی بازار میں مولا ماش کی دال والا مشہور تھا، اس کی دکان گلی میں تھی اور بارہ بجے سے دو بجے تک اس کی ماش کی دال خوب بکتی تھی، بڑا رش رہتا تھا اسی گلی کے باہر ڈبی بازار کے چوک میں رام رکھا مل ٹیلر ماسٹر کی دکان تھی، اس کے ہندو کاریگر مسلمان کاریگروں سے مولا بخش کی دکان سے ماش کی دال منگا کر کھاتے تھے، اسی طرح سید مٹھے کے چوک میں سندر داس ٹیلر ماسٹر کی دوکان پر ہندو مسلمان کاریگر تھے، سب اکٹھے بیٹھ کر گوشت کھاتے تھے۔ اس کے باوجود ہندو سبیلوں پر مسلمانوں کو پانی اوک سے پلایا جاتا اور ہندوؤں کے لیے گلاس رکھے ہوتے تھے، کئی ہندو عورتیں اور مرد مسلمان کے پاس گزر جانے پر نہا کر اپنے آپ کو پوتر کرتے تھے اور ہندو مسلمان دوست ایک دوسرے سے جھپیاں ڈالتے، ماتھے چومتے، اکٹھے بیٹھ کر کھاتے۔ اس لحاظ سے اس ماحول کو برا بھی کہا جاتا ہے اور اچھا بھی کہا جاتا ہے انسانی سطح پر ہر وہ کام جو انسانی فطرت کے مطابق ہے دونوں جانب سے مسلسل جاری و ساری تھا، کٹر قسم کے متعصب ہندو نہ ہوتے تو شاید صورت حال کچھ اور نوعیت کی ہوتی۔

چکڑ چھولے لاہور کے بہت مشہور تھے۔ مسلمان، ہندو سب چکڑ چھولے بناتے تھے مگر دونوں دھڑوں کے چنے کھانے کے قابل ہوتے تھے، ایک ہندو کلچہ داس کے ساتھ ہندوؤں کو چکڑ چھولے کھلایا کرتا تھا، اس کا بڑا چرچا تھا، ہندو اکثر کہا کرتے تھے کہ اس طرح کے چنے مسلمانوں کے ہاں نہیں ملتے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ چھولے بیچنے والا پہاڑیاں تھا اور صبح سے دس بجے تک اس کے چنے ختم ہو جاتے، ایک دن دس بجے کے قریب چنے تھوڑے سے رہ گئے

کسی ہندو نے ڈونے میں چنے لیے تو اچانک ان میں باریک سی ہڈی کی کرچ نکل آئی۔ شاہ عالی، لوہاری اور بھاٹی دروازے کے ہندو جو اس کے گاہک تھے، سب میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، وہ چکڑ چھولے بیچنے والا غائب ہو گیا، اسے بہت تلاش کیا گیا مگر نہ ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک مسلمان کا شاگرد تھا، اس نے اسے یہ فارمولا سکھایا تھا کہ چنوں میں بڑے گوشت کی یخنی ڈال لیا کرو، ہندوؤں میں ایسے لذیذ چنے کسی کے نہیں ہوں گے، اس میں وہ بڑا کامیاب ہوا۔

صبح سویرے بچے ایک ایک پیسہ لے کر نکلتے کوئی حلوائی سے پوڑی خرید رہا ہے، پوڑی پر حلوہ دکان والا رکھ دیتا، دودھ دہی والے سے کلچہ خریدا تو اس نے اوپر دہی رکھ دیا۔ کلچہ داس خریدا تو اس نے اوپر دو لونچڑے رکھ دیئے۔ لونچڑے گول پکوڑے کی صورت میں ہوتے تھے۔ ہندو مسلمان گلی ڈنڈا اکٹھے کھیلتے، پتنگیں اکٹھے اڑاتے، اکھاڑوں میں زور بھی اکٹھے کرتے، اس کے برعکس کٹر قسم کا ماحول بھی تھا۔ شراب، بوٹی یعنی بھنگ اور چرس بھی اکٹھے پیتے پلاتے۔ کاروبار پر، منڈیوں میں، کارخانے، فیکٹریاں اور کام تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمان بھی اس میدان میں تھے مگر بہت کم، مکمل طور پر اس سلسلے میں ہندوؤں کا ہولڈ تھا مسلمان کاریگر ہوتے۔ ہنرمند ہر شعبے میں مسلمان ہوتے تھے، یا منڈیوں میں بار برداری مال لادنے اور لے جانے کا کام مسلمان کرتے تھے۔

شادی بیاہ پر کھانے پینے کا رواج امیروں میں پرتکلف کھانوں کا تھا، ہندو شادیوں پر زیادہ تر پوڑی کچوری اور مٹھائی کا استعمال کرتے تھے، مسلمانوں میں زیادہ تر درمیانے اور غریب طبقے کے رسم و رواج کھانے پینے میں سادہ تھے۔ اس طبقے میں زردہ پلاؤ پکتا تھا مگر ساتھ قورمہ اور ساگ گوشت نہیں ہوتا تھا، سادہ زردہ پلاؤ ہوتا دریاں بچھ جاتیں۔ ان پر دسترخوان بچھا دیئے جاتے اور لوگ آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے، ایک ہی پلیٹ میں ایک طرف زردہ اور ایک طرف پلاؤ ہوتا ہر پلیٹ پر دو آدمی سامنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ بارات اکثر رات ٹھہرانے کا رواج تھا، ایک وقت زردہ پلاؤ ایک وقت سفید چاول اور شوربہ گوشت ہوتا تھا بوٹیاں اور شوربہ الگ الگ برتنوں میں ہوتا، ایک لاکڑی شوربا ڈالتا جاتا اور دوسرا بوٹیاں ڈالتا، ایک پلیٹ پر آدمی دو ہی بیٹھ کر کھاتے تھے، البتہ ناشتے میں سبز چائے اور باقر خانیاں یا مٹھائی کا رواج بھی تھا، کچھ خاص خاندانوں میں، سفید چاول اور پیسا چینی اوپر

تھاپ کر درمیان میں جگہ بنا کر دیسی گھی ڈال دیا جاتا۔ بارات کی اس طرح خاطر تواضع کی جاتی، یہ رواج لاہور میں خاص طور سے دھوبی برادری اور گوجر برادری میں تھا، کھانا سب بیٹھ کر کھاتے تھے۔ کھڑے ہو کر کھانے کو مکروہ اور معیوب سمجھا جاتا تھا، البتہ رئیسوں اور امیروں کی شادیوں پر مرغ مسلم، قورمہ، متنجن، اور ہر پر تکلف کھانا پکتا تھا۔ بارات ایک سے زیادہ دن بھی رکھی جاتی تھی۔ ہندوؤں میں بھی بارات کو دو دن رکھا جاتا تھا، اس دور میں معمولی ردوبدل کے ساتھ ہر خاندان ہر قبیلے میں شادی بیاہ کی رسمیں اور رواج ایک جیسے تھے۔ شادی بیاہ پر ہندو مسلمانوں میں نیوندرا اور بھاجی اور دیگر لین دین ہوتا تھا، کئی دوست ایک دوسرے کی شادیوں میں شریک بھی ہوتے تھے۔ امیروں میں یہ میل ملاپ زیادہ تھا۔

شادی بیاہ پر ہندوانہ رسموں کا زیادہ رواج تھا۔ دولہا کھارے چڑھتا تھا، چپیاں توڑتا تھا، (چپنی، مٹی کی ہنڈیاں کا ڈھکنا) گانہ باندھنا، گانہ کھولنا، گھوڑا ایڑی، جوتا چھپائی، دولہا سے لڑکیوں کا مذاق، دولہا دلہن کی آمنے سامنے بیٹھ کر کئی رسمیں، سٹھنیاں، گھوڑیاں، سہاگ۔ یہ سب گانے عورتیں مل کر گاتی تھیں ان گانوں میں دولہا والوں کو گالیاں بھی دی جاتی تھیں، کافی مدت کے بعد مسلمانوں میں شادی بیاہ میں پلاؤ کے اوپر پیالیوں میں شوربہ دینے اور پالک گوشت کا رواج جاری ہوا۔ امیروں کے شادی بیاہ پر بارات کی خاطر تواضع پر اس دور میں بھی بہت خرچ ہوتا، دولہا کو گھوڑی پر چڑھانے اور بینڈ باجے کا رواج پرانا ہے۔ ہندوؤں میں جس نوجوان کی شادی ہوتی اس کو صاف ستھرے کپڑے نہیں پہنائے جاتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی یہی رواج تھا، اکثر دوست دولہا کے کپڑے جان کر پھاڑتے تھے۔ ہندو دولہا گانہ باندھنے کے بعد ہاتھ میں چاقو چھری رکھتے تھے تاکہ چڑیلیں اور بھوت ان پر حملہ آور نہ ہوں۔ اکیلے دکیلے دولہا باہر بھی نہیں نکلتا تھا بارات میں دولہا پر سوٹ کرنے کا زیادہ رواج تھا، سوٹ یعنی روپے پیسے نچھاور کرنا، جہیز کا اس دور میں بھی بہت زیادہ رواج تھا۔ لڑکیوں کو جہیز دینے پر لوگ خاک سیاہ ہو جاتے، جہیز کی نمائش بہت زیادہ ہوتی تھی۔ مزدوروں کی لمبی قطار سروں پر جہیز کا سامان اٹھائے ہوتی جب مزدور بازاروں اور گلیوں سے گزرتے تو دورویہ نمائش دیکھنے والوں کا ہجوم ہوتا اس کا یہ انداز ہندو اور مسلمانوں میں یکساں تھا۔ پہلے جہیز کی یہ نمائش دلہن کے گھر ہوتی، پھر دلہن ڈولی میں بیٹھ کر وداع ہوتی۔ غریب لوگ بھی اس نمائش کی تقلید کرتے

اگر جہیز کم ہوتا تو ایک ایک برتن ایک ایک بستر یا دوسرا سامان مزدور سروں پر اٹھائے ہوتے اور قطار کو زیادہ لمبا کرنے کی کوشش کرتے۔ رشتے تلاش کرنے میں اس وقت بھی زیادہ دشواریاں پیش آتی تھیں، مگر اتنی دشواریاں نہیں تھیں جتنی اس دور میں ہیں، کیونکہ مسلمانوں میں رشتے ناتے نزدیکی رشتہ داروں میں ہی ہوتے تھے۔ صرف یہ ہوتا کہ رشتے دار لڑکی والوں کے گھر بڑے چکر لگاتے گلے شکوے دور کیے جاتے۔ صلح کرانے والے رشتہ دار، بڑے بوڑھے خاص کردار ادا کرتے۔ روٹھنے میں عورتیں اور خاص طور سے بہنیں، پھوپھیاں اور خالائیں زیادہ ہوتیں، کئی کئی مہینے روٹھے ہوؤں کو منانے پر لگتے اور آخر میں صلح ہوتی تو گلے مل کر چیخیں مار مار کر رونے سے دل صاف ہو جاتے۔ عجیب دور تھا، خوشگوار دور تھا، خوشیاں زیادہ اور غم کم تھے۔ ورنہ انسانی زندگی تو ہمیشہ سے غموں کا جہنم ہی رہی ہے۔

لڑکی کو رخصت کرنے سے پہلے جہیز کی نمائش شادی کا ضروری جز تھا۔ کھٹ ہوکی جاتی، یعنی جہیز کی نمائش میں ایک چیز با آواز بلند بڑے فخریہ انداز میں بتائی جاتی۔ کھٹ اس انداز، اس لہجہ اور اس جذباتی طریقے سے بیان کی جاتی۔ لڑکی کی ماں باپ، بہن بھائیوں سے جدائی اور فرقت کو ایسے موثر جذباتی الفاظ میں بیان کیا جاتا کہ لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں، ہر آنکھ اشکبار ہو جاتی۔ ڈولی اور جنازے کے ماحول میں اس مرحلے پر بڑی مماثلت پائی جاتی کہار ڈولی اٹھاتے تو ایک اتنا دردناک منظر ہوتا کہ دلہن، ماں باپ، بہن بھائیوں کے چیخیں نکل جاتیں، ہر آنکھ سے اشکوں کی نہر جاری ہو جاتی کہرام سا مچ جاتا۔ لڑکی والے لڑکے اور لڑکے کے ماں باپ کے آگے جھولی پھیلا کر بڑی عاجزی سے رو رو کر کہتے کہ اب ہماری لاج آپ کے ہاتھ میں ہے اور لڑکی سے بھی یہی کہا جاتا کہ اب تیرا گھر وہ ہے جہاں تو جا رہی ہے۔ وہاں راضی خوشی ہمیں ملنے کے لیے آنا روٹھ کر نہ آنا، اب تیرا جنازہ اور ارتھی اسی گھر سے نکلے گی اور ایسا بھی ہوتا، عورت بڑی سخت جان ہوتی ہے۔ سسرال کی سختیاں طعنے وغیرہ بڑے حوصلے سے برداشت کرتی تھیں۔ خاوند سخت گیر ہوتا، تو عمر بھر خاوند کی مار پیٹ برداشت کرتیں۔ سسرال والے بھی اس قدر ظالم نہیں ہوتے تھے۔ طلاق کا بالکل رواج نہیں تھا اگر خدانخواستہ کبھی کسی کو طلاق ہو بھی جاتی تو سارے محلے، سارے رشتہ داروں میں کہرام مچ جاتا۔ لڑکی اور والدین ندامت سے منہ چھپائے پھرتے، شادیاں سو فیصد کامیاب رہتی تھیں۔ وہ دور ایسا تھا کہ لڑکیاں

جوڑ و کرانے نہیں جانتی تھیں۔ عورتوں میں علم کی اتنی فراوانی نہیں تھی اور عورتوں کے حقوق برابری کے نہیں تھے، بلکہ بادشاہ اور وزیر کا درجہ میاں بیوی کو حاصل تھا کیونکہ خاندان کی کفالت اور گھر کے اخراجات کی ساری ذمے داری مردوں پر ہوتی تھی۔ خاندان اور گھر کے اخراجات عورت نے اپنی گردن میں نہیں ڈالے تھے یہ نہیں کہ عورت بالکل ان پڑھ ہوتی تھیں۔ بڑے گھروں کی لڑکیاں زیادہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملک وقوم کی خدمت میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں، مگر عورتیں زیادہ تر پڑھی لکھی نہیں ہوتی تھیں۔ پردے کا سختی سے رواج تھا، عورتیں بہت کم باہر نکلتی تھیں۔

پردے کا رواج اس حد تک تھا کہ اونچے طبقے سے لے کر دوسرے طبقوں تک عورتوں نے کہیں آنا جانا ہوتا، تو تانگہ گھر کی سیڑھیوں سے لگا دیا جاتا۔ عورتیں بیٹھ جاتیں، تو تانگے کے پیچھے اور دونوں سائیڈوں کو چاروں سے ڈھانپ دیا جاتا، چادریں باندھ دی جاتیں۔ مسلمان عورتیں لٹھے کے دس دس گز کے کانوں والی ٹوپیوں والے برقعے پہنتیں، آنکھیں برقعے میں کروشئے کی کڑھائی والی لگائی جاتیں۔ گھونگھٹ کا بہت زیادہ رواج تھا۔ دلہنیں دو دو سال دولہا سے گھونگھٹ نکالتی تھیں۔ سسر، جیٹھ اور گھر کے دوسرے بڑے افراد، محلے کے بڑے بوڑھوں سے گھونگھٹ عمر بھر نکالا جاتا۔ گھونگھٹ میں بھی شرم وحیا کا جو پہلو تھا وہ بھی اخلاقی طور پر معاشرے کا ایک روشن پہلو تھا، بیویاں، ساس اور سسر کے سامنے خاوند سے بات نہیں کرتی تھیں۔

بارات میں باجے گانے کا رواج عام تھا۔ شادی سے پہلے شادی والے گھر ایک ماہ پہلے سے لڑکیاں ڈھولک رکھ لیتیں تھیں، محلے کی تمام لڑکیاں رات گئے تک شادی بیاہ کے گیت گاتی تھیں۔ شادیوں پر گانے بجانے کی محفلیں جمتی تھیں۔ مجرے ہوتے تھے، ہجیڑوں اور بھانڈوں کی ٹولیاں شادی بیاہ میں خوب کماتی تھیں، راس دھاریوں کے کھیل تماشے اور ناچ گانے بھی ہوتے تھے، آتش بازی اور سوٹ کا رواج بہت زیادہ تھا۔ ڈولی اور دولہا پر سے پیسے نچھاور کرنے پر کافی زور دیا جاتا تھا، بچے کافی پیسے لوٹ لیتے تھے۔ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا رواج قریباً موجودہ دور میں ہی شروع ہوا اور ختم ہوگیا، البتہ بارات میں کئی سفید پوش راہ چلتے ہی شامل ہو جاتے تھے۔ مشہور تھا کہ دو دوست شادیوں کے دنوں میں گلے پر پگڑیاں باندھ کر

صاف ستھرے کپڑے پہن کر روزانہ کسی نہ کسی بارات میں بڑی شان سے شامل ہو جاتے۔ خوب کھا پی کر مونچھوں کو تاؤ دیتے اور پھر بڑے سکون سے دوسرے درجے میں چار چار آنے کی ٹکٹ لیتے اور سینما میں ٹھاٹھ سے بیٹھ کر فلم دیکھتے، جب اس جوڑی کا زیادہ چرچا ہوا تو لوگ پیچھے لگ گئے، ایک دو جگہ پر پکڑے، ان کے کلے اتار کر جوتے مارے گئے اور پھر وہ جوڑی ٹوٹ گئی۔

لاہور میں برادری سسٹم بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم تھا، ہر برادری اپنے اپنے رسم و رواج، اپنے لباس اور اپنی برادری کی ثقافتوں کی پابند تھی۔ لاچے لنگیاں، سلارے، دھوتیاں، پٹکے، پاجامے، گھاگھرے، چوڑی دار شلواریں کرتے، فتوحیاں، پھولدار کپڑوں کی واسکٹیں، تنگ موری کے چوڑی دار پاجامے کھلی موری کے پاجامے، رومی ٹوپی، پلے دار ٹوپی، ہندو کی ٹوپیاں، مسلمانوں کی ٹوپیاں، مسلمانوں میں دو قسم کی رومی سرخ نبات کی ٹوپیاں تھیں۔ پھندنے سیاہ ہوتے سر پر سہلے لنگیاں، مشدیاں، کلے، ہندوؤں کی کشتی نما ٹوپیاں اور گول ٹوپیاں، مردوں میں ہندو مسلمان شلوار پہنتے تھے۔ گامے شاہی لال موتی چمڑے کی جوتی، چانئی جوتے، پمپ شوز، بو والی سیاہ غرگابیاں، بوٹ، عورتوں میں سلیپر، غرگابی، بیٹھویں ایڑی کی چانئی جوتے۔ موسم کے لحاظ سے رنگ برنگی پگڑیاں اور دوپٹے۔ لباس میں انگریزی اور دیسی فیشن کے عجیب وغریب سوانگ بھی دیکھنے میں آتے تھے، سر پر کلے اور پگڑی، نیچے لمبا کوٹ، پاؤں میں لال چمڑے کے جوتے اور گلے میں نکٹائی باندھی جاتی تھی۔ یہ اس بات کی نشاندہی ہوتی تھی کہ بڑے میاں کسی انگریز بہادر کے نوکر ہیں، اکثر باراتوں میں یہ منظر دیکھنے میں آتے تھے ان دنوں باجوں کا رواج باراتوں میں زیادہ تھا، پھر چوکوں میں بینڈ باجے کے آمنے سامنے مقابلے ہوتے تھے۔ شادی پر ہر خاندان ہر مذہب کے لوگ بے پناہ پیسہ برباد کرتے تھے، البتہ شادیوں پر کھانے پینے اور دعوت پر اتنا اجاڑا اور بربادی نہیں ہوتی تھی۔ دلہن کے جوڑوں پر اس وقت بھی بہت خرچ کیا جاتا تھا۔ کمخواب اور اطلس کے جوڑے بنتے تھے، غریب طبقہ میں سچے گوٹے کناری اور سچے تلے کا کام دلہن کے جوڑے پر کرایا جاتا، گوٹے سے تمام کپڑا مڑھ دیا جاتا تھا۔

لاہور میں ایک بارات کسی ریاست سے آئی تھی۔ کسی راجہ کے بیٹے کی بارات کسی ہندو

رئیس کے ہاں آئی تھی۔ وہ بارات لاہور میں ایک یادگار بارات تھی۔ اس بارات میں بہترین وردیوں میں گھوڑوں پر فوجی دستے، پیدل دستے، چار چار گھوڑوں والی فیٹینس، بگھیاں، تلواریں باندھ کر فوجی دستے، نیزے تھامے ہوئے پیدل فوج، نئی کاروں کی قطاریں، مشعل بردار دستے، شام سے پہلے یہ بارات مال روڈ سے گزری تو چاندی کے روپوؤں کی سوٹ سے زمین سفید ہوگئی۔ بے پناہ روپیہ نچھاور کیا گیا۔ بارات دیکھنے والوں کے ہجوم نے روپوں سے جیبیں بھرلیں، یہ بارات تین چار دن لاہور میں رہی، باراتیوں نے بے پناہ خرید وفروخت کی۔

شادی بیاہ پر راس دھاریئے، مجرے، گانے والے بلائے جاتے تھے۔ رات رات بھر محفلیں جمتی تھیں۔ شادی بیاہ پر خاص طور سے عورتیں خود ڈھولک پر شادی بیاہ کے گانے گا کر اپنی تفریح کا سامان پیدا کر لیتی تھیں۔ مسلمانوں میں بطور خاص پردے کا رواج تھا، اس لیے وہ زیادہ تر دل کا غبار شادی بیاہ کی تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کے دوران نکال لیتی تھیں۔ شرم وحیا، نیچی نظر اور گھونگھٹ کے اس دور میں ایک رکھ رکھاؤ تھا، دید لحاظ تھا۔ لڑکی ذرا جوان ہو جاتی تو پھر گھر سے باہر کم نکلتی، لوگ نوخیز لڑکوں کی لڑکیوں سے زیادہ حفاظت کرتے تھے، ہر محلے دار لڑکیوں کو اپنی بیٹی تصور کرتا تھا۔ محلے کے بچوں اور خاص طور سے لڑکیوں کی حفاظت محلے دار فرض سمجھ کر کیا کرتے تھے، محبت اور اپنائیت کا دور تھا۔ دس بارہ سال کی عمر کے بعد پھر لڑکیوں کے چہرے نظر نہیں آتے تھے پھر وہ پردے میں چلی جاتی تھیں۔ عورتوں میں سونے چاندی کے زیورات کا بہت زیادہ رواج تھا۔ زیورات بھی وزنی ہوتے تھے۔ سروں پر عورتیں دو زیور پہنتی تھیں۔ ایک ''پھل'' جو دونوں کانوں کے اوپر مینڈھیوں میں باندھے جاتے تھے۔ چھوٹی لڑکیوں سے لے کر جوان اور بڑی عورتوں تک مینڈھیاں کراتیں اور پراندہ ضرور ہوتا۔ عورت کے لیے سر کا ڈھکنا ضروری تھا۔ ایک زیور سر پر پہنا جاتا۔ چونک ہوتا تھا جو عورت کے سر پر درمیان میں چوٹی میں باندھ ہوتا، یہ دونوں زیور متروک ہو گئے ناک میں لونگ نتھ اور بلاک، کلائی میں گوکھرو، گلے میں ہنسلی یا ہنس زیادہ تر چاندی کا ہوتا۔ گلے کے زیور کا وزن آدھ پاؤ سے آدھ سیر تک ہوتا، چاندی کے زیورات کا رواج تھا۔ گلے میں سونے کے ہار کنٹھے اور تعویذ پہنے جاتے۔ کلائیوں اور بازوؤں میں سونے چاندی کا چوڑا، پہنچیاں، چھنکنن اور کنگن زیادہ وزن کے ہوتے۔ پاؤں کے زیورات میں جھانجھر، لچھیاں، توڑے، ساشاں، ٹاواں، بانکاں

پازیب، گھونگھریوں والے کڑے اس دور میں مروجہ زیورات تھے۔ باقی تمام زیورات ناموں اور معمولی ردوبدل کے ساتھ آج بھی پہنے جاتے ہیں، البتہ کانون میں ڈنڈیاں مرکیاں اور بندے بھی پہنے جاتے۔ بڑی بوڑھی عورتوں کے کانوں میں کئی کئی چھید ہوتے ہر چھید میں ڈنڈیاں یا مرکیاں پہنی جاتیں۔ عورتوں کے علاوہ مرد بھی گلے میں کنٹھے، تعویذ کے علاوہ زنجیر کا رواج بھی تھا۔ قمیضوں اور کرتوں میں سونے چاندی کے بٹنوں کا عام رواج تھا ان سب کے علاوہ ایک زیور ایسا ہے جو سیکڑوں برسوں سے آج تک اسی ذوق وشوق سے عورتیں پہنتی ہیں اور وہ ہیں کانچ کی چوڑیاں، جن کی چھنا چھن آج بھی دلوں کی دھڑکنوں میں ایک حسین ترنم کے ساتھ ایک رومانوی تاثر کی صدا بھی پیدا کرتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس دور میں چلمنوں اور پردوں کے پیچھے سے چوڑیوں کی چھنا چھن پیدا ہوتی تھی اور آج کل گلی کوچوں اور بازاروں میں یہ چھنکارے سننے میں آتے ہیں۔

حسین چہرے، خوش پوش، خوش خوراکی، جی داری محبت اور ذہانت لاہور کا طرۂ امتیاز تھا۔ مجرے کا دور تھا، خاموش فلموں کا دور تھا، تھیٹر کا دور تھا، راس دھاریوں کا دور تھا، پہلوانی کا دور تھا، تھیٹروں کی زندگی کا دور تھا، حماموں کی زندگی کا دور تھا، ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کا دور تھا، دودھ اور لسی کا دور تھا، دیسی گھی کا دور تھا۔ یہ دور بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ۱۹۳۰ء تک بڑی آب وتاب سے جاری رہا۔ لڑکیوں کو تعلیم دلانے کا رواج کم تھا صرف گھروں میں مسلمان دینی تعلیم، قرآن پاک، کچی اور پکی روٹی۔ پڑھا پڑھا کر لڑکیوں کو حرف شناسی کرا دی جاتی۔ ہندوؤں میں بھی اسی طرح گھروں میں ہندی پڑھا دی جاتی۔ عورت صرف خاوند کی تابعداری بچوں کی پرورش اور امور خانہ داری تک محدود زندگی گزارتی تھی۔ ایک آدمی کماتا اور پورا خاندان پالتا۔ اس لیے بھی غریب طبقے میں تعلیم کا رواج کم تھا۔ امیر لوگ اس دور میں بھی بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلواتے تھے۔ امیر لوگوں کی بیٹیاں بھی زیور تعلیم سے آراستہ ہوتی تھیں، اس دور کے بوڑھے ہندو اور مسلمانوں میں بیشتر لوگ فارسی دان تھے۔

لاہور کی تہذیب میں انگریزی طرز بودوباش نے زہر گھولنا شروع کر دیا تھا۔ پھر درسی کتابوں میں ''شہنشاہ سلامت رہے یا الٰہی'' کے گیت تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر کا نام دیا جا چکا تھا کلکتہ کے واقع بلیک ہول کو بڑے دہشت ناک اور ظالمانہ طرز کا واقع گردانا گیا

تھا۔ اس طرح لاہور کی اس دور کی نئی نسل کو اپنی روائتیں چھوڑنے اور غلامانہ ذہنیت کا زہر آہستہ آہستہ پینے پر لگا دیا گیا تھا۔

تعلیم صرف کلرک بھرتی ہونے کا ذریعہ تھی۔ خال خال دیسی لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے فائدہ اٹھاتے تھے۔ لوگوں میں یہ احساس عام تھا کہ انگریز بہادر کی تابعداری افتخار کا باعث ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نادر شاہی دور اور دیگر حملہ آوروں کے نت نئے حملوں سے ظلم و ستم، جبر و تشدد، لوٹ مار اور عزت و آبرو کی بربادی، سکھا شاہی دور کی تیرہ دستیاں اور وحشیانہ ماحول کے ستائے ہوئے لوگوں کو سکھ کا سانس لینے کا جو موقع ملا تو لوگوں نے اسے غنیمت تصور کیا۔ انگریزوں کے سخت قوانین اور ظلم و جبر جو پہلے حکمرانوں سے کم تھا، برداشت کر لیا گیا۔ باوجود اس کے، کہ سیاسی آواز بلند کرنے کی کسی حد تک آزادی تھی۔ اخبارات جیسے بھی تھے، اپنے اپنے قومی مفاد کے پیش نظر انگریز کے خلاف لکھتے تھے مگر کوئی زیادہ ہی باغیانہ آواز بلند ہوتی یا کالم لکھا جاتا تو انگریز برداشت نہ کرتا اور ردعمل کے طور پر قید و بند اور پریس وغیرہ کی ضبطی تک نوبت آ جاتی۔ لاہور میں پریس زیادہ تر زمیندار کا ہی ضبط ہوتا۔ مولانا ظفر علی خان ایک نڈر رہنما تھے، اس دور میں ان کی رہنمائی مسلمانوں کے لیے غنیمت تھی، بہت بڑی ڈھال تھی اور قابل قدر بھی تھی۔

سول انتظامی امور میں انگریز کامیاب تھا اور لوگ مطمئن تھے۔ انگریز کا طرز حکومت جداگانہ تھا، بلکہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انگریز کا طریق واردات مختلف تھا۔ وہ زہر بھی دیتا تھا تو قند میں لپیٹ کر۔ دوسرے وہ حکومت کرنے آیا تھا، صرف لوٹ مار کر کے واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا، جب نادر شاہ آیا تو راتوں رات دہلی کی دیواروں پر لکھ دیا گیا کہ۔

ظالم را انجام بد است

صبح اسے معلوم ہوا تو اس نے نیچے ہر جگہ لکھوا دیا کہ۔

ظالم را انجام بد است
بعد از بردباری مظلوم

انگریز نے اس پرانی طرز کا ستم ایجاد نہ کیا، بلکہ نیا طرز ستم اپنایا، اس نے لوگوں کے ذہن بدل کر رکھ دیئے۔ اس نے اپنے وفاداروں کے انعامات جاگیروں اور نوازشات سے دام بھر

دیئے، انہی لوگوں کو ڈھال بنا کر حکومت مضبوط کرتا رہا۔اس کے باوجود اس نے ہندوستان کو زندگی کی سہولتوں سے بھی مالا مال کر دیا۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ ''سر کے خطاب والے لوگ لاہور ہی میں تھے، سب سے زیادہ خان بہادر اور رائے بہادر بھی اسی شہر میں تھے، ان میں چند نام اس طرح تھے سر گنگا رام، سر شاری لال، سر چھوٹو رام، سر صنوبر لال، راجہ سر ندر ناتھ، سر عبدالقادر، سر محمد شفیع، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، سر سکندر حیات، سر فضل حسین، سر ظفر اللہ، سر مراتب علی، سر عمر حیات ٹوانہ، سر خضر حیات ٹوانہ، جسٹس سر عبدالرشید اور بیسیوں رائے بہادر اور خان بہادر تھے۔ان لوگوں کو انگریزوں کے وفادار کہا جاتا تھا انہیں ٹوڈی بچے بھی لوگ کہتے تھے۔اس کے باوجود ان لوگوں نے انگریزوں کی خوشنودی کے پردے میں اپنی اپنی قوم کے مفاد میں جو کارنامے انجام دیئے وہ قابل تعریف ہیں۔ ہنگامہ آرائیوں، انگریز کے خلاف تحریکیں چلانے والے، عوام کو سڑکوں پر لانے والے رہنما قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے کے باوجود عوام اور قوم کے لیے وہ مراعات حاصل نہ کر سکے جو ٹوڈی بچوں نے پر امن رہ کر اپنی اپنی قوم کے لیے حاصل کریں۔تحریک پاکستان میں اور مسلم لیگ میں شمولیت اور قائداعظم کی قیادت میں ان سر کے خطاب والوں نے بہترین کردار ادا کیا، وہ کام جو ایجی ٹیٹر جذبات میں بگاڑ دیتے تھے۔ وہ کام ان لوگوں کے باعث سنور جاتے تھے تاہم اپنا اپنا طرز اظہار تھا جس میں دونوں ٹائپ کے رہنما اپنی اپنی استطاعت کے دائرے میں کامیاب تھے۔

۱۹۳۰ء تک معاشرے میں کافی تبدیلی آ چکی تھی تعلیم کا ذوق بڑھ چکا تھا۔لڑکیوں اور لڑکوں کو یکساں تعلیم کے مواقع فراہم ہو چکے تھے، جگہ جگہ سکول کالج کھل چکے تھے۔انگریزی تعلیم کا چرچا عام تھا۔انگریز تہذیب بھی لاہور کے معاشرے میں سرایت کر چکی تھی۔انگریزی پڑھنے لکھنے کے بغیر نہ نوکری ملتی تھی نہ شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا تھا۔ پرانی روائتوں کی روشنی مدھم پڑ جا رہی تھی۔مندروں اور مسجدوں کا شہر کالجوں کا شہر بنتا جا رہا تھا چوتھی جماعت کے بعد بچے ڈیسکوں پر بیٹھنے لگے تھے۔ بڑے بڑے عالیشان گرجے تو لاہور میں مدتوں سے قائم ہو چکے تھے۔ان سے ملحقہ سکول جدید طرز تعلیم میں خاص اہمیت اور مہارت رکھتے تھے۔گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج، دیو سماج کالج، دیال سنگھ کالج، ایف سی کالج برسوں سے قائم تھے۔

پنجاب یونیورسٹی مدت سے قائم تھی۔ چیف کالج میں راجوں مہاراجوں، نوابوں اور امراء

کے لڑکے ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے، ایک تو اخراجات دوسرے عام لوگوں کے بچوں کے داخلے پر بھی پابندی تھی۔ تعلیم میں ایک انقلابی سی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ کوایجوکیشن یعنی مخلوط تعلیم کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ پرائمری سکولوں کا تو شہر میں جال بچھا ہوا تھا مگر ہائی سکول بھی ہر دروازے اور آبادی میں تناسب کے لحاظ سے قائم تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اپنے اپنے منظور شدہ سکول سرکاری ہائی سکولوں کے علاوہ تھے سال بہ سال سکولوں میں بچوں کی تعداد بتدریج بڑھتی جارہی تھی۔ بھاٹی گیٹ کے باہر سنٹرل ماڈل کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ریلوے ورکشاپوں کے نزدیک جی ٹی روڈ پر انجینئرنگ کالج بھی قائم تھا اور والٹن ٹریننگ سکول بھی ریلوے کے عملہ کی تربیت کے لیے قائم تھا۔ پہلے جو لڑکیوں کا باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا، اب آہستہ آہستہ سکول اور کالجوں کے وقت سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر ان کا آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں دونوں قوموں کے کٹر قسم کے لوگ مخالفانہ آوازیں اٹھاتے رہے مگر تعلیم کے ذوق و شوق کا سیلاب بڑھتا ہی چلا گیا۔ مسلمان لڑکیوں میں برقعہ کا رواج تو رہا مگر برقے کے کئی فیشن ایجاد ہو گئے۔ لٹھے کے دس گز کے برقعے کا رواج نئی نسل میں ختم ہو گیا۔ مختلف رنگوں کے ریشمی برقعوں کا رواج بتدریج بڑھتا گیا اور بڑے گھروں میں سرے سے برقعہ کا رواج ہی ختم ہوتا چلا گیا۔ تاہم عورت کا روایتی حسن جس کو حیا کا زیور کہا جاتا ہے وہ نیچی نگاہوں میں ابھی تک قائم تھا۔ لباس میں عریانی کا رواج بھی نہیں چلا تھا۔ آج کی عورت اور اس دور کی عورت میں فرق اتنا ہے کہ اس دور میں پردہ ہو نہ ہو نظر نیچی ہوتی تھی اور حیا کی سرخی عورت کے چہرے پر ضرور ہوتی تھی آج کل عورت، پردہ ہو نہ ہو۔ نظر بلند ادا دلنواز ہوتی ہے۔ لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے ہر ادا سے بے باکی اور تمکنت برستی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حیا جو عورت کا باطنی زیور بھی ہے وہ ختم ہو چکی ہے۔

یہ بات نہیں۔ عورت، عورت ہی ہے۔ زندگی کی قدریں بدل گئی ہیں رویئے بدل گئے ہیں، ماحول بدل گیا ہے، یہ انقلاب تعلیم کے باعث نہیں بلکہ مردوں کی اپنی خامیوں کے باعث ہوا۔ اس دور میں مرد عورتوں کی حفاظت کرتے تھے، آج کل عورتیں خود اپنی حفاظت کرتی ہیں، یہ جو عورتیں جوڈو کراٹے سیکھتی ہیں۔ اس کا بھی کوئی مقصد نہیں۔

بولنے والی فلمیں آ گئیں۔ لاہور کی سڑکوں پر موٹریں، موٹر سائیکلیں فراٹے بھرنے

لگیں۔لوگ بسوں پر سفر کرنے لگے،سب سے پہلے لاہور میں نندا بس شروع ہوئی۔ بڑے بڑے لوہے کے کارخانے کھل گئے۔سائیکلوں کی فیکٹریاں،سلائی مشینوں کی فیکٹریاں کھل گئیں کپڑے کے کارخانے اور دیگر ورکشاپس کھل گئیں۔ڈیڑھ لاکھ کی آبادی سے آبادی تین لاکھ تک ہوگئی۔مردم شماریاں ہوتی تھیں مگر بہت سے لوگ اندراج نہیں کراتے تھے البتہ ہندو، مسلمان اپنی اپنی آبادیاں بڑھا چڑھا کر درج کرانے کے چکر میں اس وقت بھی رہتے تھے۔ اس وقت بھی شہر کے باہر کی فضا ابھی ویران تھی۔ ماڈل ٹاؤن ابھی نہیں بنا تھا،صرف سامنے ایک گاؤں تھا بھا بھرے،نہر کے قریب فیروز پور روڈ کے کنارے پنڈ جیون ہانہ تھا البتہ مزنگ اور اچھرہ کی آبادیاں کافی بارونق ہو چکی تھی،آمدورفت کا سلسلہ دن رات جاری رہنے لگا۔ راوی روڈ پر کہیں کہیں آبادیاں بننا شروع ہو چکی تھیں۔ریلوے اسٹیشن کے پار باغبانپورہ تک بھی کہیں کہیں مکان نظر آتے تھے، ورنہ قبرستان زیادہ تھے، بدھو کا آوا قبرستان بھی قدیم قبرستان ہے۔میانی صاحب کا قبرستان بہت پرانا اور دور دور تک پھیلا ہوا تھا،اب قبرستان کے تین چوتھائی حصے پر آبادیاں قائم ہو چکی ہیں،قبرستان کا چوتھا حصہ رہ گیا ہے،کچھ قبرستان پر سڑکیں بن گئیں ہیں اور باقی آبادیوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔

ہندوؤں کے مرگھٹ،سمادھیاں،گئوشالائیں،ویام شالائیں،اناتھ آشرم،ودھوا آشرم، دھرم شالا اور بہت سے استھان اور بھنڈارے تھے۔ ہندوؤں کے پاس دولت بھی تھی اور وہ دان بھی دل کھول کر کرتے تھے،وہ مخیّر بھی تھے اور سادگی پسند بھی تھے۔دوسری طرف مسلمانوں میں امراء،رؤسا اور نواب تھے،ان میں بھی مخیّرانہ عادات بدرجِ اتم موجود تھیں۔لاہور میں کئی یتیم خانے تھے مگر جس سطح پر انجمن حمایت اسلام نے فلاحی اور رفاہی ادارے قائم کیے تھے،اس سطح کا،اس نوعیت کا ہندوؤں میں بھی کوئی ادارہ نہیں تھا۔انجمن حمایت اسلام اہل لاہور کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔اسلامیہ کالج لاہور اور اس کے ذیلی ہائی اور پرائمری سکولوں نے مسلمان بچوں کو علم کی جو روشنی بخشی وہ قابل فخر ہے اور اس کالج نے بڑے بڑے قابل سکالر،کھلاڑی، ماہر قانون ماہر تعلیم، ادیب، شاعر اور دانشور پیدا کیے۔انجمن حمایت اسلام کی زیر کفالت چلنے والا یتیم خانہ ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ تھا۔

ہندوؤں اور سکھوں نے بھی کثیر سرمائے سے انسانیت کی خدمت کے بڑے بڑے

ادارے قائم کیے۔ دیال سنگھ کالج، سناتم دھرم کالج، ڈی اے وی کالج اور بہت سے سکول لائبریریاں، کالج بھی ہندو سکھ تنظیموں نے قائم کر رکھے تھے۔ ان کے علاوہ گنگا رام ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال گلاب دیوی لالہ لاجپت رائے کی والدہ تھیں، یہ ہسپتال لالہ جپت رائے نے قائم کیا تھا۔ جانکی دیوی ہسپتال، سکھ نیشنل کالج، قبرستان آواہ بدھو کے سامنے قائم ہوا۔ لاہور کالج فار ویمن اور فتح چند کالج فار ویمن بھی قائم تھے اور بہت سے تعلیمی ادارے چل رہے تھے۔ لڑکیوں میں علم کا ذوق وشوق بڑھتا چلا گیا، یہ سب کچھ تھا مگر اس کو ہم کسی پہلو سے کسی زاویئے سے بھی پرکھیں۔ منفی اور مثبت سوچ کی عینک سے دیکھیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس تعلیمی رجحان کو فروغ انگریز نے دیا۔ حکومت کی جانب سے میو ہسپتال، میڈیکل کالج، ریلوے کا کرن ہسپتال، ڈینٹل ہسپتال، زچہ اور بچہ کی بہبود کا لیڈی ولنگٹن ہسپتال۔ اسی طرح بیسیوں چھوٹے ہسپتال، ڈسپنسریاں سرکاری طور پر قائم تھیں، کئی ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر تھے۔ انگریز نے جو شعور بیدار کیا یہاں اس کے تاریک پہلوؤں کو زیادہ اپنایا گیا روشن پہلوؤں کی جانب کم توجہ دی گئی۔ اس راستی میں زیادہ تر کٹر قسم کے ہندو اور مسلم مذہبی رہنمار کاوٹیں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن یہ انقلابات ایک طوفان کی مانند تھے، جن کو روکنا ممکن نہیں تھا، گورنمنٹ کالج نے علم کی روشنی پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایف سی کالج، امریکن مشن چلاتا تھا، چیف کالج، کوئین میری کالج، انگریزی طرز کے بہت سے سکول، کنیرڈ کالج، ڈان باسکو سکول ان کے علاوہ ریلوے کے زیر انتظام لیڈی گریفن سکول سینٹ اینڈ ریوز جیسے کئی انگریزی اور دیسی طرز کے تعلیمی ادارے قائم تھے۔ لاہور میں ہر سطح کے سکولوں اور ہر سطح کے کالجوں کا جال بچھا تھا مگر آبادی کے تناسب سے ناخواندگی کی تعداد پھر بھی بہت زیادہ تھی۔ حکومت نے دستکاری کے کئی سکول کھول رکھے تھے، شہر میں ہنرمند لوگوں کی کمی نہیں تھی۔

ٹیلرنگ کے کام کو بڑا فروغ ملا۔ مال روڈ پر ٹیلرنگ کی تین مشہور دکانیں تھیں۔ پٹ مین، بال مودی اور رنیکن ان کے مالک انگریز تھے۔ کٹر انگریز ہوتے تھے اور کام کرنے والے کاریگر دیسی تھے۔ لاہور میں ٹیلرنگ کے پیر کاریگر موجود تھے، یہاں کے درزی اتنے کاریگر تھے کہ دنیا کے جس شہر میں جاتے اپنے کام کی نفاست اور نزاکت سے لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتے۔ بمبئی کلکتہ کے علاوہ بیرون ملک، سنگار پور، ہانگ کانگ اور دوسرے کئی ممالک میں بھی

لاہور کے ٹیلر ماسٹر جاتے تھے۔افریقہ میں لاہور کے ٹیلر ماسٹر اعلیٰ پیمانے پر کاروبار کرتے تھے۔
لاہور کے اندر، مال روڈ انارکلی میکلوڈ روڈ اور دیگر مقامات پر ہندو مسلمان ٹیلر ماسٹروں کے اعلیٰ پیمانے پر کاروبار تھے۔انارکلی میں عنایت اللہ ٹیلر ماسٹر، شرما ٹیلر ماسٹر، ورما ٹیلر ماسٹر ٹانگوں سے معذور تھا اور بی اے پاس تھا۔ٹیلر شاپ نقی روڈ پر تھی ماسٹر ولی محمد، ٹیلر ماسٹر زین العابدین عرف بھگا ٹیلر ماسٹر کے علاوہ انارکلی میں بیسیوں ٹیلر ماسٹروں کی دکانیں تھیں جن میں سوٹنگ، برجس، پلس فور، اچکن اور شیروانی کے پیر کاریگر موجود تھے۔ایسے ایسے بزرگ کاریگر تھے کہ کام دیکھ کر ہاتھ چومنے کو جی چاہتا تھا۔اندرون شہر ہاتھ کی ترپائی کے کرتے پہنے جاتے تھے اور یہ ترپائی گھروں میں عورتیں کرتیں تھیں۔سلائی، کڑھائی کا کام گھروں میں عورتیں بڑی نفاست سے کرتیں، شہر کے اندر بہت سے معروف ہندو، مسلم ٹیلر ماسٹر تھے۔

لوہاری دروازے کے اندر باغیچی کے قریب درزی کی دو دکانیں تھیں۔ایک تاجدین ٹیلر ماسٹر اور سامنے دو کشمیری بھائی ٹیلر ماسٹر تھے۔دونوں میں مقابلہ ہوگیا۔گرمیوں میں ٹھنڈے سوٹ کوٹ پتلون کی سپلائی پہلے پانچ روپے سوٹ، پھر چار روپے، پھر تین روپے سوٹ سلائی کا دونوں نے اعلان کر دیا انہیں کاریگر نہیں ملے۔آخر تاجدین ٹیلر ماسٹر دوڑ لگا گیا، سوٹوں کے انبار لگے ہوئے تھے وہ خرد برد کر کے افریقہ بھاگ گیا۔

لاہور میں کاریں آ گئیں، موٹر سائیکلیں آ گئیں۔اس دور کی موٹر کاریں عجیب ہوتی تھیں۔پہیوں میں اسپوکس یعنی تاریں ہوتی تھیں، اوپر کینوس کا ہڈ ہوتا جو بند بھی ہو جاتا اور کھل بھی جاتا۔فٹ ریسٹ (پائیدان) موٹر کے دونوں طرف ہوتے۔انجن پر بون ہیڈ ہوتا جو بالکل انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے جیسا ہوتا۔موٹر ہینڈل گھما کر سٹارٹ کی جاتی، موٹر سائیکل کے ساتھ ایک سائیڈ کار ہوتی تھی۔اس میں بیوی بچے بیٹھ جاتے، اس سواری کے آنے اور بسیں چلنے سے ایک نیا کام شروع ہو گیا اور موٹر مکینک کی دکانیں کھل گئیں۔مال روڈ پر موٹر مکینک کی بڑی دوکان واٹر لاک کمپنی تھی، موٹر سائیکلوں کی مرمت کی دکانیں زیادہ تر میکلوڈ روڈ پر تھیں، ان میں مولا بخش اینڈ سنز خاصی مشہور ورکشاپ تھی۔یہ مکینک بھاٹی گیٹ کا رہنے والا تھا یہ ورکشاپ آج بھی قائم ہے، مولا بخش کے لڑکے اور پوتے چلاتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے موٹر کاروں کا حلیہ بدل گیا۔شیورلیٹ، بیوک، آسٹن، جرمنی کی بی۔

ایم۔ ڈبلیو اور بہت سے موٹروں کے مارکے اور ڈیزائن آ گئے۔ سیلف سٹارٹ سسٹم رائج ہو گیا، چھوٹی کاریں بھی آنے لگیں۔ بے بی آسٹین سستی تھی، ہڈ ختم ہو گئے لینڈ و باڈی کاریں آ گئیں۔ کاروباری لوگوں کے لیے لکڑی کی باڈی والی وینیں چلنا شروع ہو گئیں، بسوں اور ٹرکوں کے اڈے بن گئے۔ موٹر سائیکلوں میں انڈین، بی ایس، ٹرائمف، پنتھر، جرمنی کی بی۔ ایم۔ ڈبلیو بہت مشہور تھیں۔ سائیکلیں بھی نئے ڈیزائن کی باہر سے آنے لگیں جن میں ریلے زیادہ مشہور تھیں، دیسی سائیکلیں بنتی تھیں جو ناپائیدار میٹریل سے بنتی تھیں مگر سستی بہت تھیں۔ ان ایجادوں سے لاہور میں بے روزگاری کا کافی ازالہ ہو گیا مگر پڑھے لکھے بے روزگاروں میں اضافہ ہو گیا۔ ہر نوجوان میٹرک تک پڑھ کر سرکاری نوکری کی تلاش میں نیم پاگل ہوا پھرتا، بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں یہ لوگ کھپ جاتے مگر بے کاری میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انارکلی میں ایک گریجویٹ بوٹ پالش کرتا تھا اس نے گلے میں کتبہ پہن رکھا ہوتا تھا کہ بی اے پاس بوٹ پالش والا، یہ ہندو نوجوان تھا۔ یہ معاشرے کے منہ پر ایک طمانچہ ضرور تھا مگر پڑھے لکھے نوجوانوں میں یہ احساس گھر کر چکا تھا کہ تعلیم صرف نوکری کے حصول کے لیے بھی ہوتی ہے، حالانکہ تعلیم کی زندگی کے ہر شعبے میں ہر کاروبار میں اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس دور کے رہنما آزادی کے لیے تحریکیں چلانے کے ماہر تھے مگر اس جانب کبھی توجہ نہیں دیتے تھے کہ نوجوانوں میں یہ شعور بیدار کیا جائے کہ تعلیم یافتہ افراد ہر کاروبار ہر ہنر اور ہر صنعت اپنا کر پیسہ کما سکتے ہیں، شہرت حاصل کر سکتے ہیں خاندان کی کفالت کر سکتے ہیں۔ تعلیم اسی نوکری کے حصول کی بنیاد پر آج تک قائم ہے۔ ہر پڑھا لکھا بے کاری کی ذلت خوشی سے برداشت کر لیتا ہے۔ مگر ہنر مند اور کاروبار میں حصہ لینا خلاف شان تصور کرتا ہے۔

اس کے علاوہ لاہور میں پرنٹنگ پریس کافی لگ گئے۔ پہلے تو لیتھو پرنٹنگ کا دور تھا، جو پتھروں کی بھاری سلوں سے ہوتی تھی۔ بلاک سسٹم تھا پھر دوسرے پریس آ گئے، بہت سے ان پڑھ اور بیروزگار ادارے قائم ہو گئے۔ درسی کتابوں کا کام چھاپے خانوں میں زیادہ ہوتا اور آج بھی ہو رہا ہے تعلیم سے انجینئر بن گئے اور ڈریسر اور ڈیزائنر بن گئے۔ معماروں کا کام لاہور کے کاریگر بڑی نفاست اور خوبصورتی سے کرتے تھے۔ بڑے بڑے معمار کاریگر لاہور میں

موجود تھے اور ان کے قدر دان بھی بہت تھے۔ لاہور کی خوبصورت عمارتیں انہیں ہنرمندوں کے دست ہنر کا شاہکار ہیں۔ مغلیہ دور کے تعمیراتی حسن سے ہٹ کر انگریزی طرز تعمیر کا جدید دور شروع ہو چکا تھا۔ فلک بوس عمارتوں کا دور شروع ہوا تو پہلے مال روڈ پر خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں پھر بیرون شہر نئی خوبصورت عمارتوں نے شہر کو ایک نیا حسن عطا کیا۔

ریلوے ورکشاپوں میں ہزاروں لوگ کام کرتے تھے۔ اس دور میں بھی دیہات سے لوگ تلاش روزگار میں آتے تھے ہر آنے والے کو محبت سے گلے لگانا اس شہر کے خمیر میں رچا ہوا ہے۔ ایک پیسے کی روٹی دال مفت کا دور تھا، آنے والوں کو پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ شہر پر اس وقت سے ہی آبادی کا دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ سردیوں میں کشمیر سے ہاتو محنت مزدوری کے لیے آتے اور گرمیوں میں واپس چلے جاتے۔ ہاتو زیادہ تر لکڑی کے ٹالوں پر لکڑیاں پھاڑتے یا بوجھ وغیرہ اٹھا کر پیسے کماتے تھے۔ ان کے پاس کانگڑیاں ہوتیں۔ جن میں کوئلے جلا کر رات تاپتے، جب آتے تو اخروٹ اور خشک میوے لے کر آتے لوئیاں اور گرم دھسے لے کر آتے اور یہاں بیچ دیتے۔ رات گئے تک مل کر گاتے رہتے، جب جاتے تو کپڑوں کے کئی کئی جوڑے سلا کر پہن لیتے۔ ان سے لوگ پوچھتے کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو وہ بتاتے کہ ریاست کی حد میں داخل ہوتے ہی ہر نئے جوڑے پر بھاری ٹیکس لیا جاتا ہے، اس لیے بہت سے جوڑے پہن لیتے ہیں، کشمیریوں پر ظلم ان دنوں بھی کم نہیں ہوتا تھا۔

''سوہنا شہر لاہور'' طاہر لاہوری
بشکریہ: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء

سَت دِن تے اٹھ میلے

یونس ادیب

لاہوریوں کے بارے میں کسی نے یہ سچ ہی کہا ہے۔

سَت دِن تے اٹھ میلے
کم کراں میں کیہڑے ویلے

لاہور میں واقعی کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں کوئی نہ کوئی تہوار یا میلہ نہ منایا جاتا ہو، اگر کوئی اجتماعی تہوار یا میلہ نہ ہوتو محلوں اور گلیوں میں کوئی نہ کوئی مقامی میلہ ضرور منایا جاتا تھا، ہر محلے میں کوئی نہ کوئی مقدس تھڑی یا مزار ہوتا تھا، اگر لوہاری دروازہ میں حسو تیلی کا عرس منایا جاتا تو دوسرے دن وچھوالی میں ہر کی پوڑیوں کا میلہ شروع ہو جاتا۔

لاہور اگر میلوں کے شہر کے نام سے بھی جانا پہچانا جاتا ہے تو غلط نہیں ہے اور لاہور میں میلوں کی روایات تو صدیوں پرانی ہیں۔ لیکن زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ میلوں کے نام اور شکل وصورت بھی بدلتی رہی ہے۔ بعض میلے تو بالکل ہی ختم ہو گئے ہیں اور چند ایک یادگار کے طور پر کہیں کہیں منائے بھی جاتے ہیں۔

لاہور کی ثقافتی زندگی میں میلوں کا کردار بہت نمایاں ہے اور برسوں پہلے لاہوریئے میلوں ٹھیلوں کے لیے کام کاج ٹھپ کر دیتے تھے، اگر کوئی میلہ نہ بھی ہوتا تو لاہوریئے ہر تقریب کو میلے میں بدل دیتے تھے اور برسوں پہلے تو لاہور میں ہر صبح ایک نئے میل کے ساتھ طلوع ہوتی تھی، شاید جیجے کی ماں اگر جیجے سے یہ نہ کہتی کہ

جیجے کدی کم ول وی دھیان کر

تو جیجا کبھی یہ نہ کہتا کہ

''ماں اَست دن تے اَٹھ میلے　　　　　کم کراں میں کیہڑے ویلے''

میلوں کی ثقافتی حیثیت کی شناخت میں کبھی لاہور بہت سرگرم تھا اور اندرونِ شہر کے لوگوں کی زندگی میلوں ہی کی وجہ سے رنگین نظر آتی تھی، جو آپس کے میل جول، سنگت اور پیار محبت سے سجی ہوئی تھی، تاہم اس کا معاشرتی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور

''پلے نئیں دھیلہ تے کردی اے میلہ میلہ''

یہ اس دور کے میلوں کی بات ہے جب لین دین میں دھیلا بھی شمار ہوتا تھا، اور دھیلہ ایک ٹھوس حقیقت تھی، لاہور میں لگنے والے میلوں میں دھیلا بھی چلتا تھا، ایک دھیلے میں پیڑی والے جھولے کے پندرہ چکر ہوتے تھے دھیلے ہی کی پُوری آتی تھی، حلوہ مفت ملتا تھا اور بھکاری دھیلا پا کر لمبی چوڑی دعائیں دیتے تھے، اس لیے لاہوریوں کو میلوں میں شرکت کے لیے دو چار روپوں ہی کی ضرورت ہوتی تھی اگر وقت پر نہ ہوں تو لاہوریئے ادھار لے کر بھی میلوں کا استقبال کر لیتے تھے، لیکن میلے کو خالی جانے نہیں دیتے تھے۔

پرانے لاہور شہر کے وہ میلے جو اب تاریخ کے ملبے میں دب گئے ہیں، ان کی بعض جھلکیاں بڑی خوبصورت ہیں ان سے لوگوں کے رہن سہن، عقائد اور رسم و رواج کا گہرا تعلق ہے اور ان پر مقامی صنعت و حرفت کا بھی سایہ ہے۔

لاہور میں دو بڑے میلے قدموں کا میلہ اور چھڑیوں کا میلہ بہت مقبول تھے، یہ دونوں میلے لاہور کے بارہ دروازوں کے باہر باری باری لگتے تھے، اور ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک منتقل ہوتے تھے۔ قدموں کا میلہ کھانے پینے اور استعمالی چیزوں کا میلہ تھا اور چھڑیوں کے میلے کے پیچھے صدیوں پرانی ایک ایسی روایت تھی، جس کا رنگ ڈھنگ انداز اور طریقہ بہت مختلف تھا۔ موسم بدلتے ہی دیہاتی طرز کے سادھو سنت خاندان، عورتوں، بچوں، مردوں، بوڑھوں اور جوانوں سمیت لاہور کے دروازوں کے باہر ڈیرے لگا دیتے تھے، مردوں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں ہوتیں تھیں اور عورتیں رنگین چنیاں اور گھگھرے پہنتی تھیں ان کے زیورات چاندی کے ہوتے تھے اور وہ لمبا گھونگھٹ نکالتی تھیں۔

اندرونِ شہر میں قیامِ پاکستان سے پہلے چھڑیوں کے میلہ کا بڑی بے تابی سے انتظار کیا

جاتا تھا۔ عورتوں اور بچوں میں یہ میلہ بہت مقبول تھا اور لاہور میں بارہ روز تک منایا جاتا تھا لیکن لاہور کے بارہ دروازوں کے باسی یہ میلہ باری باری منایا کرتے تھے۔

چھڑیوں کا میلہ مستی دروازہ سے شروع ہوتا تھا۔ ممکن ہے۔ اس کا موسم کی تبدیلی سے بھی تعلق ہو۔ لیکن لاہور کی مسلمان عورتوں کا عقیدہ یہ تھا کہ چھڑیوں کے میلے مین چراغ جلانے سے سہاگ سلامت رہتے ہیں اور جو کنواریاں چراغ جلاتیں۔ وہ سہاگنیں ہو کر مرتی ہیں اور ان کے بچے ضائع نہیں ہوتے۔

چھڑیوں کا میلہ صرف مسلمان کاریگروں، دھوبیوں، درزیوں، نگین گروں، تیلیوں، کمہاروں، ماشکیوں، راجوں، مزدوروں، ترکھانوں، ٹوبوں، سناروں، گجروں اور پشمینے کی چادروں پر کڑھائی کرنے والے خاندانوں کی عورتیں، لڑکیاں اور اس میلے میں لاہور شہر کی چھوٹی ذاتوں اور کمتر طبقوں کے لوگ شریک ہوتے تھے، دکانیں بھی لگتی تھیں اور نچلے درجے کے گھروں میں استعمال ہونے والی چیزیں بکتی تھیں۔ چھڑیوں کا میلہ لاہور میں تین دن تک جاری رہتا تھا۔ دہلی دروازے سے شروع ہوتا تھا اور ایک ایک دروازے تک پہنچ کر پورے بارہ دنوں میں ختم ہوتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ چھڑیوں کا میلہ کس موسم میں لگتا تھا لیکن اس کا آغاز اس وقت ہوتا تھا جب شہر کی گلیوں، کوچوں اور محلوں میں دیہاتی ڈھولیئے آ جاتے تھے۔ وہ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں گلی گلی کوچے کوچے بکھر جاتے تھے اور سارنگی پر لوک دعائیہ گیت سنا کر بچوں کو لوریاں دیتے تھے۔ اور مائیں نقدی، گڑ، چاول اور آٹے کی صورت میں نذر دے کر گود کے بچوں کو لوریاں دلواتی تھیں، جن بچوں کی مائیں نہیں ہوتی تھیں، وہ لوری دینے والوں کے پیچھے پیچھے ایک ایک گلی اور ایک ایک کوچے میں گھومتے پھرتے تھے۔

لوریاں کی آواز چھڑیوں کے میلے کی ابتدائی پبلیسٹی کا کام دیتی تھی۔

میں لوری دیواں بال نُوں

جیویں دیوے مائی حلیمہ لوری محمد پاکؐ نوں

یہ دیہاتی فنکار ڈھولک اور سارنگی پر لوک لوریاں گاتے تھے، مائیں بہنیں، پھوپھیاں، تائیاں اور مامیاں بچوں کو لوریاں دلواتی تھیں۔ لوری دینے والا ساتھ ساتھ ناچتا بھی تھا۔

دیہاتی فنکاروں کی ٹولیاں گلی گلی گھومتیں اور لاہور کے بچوں کو لوریاں دیتیں بعض اوقات بڑے بچوں کو بھی کسی منت کے طور پر لوری دلوائی جاتی تھی اور لوریاں دینے والے صدقہ وصول کرتے تھے۔ اکثر بچوں کی مائیں ان فنکاروں کو کپڑے بھی دیتی تھیں ان فنکاروں کے ڈھولک بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ رنگین دھاگوں کی گچھیاں اور چھوٹے چھوٹے رنگین تکیئے بندھے ہوتے تھے۔ یہ فنکار جس گلی یا محلے میں جاتے بچے ان کے ساتھ پیچھے پیچھے چلتے رہتے۔ لوریاں دینے کے عوض فنکاروں کو پیسے، کپڑے اور کھانے پینے کی خشک چیزیں ملتی تھیں۔

چھڑیوں کے میلہ کی آمد سے پہلے ہی اندرونِ شہر میں عورتیں اور لڑکیاں رنگین دھاگوں کی گچھیاں اور جھالریں بنانا شروع کر دیتی تھیں، کمہاروں کی دکانوں پر مٹی کے دیئے اور لوٹے بکنے شروع ہو جاتے تھے، کڑوے تیل کے کولہو دن رات چلنے لگتے تھے، شاید چھڑیوں کا میلہ جمعرات سے جمعرات تک چلتا تھا اور اس کا آغاز مستی دروازے سے ہوتا تھا۔

مستی دروازے کے باہر والے رخ کی طرف مٹی کے لیپ سے بنی ہوتی تھڑیوں پر بسنتی پگڑیوں والے چھڑیئے بیٹھ جاتے تھے۔ تھڑی کے تین طرف لمبے لمبے بانس گاڑھ کر رنگین دوپٹے لٹکائے جاتے تھے، ان کے نیچے بانس کی چھڑیاں گاڑھ کر ان پر چھوٹے چھوٹے سرہانے رنگین پراندے اور موتیوں والی لڑیاں جھولتی تھیں اور تھڑی کے سامنے کڑوے تیل کے لوٹے اور دیئے ہوتے تھے۔

مستی دروازے کے باہر چھڑیوں کی یہ تھڑیاں دونوں طرف دور تک لگی ہوتی تھیں، ان کے درمیان خالی جگہوں پر قلفیوں، پکوڑوں اور مٹی کے کھلونوں کی دکانیں بھی لگ جاتی تھیں اور ڈھولوں کی تھاپ اور لوریوں کی گونج میں میلے کا افتتاح ہوتا تھا۔

مستی دروازے کے دونوں طرف کے باغوں میں درختوں پر جھولے بھی ہوتے تھے۔ لوریاں دینے والوں کی ٹولیاں جمع ہو جاتی تھیں، اور پھر اپنے اپنے محلے کی عورتیں، لڑکیاں اور بچے ایک ساتھ میلے میں شریک ہو جاتے تھے۔

تھڑیوں پر نئے چراغ روشن ہو جاتے، عورتیں اور جوان لڑکیاں منتوں کا تیل چڑھاتیں۔ ہر تھڑی پر تیل اور چراغ کا نذرانہ پیش کرتیں، بانسوں اور چھڑیوں پر رنگین دوپٹے،

رنگین ڈوریوں کے لچھے اور موتیوں والی جھالریں لٹکاتیں، تانبے کے سکے تیل کے لوٹوں میں پھینکتیں، نذر نیاز اور منت ماننے کے عمل سے فارغ ہو کر بچوں کو لوریاں دلوائی جاتیں، کوئی بہن اپنے بھائی کو لوری دلوانا چاہتی تو وہ ایک آنہ دے کر کہتی۔

بہن دی لوری ___ اور لوری دینے والے بچوں کو گود میں اٹھا کر بہن کی لوری گانے لگتے، اسی طرح وہ ماں کی لوری بھی گاتے، لوریوں سے فارغ ہو کر عورتیں اور لڑکیاں جھولا جھولتیں اور واپسی پر بیسن کے قتلمے اور پکوڑے خرید کر مستی دروازے کے اندر داخل ہو کر اپنے اپنے گھروں، کٹڑیوں اور کوٹھریوں کی طرف چل پڑتیں۔

عورتوں اور لڑکیوں کی مرادوں اور منتوں سے سجا ہوا چھڑیوں کا میلہ اگلی جمعرات کو اگلے دروازے پر منتقل ہو جاتا اور بارہ روز تک چھڑیوں کا میلہ لاہور کے بارہ دروازوں کا چکر لگا کر ختم ہو جاتا۔

جس جمعرات کو مستی دروازہ کے باہر چھڑیوں کا میلہ لگتا تھا، اندرونِ شہر کے ہر بڑے محلے میں کسی نہ کسی بزرگ کا میلہ بھی منایا جاتا تھا، اگرچہ چونہ منڈی میں کشمیری دروازہ کی گھاٹی پر تکیہ بلا کبوتر باز میں سالانہ میلہ منایا جا رہا ہوتا تو کوچہ ٹوبیاں میں گگا پیر کا میلہ منایا جاتا تھا۔ گگا پیر کا باقاعدہ کوئی مزار نہیں تھا، لیکن اس میلے کا تعلق چھڑیوں کے میلے سے بھی تھا۔ ممکن ہے، چھڑیوں کا میلہ چونکہ عورتوں، لڑکیوں اور بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس لیے اندرونِ شہر کے مرد اس روز اپنے میلے لگا لیتے تھے، کیونکہ چھڑیوں کے میلے میں مرد ہرگز شریک نہیں ہوتے تھے اور وہ یوں تکیوں، داروں، مزاروں اور خیالی تھڑیوں کے میلے منا لیتے تھے، گگا پیر بھی ایک خیالی تھڑی تھی اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ جب چھڑیوں کے میلے پر کسی سانپ نے سو برس بعد اپنی جون بدل لی تو گگا پیر نے چھڑیوں کے میلے میں آ کر جُون بدلنے والے سانپ کو پہچان لیا اور اسے دوبارہ سانپ بنا کر بوتل میں بند کر کے دریائے راوی میں پھینک آیا تھا۔ اندرونِ شہر کے پرانے مکانوں سے اکثر سانپ نکلتے رہتے تھے اور جس گھر سے سانپ نکلتا تھا وہاں گگا پیر کا دیا جلانا ضروری ہو جاتا تھا۔ اس روایت کی پیروی میں چھڑیوں کے میلے میں گگا پیر کا بھی چراغ جلانا ایک اہم رسم تھی۔

قدموں کا میلہ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک سفری میلہ ہے جو ہر وقت پنجاب

میں کہیں نہ کہیں لگا ہوتا تھا، لاہور میں قدموں کا میلہ لاہوریوں کی میلہ پسند طبیعت کا ایک چھوٹا سا شاہکار تھا، جو دہلی دروازہ سے شروع ہوتا تھا اور ہر ہفتے دوسرے دروازے میں منتقل ہو جاتا، پھر بارہ دروازوں کا چکر کاٹ کر آگے بڑھ جاتا تھا، اس میں بھی استعمالی اشیاء کی دکانیں لگتی تھیں اور کھانے پینے کی چیزیں بکتی تھیں۔ عورتیں ہانڈیاں، چولہے، چمٹے اور دوسرا سامان خریدنے آتی تھیں اور پیڑی والے جھولے جھولتی تھیں۔

کہے حسین فقیر سائیں دا

لاہور کے میلوں میں میلہ چراغاں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

یہ میلہ آج بھی پنجاب کے صوفی شاعری شاہ حسینؒ کے مزار پر مارچ کے آخری جمعہ کو منایا جاتا ہے۔ جنہیں لاہور کے لوگ مادھولال حسینؒ کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ میلہ چراغاں کبھی پنجاب کی ثقافت کا ایک پر جوش اظہار تھا اور پاکستان بننے سے پہلے بھرپور طریقے سے منایا جاتا تھا۔ اس میں امرتسر کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے اور یہ میلہ پورے لاہور میں ٹکسالی دروازہ سے باغبانپورہ تک پھیلا ہوتا تھا۔

میرا اس میلے سے زیادہ اس باطنی تحریک کے حوالے سے گہرا تعلق تھا، جس کا مرکز شاہ حسینؒ کی شخصیت تھی اور شاہ حسینؒ سے میرے والد کی موروثی عقیدت بھی شاہ حسینؒ سے میری قریب ترین نسبت کا اہم وسیلہ تھی، میری ماں بے جی مہتاب نے مجھے بتایا تھا کہ میں ۲۰ فروری کو پیدا ہوا تھا اور ابھی میری پیدائش کے چالیس دن بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ میرے والد مجھے سرخ گوٹے کا کُرتہ اور سُرخ گوٹے والی ٹوپیاں پہنا کر میلہ چراغاں پر لے گئے تھے اور مجھے مزار کے اندر لے جا کر دعائیں مانگی تھیں۔

جب تک میرے میاں جی حق نہ ہوئے، وہ مجھے اپنے ساتھ میلہ چراغاں پر لے جاتے تھے، میری ماں مجھے دوگھوڑا چائنا بوسکی کا نیا جوڑا اور نیا جوتا پہناتی تھی۔ شروع شروع میں میرا دھیان کھانے پینے کی چیزوں، کھیل تماشوں اور کھلونوں کی طرف بڑا گہرا تھا اور میری میلے سے دلچسپی کا یہی چیزیں کارن تھیں، لیکن میرے والد شاہ حسینؒ کے مزار پر نذرانہ پیش کر کے ملنگوں، درویشوں اور شاہ حسینؒ کے راگی مریدوں کی ٹولیوں میں بیٹھ جاتے تھے، ملنگوں اور

درویشوں سے سلام و دعا کرتے اور راگیوں سے شاہ حسینؒ کا کلام سنتے، پھر شالامار باغ میں مجھے لے آتے، جہاں لاہوریوں اور امرتسریوں نے ڈیرے لگائے ہوتے تھے۔

شاہ حسینؒ کے میلہ چراغاں پر شاہ کوٹ کے ننگے ملنگوں کی ایک سنگت سے میرے والد کے گہرے تعلقات تھے، یہ ننگے ملنگ مالن سائیں کا جھنڈ کہلاتے تھے اور ان ملنگوں اور درویشوں کے سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے ساندل بار کے علاقے میں دُلا بھٹی اور دُلا بھٹی کے والد فرید کی مغل شاہی کے خلاف جدوجہد کا ساتھ دیا تھا۔

میلہ چراغاں پر آنے والے ان ننگے ملنگوں کا گورو ایک ضعیف ترین شخص تھا، یہ سب کے سب سراسر ڈاڑھی اور ابرو تک منڈواتے تھے۔ بدن پر راکھ ملتے تھے اور صرف سیاہ لنگوٹ پہنتے تھے، ان ملنگوں کے گورو کی عمر اس وقت سو سال سے بھی زیادہ تھی، میں جب بھی میلہ پر ان ملنگوں کے ڈیرے پر والد کے ساتھ جاتا، ملنگوں کا بوڑھا گورو میرے ماتھے پر راکھ کا تلک لگاتا اور مالن سائیں کے نعرہ لگاتا۔ میرے والد میلہ سے کچھ خرید کر نہیں کھاتے تھے صرف ننگے ملنگوں کے ڈیرہ پر لنگر پانی کرتے تھے اور سارا دن میلے میں گزارنے کے بعد دوبارہ شاہ حسینؒ کے مزار پر آجاتے جہاں رات کے پچھلے پہر آخری دھمال دیکھ کر صبح کی نماز مزار سے ملحقہ مسجد میں ادا کرتے اور پھر شہر آنے والی کسی بیل گاڑی پر سوار ہو کر ہم گھر آجاتے۔

عام لاہوریوں کی نسبت میلہ چراغاں سے میرا رشتہ بہت مختلف تھا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، شاہ حسینؒ کے میلہ چراغاں کی معنویت میرے ذہن میں بدلتی رہی اور شاہ حسینؒ سے برسوں کی وابستگی نے کئی روپ بدلے، والد صاحب کی وفات کے بعد میں ہر سال اس میلے میں شریک ہوتا تھا اور آج ساٹھ سال کی عمر میں بھی جب میلہ چراغاں آتا ہے تو میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر باغبانپورہ پہنچ جاتا ہوں، میلے کا رنگ روپ اور طور طریقہ بدل چکا ہے۔ مزار کے آس پاس قبریں ہی قبریں ہیں اور ملنگوں درویشوں کی پرانی نسل نظر نہیں آتی، لیکن اس کے باوجود فقیروں اور ملنگوں کی ٹولیاں وہاں جشن مناتی ہیں اور لالوں کے لال شاہ حسینؒ کے نام کی مالا جپتی ہیں۔

شاہ حسینؒ سے عمر بھر کی وابستگی ایک تو میرے والد کی اس محبت کا فیضان ہے جس کے تحت وہ مجھے بڑے شوق سے میلہ چراغاں پر لے جاتے تھے اور دوسرے علمی ادبی ذوق اور مطالعہ

نے مجھے شاہ حسینؒ کی شخصیت کردار اور شاعری کو تاریخی اور نظریاتی سطح پر بھی سمجھنے میں بڑی فراخدلی سے مدد کی ہے۔

حضرت شاہ حسینؒ لاہوری مغل بادشاہ اکبر کے دور میں ہوئے ہیں، اور لاہور ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام عثمان تھا، ذات کے راجپوت اور پیشہ کے اعتبار سے جُلاہے تھے۔ بنیادی تعلیم ٹکسالی دروازہ کی ایک مسجد سے حاصل کی، بارہ سال کی عمر میں پورا قرآن مجید حفظ کیا، قرآن، حدیث، فقہ، شریعت اور طریقت کی تعلیم مولانا ابوبکر سے حاصل کی، ساری ساری رات راوی دریا میں کھڑے ہوکر قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور داتا علی ہجویریؒ کے مزار پر روزانہ حاضری دیتے تھے، اچانک ان کی ملاقات صوفی مرشد شیخ بہلول سے ہوئی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جذب و مستی کے غلبے میں آ گئے سر منڈوا دیا لال کپڑے پہنے اور پیروں میں گھنگھرو ڈال لیے۔

شاہ حسینؒ نے اپنے علم اور روحانی تجربے سے جو کچھ حاصل کیا، اس کے اظہار کے لیے شعری اسلوب تخلیق کیا اور جو فلسفہ انہوں نے پیش کیا، وہ حاکموں اور خود پرست عالموں کو قبول نہیں تھا، کمزور طبقوں، ماشکیوں، جولاہوں، موچیوں اور کمتر ہنر والوں سے ان کی سنگت کو بغاوت کا نام دیا گیا اور جذب و مستی میں ان کا ناچنا اور گانا اسلامی شرع کے منافی قرار دے کر اکبر کے نامزد چیف جسٹس عبدالنبی سلطان پوری نے انہیں مرتد، رافضی اور کافر کہنا شروع کر دیا، سرکاری طور پر لوگوں کو شاہ حسینؒ کے ساتھ ملنے جلنے سے روک دیا گیا۔ لیکن شاہ حسینؒ نے جو باطنی تجربہ کیا تھا۔ وہ بندے اور رب کے درمیان عشق کے رشتہ کی پہچان بن گیا تھا۔ شاہ حسینؒ وحدت الوجودی صوفی تھے اور ان کا رب سے عشق کا رشتہ لوکائی کے لیے اپنی ذات سے آشنائی کا ذریعہ بن گیا۔ سرکاری مولوی اور خطیب مسجدوں میں شاہ حسینؒ کے خلاف تقریریں کرتے تھے اور شاہ حسینؒ کے پاس لوگوں سے رابطہ کا ذریعہ صرف شاعری تھی اور وہ کافیاں لکھتے تھے جنہیں ان کے راگی مرید گا کر پنجاب کے گوشے گوشے میں پہنچا رہے تھے۔ شاہ حسینؒ نے لوگوں تک اپنے خیالات پہنچانے کے لیے عام استعمال کی چیزوں کو علامت بنایا۔ سرکاری خطیب اور چیف جسٹس عبدالنبی سلطان پوری نے کئی زہریلی رپورٹیں اکبر کو بھیجیں لیکن اکبر نے شاہ حسینؒ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔

ایک دن اکبر لاہور کے شاہی قلعہ کے شمالی برج میں بیٹھا دریا کا نظارہ کر رہا تھا کہ شاہ حسینؒ دھمال ڈالتے ہوئے اپنے مریدوں کے ساتھ گزرے، ان کے ہاتھ میں ایک بوتل اور پیالہ تھا، چیف جسٹس عبدالنبی سلطان پوری پاس ہی کھڑا تھا، اس نے اکبر سے کہا کہ شاہ حسینؒ سرعام شراب پیتا اور ناچتا گاتا ہے۔

اکبر نے اشارہ کیا اور شاہ حسینؒ کو کمند پھینک کر اوپر برج میں کھینچ لیا گیا۔ اب اکبر نے شاہ حسینؒ ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

اکبر نے پوچھا، سنا ہے آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا تک پہنچے ہوئے ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ خدا تک کیسے پہنچے۔

شاہ حسینؒ نے جواب دیا۔ جیسے میں تم تک پہنچا ہوں۔

اکبر نے بوتل کی طرف اشارہ کر کے کہا، اس میں کیا ہے؟

''شربت'' شاہ حسینؒ نے جواب دیا۔

''مجھے بھی پلاؤ۔'' اکبر نے کہا۔

شاہ حسینؒ نے پیالہ بھر کر اکبر کو دیا تو وہ سچ مچ شربت تھا اور اکبر نے شاہ حسینؒ کو عزت کے ساتھ رخصت کیا لیکن چیف جسٹس عبدالنبی خون کے گھونٹ پی کر گیا، اکبر کے خلاف دُلا بھٹی کی مزاحمتی تحریک ان دنوں عروج پر تھی، بعض تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ دُلا بھٹی شاہ حسینؒ کا مرید تھا اور اکبر کے خلاف بغاوت میں چھوٹے طبقہ کے لوگ شاہ حسینؒ کی تعلیمات کے اثر میں شریک ہوئے تھے۔

مادھو شاہدرہ کے ایک ہندو جاگیردار کا بیٹا تھا، جو شاہ حسینؒ کے رنگ میں ایسا رنگا گیا کہ شاہ حسینؒ کے ساتھ ہی دفن ہوا۔

کہتے ہیں کہ جب دُلا بھٹی کو میانی صاحب لاہور میں پھانسی دی گئی تو شاہ حسینؒ لاہور کی کوتوالی میں زیرِ حراست تھے لیکن لوگوں نے دیکھا کہ جس جگہ دُلا بھٹی کو پھانسی دی گئی شاہ حسینؒ وہاں بھی موجود تھے۔

مغل شاہی کے دشمن اور چھوٹے طبقوں کے دوست ہونے کی وجہ سے شاہ حسینؒ اپنے زمانے کی ریاستی مشینری کے ہاتھوں سخت ستائے گئے تھے اور عالموں نے انہیں کافر قرار دیا تھا

اس لیے مغل عہد کے زوال تک شاہ حسینؒ کا عرس منانے پر پابندیاں عائد تھیں اور جونہی مغل شاہی کمزور ہوئی تو لوکائی نے اپنے راہبر کا عرس منانا شروع کر دیا اور پھر رفتہ رفتہ شاہ حسینؒ کا عرس پنجاب کے لوگوں کا میلہ بن گیا۔

رنجیت سنگھ نے پنجاب کی حکومت سنبھالی تو وہ اپنے سرداروں، امیروں اور وزیروں کے ساتھ بسنتی کپڑے پہن کر میلہ چراغاں میں شریک ہوتا تھا، مزار پر اشرفیاں نذر کرتا تھا اور ملنگوں، درویشوں اور فقیروں کے لنگر کا بندوبست کرتا تھا، محمد دین فوق اور مولوی نور احمد چشتی نے شاہ حسینؒ کے عرس پر پنجاب بھر کے لوگوں کی شرکت کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ شاہ حسینؒ کے نام سے میلہ چراغاں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اور آج بھی میلہ چراغاں پر شاہ حسینؒ کے مزار پر دور دور سے لوگ ناچتے گاتے اور دھمالیں ڈالتے آتے ہیں اور چراغوں کی رات ہزاروں دیئوں کی لاٹ ایک لبو بن کر آسمان کی طرف اٹھتی ہے اور یوں لگتا ہے، جیسے روحانی بیداری کی منزلوں کی طرف اس دھرتی کے لوگوں کا سفر جاری ہے۔ شاہ حسینؒ کا کلام پورے برصغیر میں علم وعرفان کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے اور گلوکاران کے کلام کو پوری مہارت اور لگن سے گاتے ہیں۔

انہوں نے اپنا کلام اس وقت تخلیق کیا جب نہ تو اخبارات تھے، نہ ریڈیو تھا، نہ ٹی وی تھا، اور نہ ہی ان کا مقصد کلام کی تخلیق سے یہ تھا کہ وہ لوگوں میں مشہور ہوں، اور نہ ہی چھاپے خانے تھے کہ ان کا کلام چھپتا، لیکن چار سو سال سے ان کی کافیاں زندہ سچائیوں کی طرح نسل در نسل منتقل ہو رہی ہیں اور یہ ان کے فکر کی سچائی اور تخلیقی جوہر کے تابناک ہونے کا ثبوت ہے کہ میلہ چراغاں ایک تاریخی حقیقت بن چکا ہے، جو دراصل عوام کے میل جول، پیار اور انسانی احترام کی قدروں کا امین ہے۔

شاہ حسینؒ کے میلہ چراغاں کی خوشبوئیں اور روایات موسمی بھی ہیں اور روحانی جاگرتی کا ذریعہ بھی۔ اس وقت پنجاب میں بہار کا موسم ہوتا ہے اور پنجاب میں فصلیں پک کر تیار ہو چکی ہوتی ہیں اور لاہور میں بہار کی ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اسے لاہور میں گلابی موسم کہا جاتا ہے۔ پہلے لاہور میں قدم قدم پر مٹھائی اور بیسن کے قتلمے تیار کرنے والی دکانوں پر شامیانے لگ جاتے تھے اور کاریگر دن رات مٹھائیوں کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔

یہ میلہ شاہ حسینؒ کے مزار سے شالامار باغ کے اندر لگتا تھا اور مارچ کے مہینے کے آخری ہفتے کی پہلی اتوار کو لگتا تھا۔ ہفتہ کی شام سے پہلے ہی لاہوریوں کی ٹولیاں دریاں اور دوسرا سامان لے کر شالامار باغ میں پہنچ جاتی تھیں اور پکوان پکنے لگتے تھے، اس روز شہر کے سارے راستے باغبانپورہ کی طرف جاتے تھے، ہر گھر میں چراغوں کے میلے کی رونقیں بڑھ جاتی تھیں۔

عید بقر عید کی طرح چراغوں کے میلے پر بھی نئے کپڑے اور جوتے خریدے جاتے تھے اور لاہوریئے اپنے مخصوص پہناوے کا بھی مظاہرہ کرتے تھے۔ رنگین پھولوں والی دھوتیاں، لاچے، چکن اور بوسکی کے کُرتے اور طلّے کی جوتیاں بڑے شوق سے پہنتے تھے۔

ہفتے کی شام تک دہلی دروازے سے شالامار باغ تک میلے کا ایک طرح جلوس پھیلا ہوتا تھا، تانگوں اور بیل گاڑیوں پر باغبانپورہ تک جانا پڑتا تھا اور کچھ زندہ دل پیدل ہی گھوڑے شاہ کے راستے بھوگیوال سے ہوتے ہوئے باغبانپورہ پہنچ جاتے تھے جہاں شاہ حسینؒ کے مزار کے وسیع و عریض احاطے میں ملنگوں، درویشوں اور فنکاروں کے کیمپ سے لگے ہوتے تھے، اس وقت بھی مزار پر چڑھانے کے لیے چادروں کے جلوس وہاں آتے تھے اور چراغاں شروع ہو جاتا تھا۔ ڈھول کی تھاپ پر دھمالیں ڈالی جاتی تھیں اور مزار پر چراغ روشن ہونے لگتے۔

یہ چراغاں رفتہ رفتہ ایک بہت بڑے الاؤ میں بدل جاتا اور جیسے جیسے الاؤ بڑھتا جاتا، میلے کا سماں رنگین اور پُر جوش ہو جاتا، عورتیں، بچے اور مرد مزار پر پھولوں کا نذرانہ پیش کرتے اور دھمال ڈالنے والی ٹولیاں ڈھولک کی تھاپ پر رقص کرتے کرتے مزار تک آتیں۔ طواف کرتیں اور دوسری طرف نکل جاتیں۔ ادھر گمنام راگی روایتی سازوں پر شاہ حسینؒ کا کلام گا رہے ہوتے اور تمام رات رَت جگا سا جاری رہتا ہر ڈیرے اور ہر کیمپ کے باہر چراغ روشن ہوتے، لوگ درویشوں اور ملنگوں کی زیارت کرتے۔ کچھ دیر ان کے ڈیروں کے باہر کھڑے رہتے اور آگے چل دیتے، سرخ چوغوں اور سرخ ٹیکوں والے ملنگ گھومتے پھرتے نظر آتے، ہر جگہ چائے کا دور جاری ہوتا اور تمام رات لنگر تقسیم ہوتا رہتا۔

جب رات بھیگ جاتی اور آخری پہر کے ختم ہونے میں کچھ دیر باقی ہوتی تو آخری دھمال کی تیاریاں شروع ہو جاتیں، سرخ کپڑے والے ملنگ پیروں میں گھنگھرو باندھنے لگتے اور ماہر ڈھولیے ڈھول لے کر میدان میں آ جاتے۔

پہلے ڈگے کے ساتھ ہی دھمال شروع ہو جاتی اور رات اس سے پوری فضا رقص میں ہوتی۔ مستی کی لہریں پھیل جاتیں، کہتے ہیں اس دھمال میں شاہ حسینؒ بھی روحانی طور پر شریک ہوتے تھے۔ اور دھمال کا یہ منظر اس وقت اتنا طاقتور ہوتا جب ملنگ ہونٹوں سے سنکھ لگا کر اپنے دم کا مظاہرہ کرتے اور سنکھوں کی آوازوں سے دھمال کے دائرے اور زیادہ تیز ہو جاتے، اچانک سرخ جوڑوں والے ملنگوں کا ٹولہ نمودار ہوتا، وہ ایک ساتھ پانچ چھ سنکھ بجاتے اور ان کی آوازوں کے عروج کے بعد جب سنکھ دھیمے ہو جاتے تو دھمال آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگتی اور پھر صبح کی اذان سے صرف چند لمحے پہلے دھمال ختم ہو جاتی۔ اذان کے بعد پھر ایسی خاموشی طاری ہو جاتی جیسے ہر شے پر سناٹا چھا گیا ہو۔ میری بڑی بہن کے سسرال بھی باغبانپورہ میں تھے اور ہم تقریباً ایک دن پہلے وہاں پہنچ جاتے تھے۔ جس گلی کے گھر میں ہم ٹھہرتے تھے، وہ شاہ حسینؒ کے مزار سے تھوڑی دور تھا اور میں جتنے دن بھی وہاں رہتا، میلے میں ہی موجود ہوتا، کسی وجہ سے کسی سال ہم سب گھر والے اگر باغبانپورہ نہ جا سکتے تو میرے والد میلے کے روز ہی مجھے صبح صبح وہاں لے جاتے۔

اس وقت لاہور کے آس پاس کے دیہاتوں سے میلہ دیکھنے والوں کی ٹولیاں لاہور پہنچ چکی ہوتی تھیں، لاہور کے بازاروں میں بولیاں سنانے والے دیہاتیوں کی ٹولیاں بکھر جاتیں، انہوں نے لکڑی کے گالہڑ اٹھائے ہوتے جن سے بندھی ہوئی ڈوریاں ان کے ہاتھوں میں ہوتیں اور وہ لکڑی کے پول پر گالہڑ نچاتے، بولیاں گاتے اور بھڑکیں مارتے ہوئے گزرتے تو پورا لاہور انہیں دیکھنے اور بولیاں سننے کے لیے گھروں سے باہر آ جاتا۔

اکثر دو ٹولیوں کا آمنا سامنا ہوتے ہی بولیوں کا مقابلہ شروع ہو جاتا اور فی البدیہہ بولی بولنے والوں کی ٹولی جیت جاتی۔ یہ بولیاں پنجابی رہن سہن کا بے باکانہ اور ٹھیٹھ اظہار ہوتیں تھیں اور بعض بولیوں میں جنسی علامتوں کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان بولیوں میں لاہور کے شہریوں کو بھی مذاق کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اور لاہوریئے اپنے بارے میں بولیاں سن کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ پھر یہ ٹولیاں پیدل ہی شالامار باغ کی طرف چل پڑتیں، اس وقت شالامار باغ کے ساتوں تختے لوگوں سے بھرے ہوتے اور وہاں قدم رکھنے کی جگہ باقی نہ رہتی، دیہاتی میلے سے واپسی پر دکانوں سے بیلوں کے گلوں میں باندھنے کے لیے

گھنٹیاں، گھنگھرو اور دوسرا سجاوٹ کا سامان خریدتے، مٹی کے برتن، لکڑی کے زراعتی آلات اور دوسرا سامان خرید کر اپنے ساتھ لے جاتے اور لاہوریئے چراغوں کے میلے کی آخری شام وہاں گزار کر شہر میں واپس آنے لگتے۔

دوسرے دن چراغوں کا میلہ صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا، دیہاتی اور شہری عورتوں کا ایک ہجوم وہاں جمع ہو جاتا، کھانے پینے کی چیزیں بکتیں، عورتیں اور لڑکیاں لکڑی کے پنگھوڑوں میں بیٹھتیں اور شاہ حسینؒ کے مزار پر منتوں کے چڑھاوے چڑھاتیں لاہور میں چراغوں کا میلہ واحد ایسا میلہ تھا جس میں ایک دن صرف عورتیں ہی شریک ہوتی تھیں اور اس روز مردوں کا داخلہ وہاں بند ہوتا تھا۔ پولیس وغیرہ کا خاص انتظام تو نہیں ہوتا تھا لیکن مرد خود ہی اس طرف جاتے ہوئے شرم محسوس کرتے تھے۔

چراغوں کا میلہ لاہور کی ثقافتی زندگی کا رنگین ترین حصہ تھا اور لاہور میں بہار کا موسم چراغوں کے میلے سے اپنے عروج پر آ جاتا، لیکن میلوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ اپریل کا مہینہ شروع ہوتے ہی بازاروں میں چھولیا بکنا شروع ہو جاتا تھا اور یہ پنجاب میں بیساکھی کے میلے کی آمد کا نشان تھا، پنجاب میں فصلوں کی کٹائی ختم ہو جاتی تھی اور کسان کام کاج سے فارغ ہو کر بیساکھی کے میلے کی تیاریاں کرنے لگتے تھے۔ بیساکھی کا مرکزی میلہ لاہور سے تیس پینتیس میل دور ایمن آباد میں لگتا تھا لیکن لاہور کے لوگ یہ میلہ دریائے راوی کے کنارے مناتے تھے اور اس میں زیادہ تر صرف ہندو اور سکھ آبادی شریک ہوتی تھی۔

بیساکھی کی صبح ہونے سے پہلے پہلے لاہور کے ہندو اور سکھ راوی دریا کی طرف چل پڑتے تھے۔ راوی کے مشرقی کنارے پر ریل کے پُل اور عام پُل کے دونوں طرف گھنے ذخیرے ہوتے تھے۔ دونوں پُلوں کے درمیان دریائی کنارے پر جانے کے لیے مین سڑک کو استعمال کرنا پڑتا تھا اور پُل کے دونوں طرف پتھروں کی ڈھلوان تھی، ڈھلوان سے نیچے دریا کا کنارہ تھا جہاں کشتیوں کی قطار پُل کے نیچے سے آگے گئوشالا تک چلی جاتی تھی۔ یہ ہندو آبادی کی جگہ تھی جہاں صبح ہی صبح ہندو نوجوان ورزش کرتے تھے اور بیساکھی کے دن یہاں ایک ہجوم ہوتا تھا۔

تانگوں، سائیکلوں اور ذاتی گھوڑا گاڑیوں کا سلسلہ گئوشالا اور مین سڑک تک پھیلا ہوتا

تھا۔ اور راوی روڈ کی طرف سے گئوشالا اور سڑک کے درمیان ایک گھنا ذخیرہ تھا، بیساکھی والے دن ہندو اور سکھ گھرانے اس ذخیرے سے گزر کر گئوشالا تک آتے تھے۔ پُل سے لے کر گئوشالا تک بیساکھی کا میلہ لگتا تھا۔ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے تھے۔ ہندو اور سکھ دریا میں نہاتے تھے اور نہانے کے بعد دریا کا پانی گھروں میں لے جاتے تھے، صبح ہی صبح دریا پر سینکڑوں ہزاروں لوگوں کے جمع ہونے کا سین اور زیادہ خوبصورت ہو جاتا تھا۔

عورتوں کے نہانے کے لیے دریا کے کنارے کا ایک خاص علاقہ دریا میں الگ تھلگ قرار دے دیا جاتا تھا، جہاں ہندو عورتیں، نوجوان شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکیاں نہاتے وقت جسم پر ایک دھوتی سی ڈال لیتی تھیں، یا شلوار قمیض سمیت دریا میں ڈبکیاں لگاتی تھیں نہانے کے بعد وہ کنارے پر آ کر کپڑے بدلتی تھیں۔

مرد اس علاقہ سے دور رہ کر نہاتے تھے اور پُل پر سے دریا میں چھلانگیں لگانے والے تیراک وہاں آنے والوں کے لیے دلچسپی کا مرکز بنے ہوتے تھے، بیساکھی کے روز دریا میں نہانے کا عمل سورج کے پوری طرح طلوع ہونے تک جاری رہتا اور جونہی دھوپ تیز ہو جاتی دریا پر بیساکھی کا تہوار منانے والوں کے قافلے گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے لیکن دریا کی سیر کرنے والے شام تک وہاں آتے رہتے اور چہل پہل کا سماں شام ہوتے ہی ختم ہو جاتا۔

ایمن آباد میرے ننھیال کا قصبہ تھا اور کبھی کبھی لاہور کے اِکاّ دُکاّ مسلمان گھرانے ایمن آباد میں بیساکھی کا میلہ دیکھنے چلے جاتے تھے، یہاں پنگھوڑے، تھیٹر اور دکانیں لگتی تھیں، کبڈی کھیلی جاتی تھی اور سکھ پہلوان، بینی پکڑنے والے اور دوسرے کرتبی لوگوں کو مقابلے کی دعوت دیتے تھے۔ شرابی تماشائیوں کی وجہ سے یہ مقابلے عموماً لڑائی جھگڑوں کی نذر ہو جاتے تھے اور وہ لاٹھی چلتی کہ عام بھگدڑ مچ جاتی، لیکن کسی ایک پارٹی کے پسپا ہوتے ہی میلہ دوبارہ شروع ہو جاتا اور خون آلود کپڑوں والے بڑے فخر کے ساتھ میلے میں پھرتے تھے۔

اندرونِ شہر لاہور کے چوک پرانی کوتوالی میں ایک ہندو پہلوان ''پُنّی'' ہوتا تھا اور ہر سال ایمن آباد میں بیساکھی کے میلے پر لنگر لنگوٹ کس کر چیلنج کیا کرتا تھا۔ پُنّی پہلوان کا قد چھوٹا تھا لیکن بے حد پھرتیلا تھا وہ لوگوں کے کھلے پِڑ میں دونوں بازوؤں پر ہاتھ مارتا ہوا چکر لگاتا اور جگہ جگہ رُک کر آواز لگاتا۔

''ہے کوئی جیہڑا پُنی پہلوان نال ہتھ جوڑی کرے۔''

پُنی پہلوان کو چھوٹے قد کا پہلوان سمجھ کر بڑے بڑے گرانڈیل سکھ اور موٹے تازے پہلوان اس کا چیلنج قبول کر لیتے، وہ میدان میں اُترتا، ڈھول بجنے لگتے اور پُنی پہلوان آناً فاناً مقابلے پر آنے والے کو چت کر دیتا اور پیڑ اسے زبردست داد دینے لگتا۔ جب کوئی مقابلہ کرنے والا باقی نہ رہتا تو پُنی پہلوان ڈھول کی تھاپ پر لڈی ڈالتا ہوا پورے پیڑ کا چکر لگاتا اور اس کو پیڑ کی جانب سے پیسے دیئے جاتے۔

پُنی پہلوان لاہور کا رہنے والا تھا لیکن ایمن آباد میں بیساکھی کے میلے کا ہیرو تھا اور بیساکھی کے میلے پر ایمن آباد آنے والے پُنی پہلوان لاہوریئے کی کشتی ضرور دیکھتے تھے۔ جب وہ پیڑ میں کسی پہلوان کو گراتا تو لاہور کے حوالے سے وہاں موجود لاہوریوں کو بڑی خوشی ہوتی اور لاہور کے ہندو اور مسلمان اکھاڑوں میں پُنی پہلوان کا تذکرہ کئی کئی دن جاری رہتا۔

بیساکھی بھی گزر جاتی اور مئی جون کی گرمی سے لاہور جھلسنے لگتا تو ایک دم ساری کی ساری سرگرمیاں ماند پڑ جاتیں لیکن ''سات دنوں اور آٹھ میلوں'' والی بات غلط نہیں تھی، کیونکہ مسلمانوں کے تہوار کچھ سالوں بعد کبھی گرمیوں میں آ جاتے تھے اور کبھی سردیوں میں۔

دسویں محرم اور عیدین

لاہور شہر میلوں ٹھیلوں، عید، شب برات، معراج شریف اور عید میلاد النبی کی تقریبات کی وجہ سے ہمیشہ میلے کی موڈ میں رہتا تھا اور اسلامی سال کا آغاز محرم سے ہوتا تھا۔

لاہور میں محرم کا چاند طلوع ہونے سے پہلے ہی لاہور کے امام باڑوں کی نئے سرے سے ترتیب و تزئین ہونے لگتی تھی اور ایک سوگ کی فضا طاری ہونے لگتی تھی۔ لاہور کے مسلمان خواہ وہ شیعہ ہو یا سُنی، محرم کا بے پناہ احترام کرتے تھے اور اپنے اپنے انداز سے محرم کا استقبال کرتے تھے۔ کارپوریشن کی طرف سے گلیوں اور محلوں کی خاص طور پر صفائی کی جاتی تھی اور جگہ جگہ عارضی نلکوں کے کنکشن لگائے جاتے تھے، سردیاں ہوں یا گرمیاں، محرم کے دنوں میں اندرونِ شہر میں سبیلیں لگنا شروع ہو جاتی تھیں۔ گرمیوں میں ان سبیلوں پر ٹھنڈے میٹھے مشروبات پیش کیے جاتے تھے اور سردیوں میں سبز الائچیوں والی چائے پلائی جاتی تھی۔ موچی

دروازہ، محلہ خراسیاں، بازار سریانوالہ، بھاٹی گیٹ، چوک پرانی کوتوالی، کشمیری بازار، ڈبی بازار اور اندرون لوہاری دروازہ میں زیبائشی سبیلیں لگتی تھیں۔ یہ بڑی دلکش اور دیکھنے کے لائق ہوتی تھیں، ان میں نادر کھلونے، پہاڑی مناظر شہری عمارتیں اور فوارے لگائے جاتے تھے اور لوگ اپنی اپنی سبیلوں کے لیے سارا سال نوادرات جمع کرتے رہتے تھے۔ شہر کے پرانے اور کھاتے پیتے گھروں سے فانوس، جھاڑ اور مذہبی کتبے عارضی طور پر مانگ کر سبیلوں پر سجائے جاتے تھے، اسلام کی برگزیدہ ہستیوں کے مزاروں اور مقبروں کے ماڈل بنائے جاتے تھے۔ ان سبیلوں کے قریب ہی دسویں محرم تک وعظ وعزا کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ ذاکر، نوحہ خواں اور مرثیہ گو کربلا کے واقعات پیش کرتے تھے اور علماء دین امام حسینؑ کی عظمت وفضیلت پر روشنی ڈالتے تھے۔

جب عزاداروں کے جلوس ان سبیلوں کے پاس سے گزرتے تو ان پر پھول برسائے جاتے اور گلاب دانوں سے گلاب چھڑکا جاتا۔ محرم کے دس دنوں تک لاہور کے مسلمان گھرانوں کے افراد ان سبیلوں کو دیکھنے آتے تھے، شاہی محلے میں قیامِ پاکستان سے پہلے ایک عظیم الشان سبیل لگائی جاتی تھی اور اس دور میں اس کی تیاری پر ہزاروں روپے خرچ کرتے تھے۔ ہندو اور سکھ عقیدت منداس سبیل کی آرائش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اس قسم کی ایک سبیل اندرون موچی دروازہ میں لگائی جاتی تھی اس کی نمایاں خصوصیت میدان کربلا کا نقشہ تھا جسے ماڈلوں کے ذریعے تیار کیا جاتا تھا اور یوم عاشورہ کو شہادت کے واقع کی وضاحت کرتا تھا محرم کی سبیلوں کے نئے سے نئے ڈیزائن بنانے میں خدا بخش کی بڑی شہرت تھی اور اس کی فنکارانہ مہارت ہر جگہ مانی جاتی تھی۔

لاہور کی مرکزی مجلس تو موچی دروازے میں ہوتی تھی لیکن بھاٹی دروازہ کے اندر امام باڑہ سیّدہ مبارک بیگم کی مجلس بہت نمایاں تھی، یہ امام باڑہ کوچہ فقیر خانہ کے سامنے ایک گلی میں تھا اور اندر سے بہت وسیع وعریض تھا۔ اس کے علاوہ حویلی نثار شاہ نارووال امام باڑہ واجد علی شاہ، حویلی نواب صاحب اور محلہ چہل بیباں میں منعقد ہونے والی مجالس میں لکھنؤ کے مشہور عالم اور مرثیہ گو خاص طور پر شرکت کرتے تھے جن میں میر انیس کے پوتے جلیل لکھنوی کے علاوہ علامہ علی نقی اور فنا بنارسی کے نام بھی سننے میں آتے تھے، اندرون موچی دروازہ چوک نواب صاحب

میں تو تقریباً ہر گھر کا اپنا ذاتی امام باڑہ تھا۔ جو شہدائے کربلا اور اہل بیت کے مقدس ناموں سے منسوب ہوتا، اسی طرح چونا منڈی، سانده کلاں، فاروق گنج، چوہٹہ مفتی باقر میں بھی امام باڑے تھے اور امام باڑہ سیّدہ مبارک بیگم، شاہی محلہ بی بی پاک دامناں کٹڑہ الف شاہ، امام باڑہ شمیسہ، امام باڑہ امیر پہلوان اور ارسطو جاہ مزنگ سے محرم کے مخصوص دنوں پر ذوالجناح، عَلم اور تعزیہ کی زیارتیں برآمد ہوتی تھیں۔

دسویں محرم تک لاہور میں الگ الگ انداز سے امام حسینؑ سے عقیدت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ مائیں شیعہ ہوں یا سُنّی، اپنے بچوں کو زندگی، ترقی اور حفاظت کے عقیدے سے امام حسینؑ کا فقیر بناتی تھیں۔ کوئی ماں اپنے بچے کو سبز جوڑا پہناتی کوئی اس کے پیروں اور ہاتھوں میں زنجیریں ڈال کر منت مانتی۔ عمر کی طے شدہ حد تک بچوں کو مانگ کر سبز کپڑے پہنائے جاتے تھے اور کھیر کی ''ٹھوٹھیاں'' بھری جاتی تھیں، اس کو گنج بھرنا بھی کہتے تھے، اس کے علاوہ بچوں کو امامؑ سے منسوب کرنے کے لیے دودھ کی کٹوریاں بھری جاتی تھیں، امیر گھر دودھ چاندی کی کٹوریاں میں بھر کر آس پاس کے بچوں کو پلاتے تھے اور غریب مسلمان مٹی کے آبخورے استعمال کرتے تھے، بعض شیعہ گھرانے حضرت امام زین العابدین کی نسبت سے اپنے بچوں کو بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہناتے تھے اور ایسے تمام بچوں کو جو محرم کے دنوں میں امام کے فقیر بنائے جاتے تھے، ان سے امام کے نام پر پیسے منگوائے جاتے تھے لوگ خوشی سے ایسے بچوں کو پیسے نذر کرتے تھے اور ان پیسوں میں ذاتی فنڈ ڈال کر نیازیں دلوائی جاتی تھیں۔

پانچویں محرم کو لاہور والے بابا فرید کی میٹھی کھچڑی کی نیاز بھی دیتے تھے۔ مزنگ، باغبانپورہ، شاہدرہ اور اندرونِ شہر کی عورتیں گھروں میں چاول، چنے کی دال اور گڑ کی کھچڑی پکاتی تھیں اور خاندانوں کے خاندان کھچڑی کی پتیلیاں، دیگچے اور دیگیں تانگوں میں رکھ کر بابا فرید کے ٹیلے کی طرف صبح ہی صبح روانہ ہو جاتے تھے۔ بابا فرید کا ٹیلہ آج بھی کچہری اور ایس پی کے دفتر کے پیچھے موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ بابا فرید ہر چاند کی پانچویں تاریخ کو پاکپتن سے لاہور تشریف لاتے تھے۔ داتا دربار کے مزار پر حاضری دیتے تھے اور اس ٹیلے پر قیام کرتے تھے۔

اس ٹیلہ پر پانچویں محرم کو بڑا رش ہوتا تھا اور لاہور کی عورتیں اپنے اپنے مسائل کے حل

کے لیے یہاں منتیں مانتی تھیں اور کھچڑی تقسیم کرتی تھیں۔ یہاں آ کرانہیں قدرے آزادی ہوتی تھی۔لڑکیاں، بچے،عورتیں اور مرد اس اجتماع میں شریک ہوتے تھے اور مغرب کی اذان کے بعد یہ تقریب ختم ہو جاتی تھی۔

پانچویں محرم تک محرم کی مجالس امام باڑوں میں جاری رہتیں اور اس دوران ماتمی جلوسوں کے انتظامات مکمل کر لیے جاتے۔ جن راستوں سے ماتمی اور زیارتوں کے جلوس گزرنے ہوتے، ان میں سبیلیں لگ جاتیں۔ اپنے اپنے محلے کے لوگ ساری ساری رات ان سبیلوں پر بیٹھے رہتے اور آس پاس کے گھروں کی عورتیں بھی ہمسائے کے ان گھروں میں آ جاتیں جو ماتمی جلوسوں کے راستوں میں واقع ہوتے تھے، یہ جلوس گلی محلوں سے وقفے وقفے کے بعد گزرتے تھے، کبھی جھولے کا جلوس آ جاتا، رات کے بارہ بجے کے بعد ماتم کی آوازیں عجیب و غریب محسوس ہوتی تھیں اور رات کی خاموشی میں ماتمی ٹولیوں کے ساتھ ماہر نوحہ گروں کی آوازیں فضا کو غمزدہ بنا دیتی تھیں۔

ساتویں محرم کو پورے اندرون شہر میں سات ذوالجناح نکلتے تھے جو اپنے اپنے روٹوں سے ہوتے ہوئے چوک نواب صاحب میں آ جاتے تھے، رات کو جھولے اور مہندی کے جلوس گزرتے تھے اور اپنے اپنے اختتامی مقاموں پر پہنچ کر وداع ہو جاتے تھے۔ ان میں بچے، عورتیں اور ہر عمر کے لوگ سامل ہوتے تھے اور شیعہ گھرانے پورے دس دن سیاہ کپڑے پہنتے تھے، گھروں میں کچھ نہیں پکاتے تھے۔ ننگے پاؤں زیارتوں کے جلوس دیکھنے کے لیے بازاروں میں گھومتے تھے اور نذر و نیاز پر گزارہ کرتے تھے۔ عورتیں مکمل سیاہ کپڑے پہنتی تھیں لیکن مرد صرف قمیض یا کُرتہ سیاہ پہنتے تھے۔ لیکن شلواریں سفید ہوتی تھیں۔ کچھ سنی عقیدہ رکھنے والے بھی سیاہ قمیض اور سفید شلوار پہن لیتے تھے۔

کچھ سُنّی اداروں نے تعزیہ (روضہ امام حسین کی شبیہہ) کے لائسنس لیے ہوتے تھے اور وہ تعزیہ نکالتے تھے یہ تعزیے بڑے خوبصورت ہوتے تھے، ان میں گتکہ بازو و شہنائی نواز اور ردھم کے لیے خاص قسم کی نوبتیں بجانے والے ہوتے تھے، بانس کی پتلی پتلی چھڑیوں سے بجائی جانے والی مٹی کی بنی ہوئی دف سی ہوتی تھیں اور اس کے پورے صوتی اثرات میں جنگ ردھم ہوتا تھا جن کی تال پر گتکہ باز اور تلوار زن ہر چوک میں کھڑے ہو کر اپنے کرتب دکھاتے

تھے۔ان گتکہ بازوں کی ٹولیاں اپنے اپنے استادوں کے ساتھ تعزیئے کے جلوسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ اگر چہ یہ استاد پنجابی ہوتے تھے۔لیکن ان کی پگڑیاں راجپوتانہ طرز کی ہوتی تھیں اور بعض استادوں نے انگر کھے بھی پہنے ہوتے تھے،سب سے آگے بینڈ باجہ ہوتا تھا، بینڈ باجے والے سادہ کپڑوں میں ہوتے تھے اور تعزیئے کے جلوس کے آگے مرثیے کی دھنیں ماہرانہ انداز میں پیش کرتے تھے، درمیان میں شہنائی اور دف بجانے والے ہوتے تھے اور ان کے ساتھ ہی گتکہ بازوں کی ٹولیاں یاعلی کے نعرے لگاتے ہوئے کرتب دکھاتی تھیں۔ غالباً اس دور میں بھی سنیوں کے پاس سات تعزیئے نکالنے کے لائسنس تھے۔ جونویں کی صبح کو اپنی اپنی جگہوں سے روانہ ہوتے تھے اور اندرونِ شہر کے طے شدہ روٹوں سے گزرتے ہوئے نیا بازار میں آ کر مخصوص پلیٹ فارموں پر رکھ دیئے جاتے تھے۔

بینڈ باجے والے، گتکہ باز اور شہنائی نواز اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور پھر آخر میں زبردست آتشبازی ہوتی، جو صبح کی اذان تک جاری رہتی۔

اسی رات یعنی دسویں محرم کو جب اندرون موچی دروازہ چوک نواب صاحب میں ذوالجناح کے مرکزی جلوس کی آغاز پر ہی زیارت کرنے کے لیے زائرین آنا شروع ہو جاتے تھے۔ سنی العقیدہ گھرانے ہاتھوں میں شیشے کی بوتلیں، پیتل کے چھوٹے چھوٹے ڈول اور شیشیاں لے کر داتا دربار کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔اس رات داتا صاحب کے مزار کو گلاب کے عرق سے غسل دینے کی رسم ادا ہوتی تھی اور شہر کے معززین کا بھاری اجتماع ہوتا تھا۔ عقیدت مند وافر مقدار میں گلاب کا عرق بڑے بڑے برتنوں اور ڈرموں میں بھر کر لاتے تھے اور انتظامیہ (متولی) اس گلاب کے عرق سے خاص دعاؤں کے ساتھ مزار کو غسل دیتی تھی اور لوگ باہر بہنے والے عرق کو تبرک کے طور پر بوتلوں اور برتنوں میں محفوظ کر کے گھروں میں لے جاتے تھے۔

دوسری طرف نویں کا دن گزرتے ہی جب دسویں محرم شروع ہو چکی ہوتی تو چوک نواب صاحب کی حویلی نثار سے مرکزی ذوالجناح کے جلوس کے انتظامات کو آخری شکل دی جانے لگتی، تمام لاہور کے شیعہ مرد، عورتیں اور بچے موچی دروازہ کی طرف رواں دواں ہوتے۔ موچی دروازہ سے ملی ہوئی تمام گلیوں میں رش بڑھ جاتا اور چوک نواب صاحب کی طرف

جانے والے راستوں میں ہر امام باڑہ بقعۂ نور بنا ہوتا۔ آنے جانے والوں کا سلسلہ پھیلتا چلا جاتا اور چھتوں، دکانوں، تھڑوں، کھڑکیوں اور دروازوں کی جگہوں پر لوگ اپنی اپنی نشستیں سنبھالنے لگتے۔ حویلی نثار میں مرکزی مجلس کے اختتام پر ذوالجناح برآمد ہوتا تو اس وقت ہر طرف آہ و بکا سنائی دینے لگتی، ماتمی سروں پر راکھ ڈالتے اور حشر کا سماں بن جاتا، مرکزی جلوس کی برآمدگی کے لمحوں میں ماتم کرنا ثواب سمجھا جاتا تھا اور ذوالجناح کا جلوس موچی دروازے اور چوک نواب صاحب کی گلیوں اور کوچوں کا قدم قدم سفر کرتا ہوا صبح کی اذان سے پہلے چوک نواب صاحب کی جامع مسجد کے سامنے آجاتا تھا۔

ذوالجناح کی زیارت کے لیے ہر طرف ہلچل مچی ہوتی اور اس وقت تک چوک نواب صاحب تک چار اطراف کے بازاروں میں زنجیروں سے ماتم کرنے والے قطاروں کی صورت میں بیٹھ جاتے اس وقت ہر چیز خاموش ہوتی اور بازاروں کی تیز روشنیوں میں ہر چہرہ ساکت نظر آتا پھر اچانک زنجیروں سے ماتم کرنے والے تیز چھریوں کے گچھوں سمیت اٹھ کھڑے ہوتے اور اپنی ننگی پیٹھوں پر چھریوں کے گچھے مارتے۔ جس طرف نظر اٹھتی یا علی کے نعروں کے ساتھ زنجیروں سے بے پناہ ماتم ہوتا اور ہر جسم لہولہان ہو جاتا، یہ ماتم اذان کے پہلے لفظ پر ختم ہو جاتا اور ہر طرف سکون ہو جاتا۔

ان لمحوں میں زنجیروں سے ماتم کرنے کے ساتھ خاص روایات منسوب ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان لمحوں میں مولا خود موجود ہوتے ہیں اور ان لمحوں میں ماتم کرنا ثواب ہے۔

جو لوگ ان لمحوں میں شرکت کے لیے آئے ہوتے، وہ موچی دروازہ سے باہر نکلنا شروع ہو جاتے، کیونکہ مرکزی جلوس عارضی طور پر رُک جاتا تھا اور زیارت کو شیعہ جامع مسجد کے قریبی امام باڑہ میں قیام کے لیے لے جاتے تھے۔

یومِ عاشورہ کی صبح ہوتے ہی زیارت دوبارہ برآمد ہوتی، اس وقت تک نئی ماتمی ٹولیاں چوک نواب صاحب میں آجاتی تھیں اور یہ جلوس چوک نواب صاحب سے لکڑ منڈی، چوہٹہ مفتی باقر اور محلہ تکیے زئیاں سے نکل کر چوک پرانی کوتوالی کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔

چوک پرانی کوتوالی میں ماتمی ٹولیاں، زنجیر زنی کرتی تھیں اور کشمیری بازار، ڈبی بازار اور پھر سوہا بازار، بزاز ہٹہ، کوچہ وانِ دٹاں اور حویلی کابلی مل کے راستوں کے ملنے والے چوک تک

پھیل جاتی تھیں، ان کے ساتھ ساتھ علَم تھامے ہوئے لوگ چلتے تھے، جن پر عقیدت سے ہار دوپٹے اور چاندی کے پنجے چڑھائے جاتے تھے، لاہور اور لاہور سے باہر کے آئے ہوئے لوگ تمام راستوں پر پھیلے ہوئے ہوتے تھے۔ جگہ جگہ سبیلیں لگی ہوتی تھیں، نان حلیم، حلوہ اور بیسنی روٹیاں بانٹی جاتی تھیں، رنگ محل کے چوک میں ڈبی بازار کے ناکے پر چائنہ ہاؤس والوں کی طرف سے گرمیوں میں سرخ خوشبودار شربت اور سردیوں میں نمکین کشمیری چائے خطائیوں کے ساتھ تقسیم کی جاتی تھی۔

اس چوک میں بھی چھریوں سے بھرپور ماتم ہوتا تھا اور دو بجے کے قریب ذوالجناح یہاں پہنچا تھا پھر یہ سوہا بازار، وچھووالی اور سید مٹھا کی تنگ گلیوں سے ہوتا تحصیل بازار سے گزرتا تھا تو وہاں سے بھاٹی چوک تک انسان ہی انسان پھیلے ہوتے تھے۔ کوٹھے، چھتیں، دکانیں، چوبارے کھڑکیاں اور تھڑے لوگوں سے بھرے ہوتے تھے، ماتمی ٹولیوں میں اضافہ ہوجاتا تھا بعض ٹولیاں زنجیروں سے ماتم کرتیں، بعض صرف ہاتھوں سے سینہ کوہ کرتیں۔ نئے نئے مرثیے پڑھے جاتے، یوسف خاں موٹر مکینک مرکزی جلوس کی ایک ایسی ٹولی کا سربراہ ماتمی تھا جس کا ماتم دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ لاہور میں آتے تھے اور یوسف خاں پورے پنجاب میں مشہور تھا، اس کی ٹولی میں دراز قد اور گورے چٹے بدنوں والے نوجوان ماتمی ہوتے تھے۔ اس کے بال گھنے اور گھنگھریالے تھے جو پھولے ہوتے تھے۔ وہ ٹولی کے درمیان ہوتا تھا، ساتھ ساتھ وہ راکھ کا برتن بھی زمین پر رکھتا تھا اور ماتم کے عروج پر دونوں مٹھیاں راکھ سے بھر کر اپنے سر پر کھولتا تھا، تو دور دور تک راکھ بکھر جاتی تھی اور چوڑے چکلے سینوں پر بھاری ہاتھوں کے پڑنے کی دھم دھم بڑی گونج دار لگتی تھی۔

زنجیروں سے ماتم کرنے والے خون میں بھیگی ہوئی قمیض پہن کر یا ننگے بدن ہی جلوس کے آگے آگے چلتے تھے۔ جہاں کہیں وقفہ آتا، وہ سڑک پر ہی ٹولی بنا کر بیٹھ جاتے، بھاٹی دروازہ میں تحصیل بازار سے داخل ہوتے ہی شام کا اندھیرا شہر پر چھانے لگتا تھا اور گیسوں والے آجاتے تھے۔ جو ماتمی ٹولیوں کے ساتھ ساتھ آگے پیچھے چلتے تھے۔

بھاٹی دروازہ میں کوچہ فقیر خانہ کے سامنے امام بارہ سیّدہ مبارک بیگم ذوالجناح لے جایا جاتا تھا اور ہر امام باڑہ میں ذوالجناح کو امام حسین کی نذر پیش کی جاتی تھی۔ کیونکہ راستے میں

آنے والے ہر امام باڑہ میں ذوالجناح کی آمد کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ گلیوں میں قدم قدم ذوالجناح کا جلوس آگے چلتا تھا، بازار حکیماں میں لاہور کے فقیر خاندان کی حویلی تھی اور اس میں ذوالجناح لے جایا جاتا تھا اور سارا دن فقیر خانہ میں لنگر جاری رہتا تھا۔ ویسے بھی سارے راستے جہاں جہاں سے جلوس گزرتا تھا، تبرک تقسیم ہوتا تھا۔

بھاٹی دروازہ میں اونچی مسجد کے قریب غالباً عصر یا مغرب کی نماز کا وقت آ جاتا تھا تو اذان شروع ہوتے ہی کچھ دیر کے لیے ماتم بند ہو جاتا تھا، ماتمی زمین پر بیٹھ کر اذان سنتے تھے اور اذان ختم ہونے کے بعد دوبارہ ماتم کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگتے تھے۔

کبھی یہ جلوس شام کو چوک بھاٹی گیٹ میں پہنچتا تھا اور کبھی شام کے کافی دیر بعد۔ لیکن چوک بھاٹی گیٹ میں اس وقت بے پناہ ہجوم ہوتا تھا، دور دور سے آئے ہوئے لوگ زیارت کے لیے موجود ہوتے تھے اور جونہی سرخ و سفید، سونے چاندی کے زیورات، ریشمی چادروں اور بڑی کلغی سے سجے ہوئے ذوالجناح کی طلائی چھتری نظر آتی، زائرین کے چہرے دمک اٹھتے اور کربلا گامے شاہ تک ذوالجناح کے بھاٹی گیٹ سے باہر آنے کی خبر پھیل جاتی تھی۔ بھاٹی چوک میں زنجیروں، چاقوؤں، سوؤں اور بلیڈوں سے ماتم کرنے والوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ یہ آخری لمحات اس لحاظ سے بڑے ''تھرلنگ'' ہوتے تھے۔ آہ و بکا، چیخ و پکار اور یا حسین کے دلدوز نعروں سے فضا لرزلرز اٹھتی تھی، کربلا گامے شاہ میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوتا تھا۔ راستے بند کر دیئے جاتے تھے اور چاروں طرف انسانی سر ہی نظر آتے تھے، سیاہ لباس والے لوگ حضرت عباس علمدار کی مشک اور پنج تن پاک کی علامت چاندی کے پنجوں والے علم ہی علم لے کر وہاں جمع ہو جاتے تھے، زیادہ تر زائرین گروپوں کی صورت میں کربلا گامے شاہ کے اندر جانے والے راستے کے دونوں طرف بیٹھے ہوتے تھے اور اندر ٹولیاں ہی ٹولیاں ماتم کرتی تھیں، ایک طرف عورتوں کے لیے الگ انتظام ہوتا تھا اور شیعہ خواتین مرثیے پڑھتے ہوئے ماتم بھی کرتی تھیں، زیادہ اونچے درجہ کی شیعہ خواتین سیاہ دوپٹے اوڑھے غمزدہ چہروں کے ساتھ بہت آہستگی سے سینوں پر ہاتھ مارتی تھیں، لیکن چھوٹے طبقوں کی شیعہ خواتین مردوں کی طرح پورے جوش و خروش سے ماتم کرتی تھیں۔ ان میں بعض انگلیوں میں پہنے ہوئے کانٹے دار چھلوں اور بلیڈوں سے ماتم کرتی تھیں اور ان کی چھاتیوں

سے خون رس رس کران کی قمیضوں پر پھیل جاتا تھا۔

کربلا گامے شاہ کے باہر گیٹ کے پاس ذوالجناح کے آنے سے یہ منظر زیادہ غم افروز ہو جاتا تھا۔ ذوالجناح پر نگاہ پڑتے ہی لوگوں کی کیفیت زیادہ رقت انگیز ہو جاتی تھی اور ذوالجناح کو گیٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر لوگ خصوصی دعائیں کرنے لگتے تھے۔ ذوالجناح کا یہ راستہ آنکھ جھپکتے ہی گزر جاتا اور جونہی اندر کربلا کے دالان میں ذوالجناح پہنچتا، فلک شگاف چیخیں، والہانہ ماتم اور آنسو کلائمکس بن جاتے اور کربلا کے اندر نیم روشن اندھیروں میں ان خون ریز لمحوں کو یاد کیا جاتا جب کربلا کے میدان میں امام حسینؓ کے تمام ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ خیموں کو آگ لگا دی گئی تھی اور اہلِ بیت کو لوٹا جا رہا تھا۔

یہ مرکزی جلوس کے وداع کی گھڑیاں ہوتی تھیں، ذوالجناح سے سجاوٹی اور قیمتی اشیاء اتار لی جاتی تھیں اور اسے کربلا کے ایک خاص دالان میں لے جاتے تھے۔ ماتم ختم ہو جاتا تھا اور لوگ غمزدہ چہرے لیے کربلا سے باہر جانے لگتے تھے کیونکہ اس کے بعد لاہور کے اہم امام باڑوں میں شامِ غریباں کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔

دوسرے دن لاہور شہر پھر اپنے معمول پر آ جاتا تھا لیکن محرم کی تقریبات کا سلسلہ ان ڈور ہو جاتا تھا۔ امام حسینؓ کے چہلم تک مجلسیں ہوتی تھیں اور اس دوران نہ تو ہندو کوئی خوشی کی تقریب مناتے تھے اور نہ ہی مسلمان۔ شادیاں چہلم تک ملتوی کر دی جاتی تھیں۔

چہلم کے بعد لاہور میں دو ہفتے کے بعد عید میلادالنبیؐ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے خصوصی تیاریاں کی جاتی تھیں اور عید میلادالنبی پر سُنّی حلقوں کی طرف سے ایک جلوس نکالا جاتا تھا۔ یہ جلوس دہلی دروازہ سے شروع ہوتا تھا اور داتا دربار پر جا کر رات گئے ختم ہوتا تھا۔ اس میں بیل گاڑیوں پر لوگ سوار ہوتے تھے، نعتیں اور قوالیاں ہوتی تھیں۔ راستے میں سبیلیں لگی ہوتی تھیں اور جگہ جگہ استقبالی محرابیں لگائی جاتی تھیں۔ جلوس میں گتکہ پارٹیاں، تلوار باز اور طرح طرح کے مظاہرے کرنے والے شامل ہوتے تھے۔ بینڈ باجے، ڈھول تاشے اور شہنائیاں بجتی تھیں۔ اور جلوس کا نمایاں حصہ گھوڑ سوار تھے۔ جو عربی لباس پہنے اور پورے عربی گیٹ اپ کے ساتھ گھوڑوں پر جلوس کے آگے آگے چلتے تھے۔ گھوڑوں کو بھی پوری طرح سجایا جاتا تھا اور عید میلادالنبیؐ کا یہ جلوس لاہور کی زندگی کا ایک مستقل سلسلہ بنتا جا رہا تھا۔ جو تکیہ

سادھواں کے عنایت اللہ قادری نے شروع کیا تھا۔ اس موقع پر پہلے ہی نذر نیازیں دی جاتی تھیں، مٹھائیاں، حلوہ، پلاؤ، کھیر اور نان حلیم تقسیم کی جاتی تھی اور مسجدوں میں شام کو چراغاں ہوتا تھا۔

لاہور میں مسلمانوں کا سب سے بڑا تہوار چھوٹی عید تھا۔ لاہور کے لوگ عید الفطر کو چھوٹی عید کے نام سے پکارتے تھے اور بقرعید کو بڑی عید کہتے تھے۔ عید کی تیاریاں رمضان کے شروع ہوتے ہی پورے شہر میں پھیل جاتی تھیں اور روزے بڑے احترام سے رکھے جاتے تھے۔ سحری کے وقت جگانے والے آ جاتے تھے اور روزہ افطاری کا اعلان مسجدوں میں رکھی ہوئی نوبتوں سے کیا جاتا تھا۔ مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر کا تصور تک نہیں تھا، مسجدوں میں اس وقت بڑا رش ہوتا، لوگ اپنے اپنے گھروں سے افطاری کا سامان مسجدوں میں پہنچاتے۔

لاہور شہر کے اندر روزوں کے دوران مسلمان آبادی کی سرگرمیاں محدود ہو جاتی تھیں۔ عورتیں روزے رکھ کر گھروں میں ہاتھوں سے سیویاں بناتی تھیں، انگلیوں کی پوروں سے بٹی ہوئی سیویاں پکنے سے بہت لذیذ اور زم ہو جاتی تھیں، مائیں نئی نئی بیاہی ہوئی لڑکیوں کے تہوار تیار کرتی تھیں اور آخری روزوں میں عید کی خریداری زور و شور سے شروع ہو جاتی تھی۔ گلیوں بازاروں میں فقیروں کے جلوس گھومتے نظر آتے تھے، جوز کوٰۃ، فطرانہ اور صدقہ طلب کرتے تھے، کھیل تماشے والے مداری، ریچھ اور بندر نچانے والے، جسمانی کرتب دکھانے والے اور مجمع باز عید کی رونقوں کو بڑھا دیتے تھے، دکانیں اندر سے نکل کر بازاروں میں پھیل جاتی تھیں اور جگہ جگہ چوکوں میں شامیانے لگا کر نئی دکانیں سجائی جاتی تھیں۔

چاند نظر آتے ہی مسجدوں میں نوبتیں بجائی جاتی تھیں۔ پٹاخے چلائے جاتے تھے اور گولے چھوڑے جاتے تھے۔ اندرونِ شہر میں یہ رات بہت مصروف ہوتی تھی اور عید کی صبح سے پہلے لوگ گھروں میں جاگ پڑتے تھے۔ گلیوں میں فقیروں کی صدائیں گونجنے لگتیں اور سحری کے وقت جگانے والے بھی ڈھول، ٹین، کنستر وغیرہ بجاتے ہوئے آ جاتے۔ گھروں میں بچے، بوڑھے، عورتیں اور لڑکیاں نہانے لگتیں، بچے سب سے پہلے تیار ہوتے اور سیویاں پکنے لگتیں، عید کے روز لاہور میں مسلمان سیویوں سے عید کا ناشتہ کرتے تھے اور نماز پڑھنے چلے جاتے تھے۔

اس دور میں عید کی نماز صرف دو جگہوں پر ہوتی تھی، ایک اجتماع شاہی مسجد میں ہوتا تھا اور منٹو پارک میں اہلحدیث کا کیمپ لگتا تھا۔ تمام شہر کی سڑکوں پر لوگ اجلے نئے اور طرح طرح کے لباس پہن کر نماز پڑھنے کے لیے جاتے ہوئے نظر آتے۔ اگر میں بڑے بھائی کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے جاتا تو شاہی مسجد میں جانا پڑتا، کیونکہ میرے والد چینیاں والی مسجد کے خطیب مولانا داؤد غزنوی کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، اس لیے وہ منٹو پارک کے کھلے میدان میں جاتے تھے۔

نماز کے بعد منٹو پارک میں نماز پڑھنے والے بھی قلعہ کے دروازہ اور رنجیت سنگھ کی مڑھی کے سامنے سے گزر کر حضوری باغ کی طرف آجاتے تھے اور شاہی مسجد میں نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مل کر روشنائی دروازہ سے گزرتے تھے اور یہاں لوگوں کا ایک سیلاب سا ہوتا تھا۔

عید کا جشن بھی لاہور میں دو دن منایا جاتا تھا۔ لاہور کے لوگ ٹرو بڑے جوش وخروش سے مناتے تھے اور ٹرو کا میلہ خصوصی طور پر دہلی دروازہ کے باہر لگتا تھا۔

عید گزر جاتی تو لوگ پھر اپنی دوسری سماجی اور معاشرتی سرگرمیوں میں گم ہو جاتے، اس طرح بقرعید آجاتی تو وہ دوبارہ بقرعید کی تیاریاں کرنے لگتے، لاہور میں بقرعید کے لیے دُنبے، بکرے اور بیڈو پالے جاتے تھے، لاہور کے لوگوں کے پاس اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ قربانی کے جانور آسانی سے پال سکیں اور پالے ہوئے جانور کی قربانی زیادہ قابل قبول سمجھی جاتی تھی۔ لوگ دُنبے اور بکرے ذوق وشوق سے پالتے تھے۔ بکروں کو ہر روز صبح سیر کرائی جاتی تھی۔ انہیں صابن سے نہلایا جاتا تھا، انہیں مہندی لگائی جاتی تھی اور ان کے پیروں میں جھانجھریں پہنائی جاتی تھیں، کچھ لوگ قربانی کے بکرے ہفتہ یا چند دن پہلے بھی خریدتے تھے اور عید کے دن لاہور کی موریوں میں خون ہی خون بہتا تھا، قصائی بہت مصروف ہوتے تھے اور قربانی کی کھالیں اکٹھی کرانے والے مذہبی مدرسوں کے طالب علم گلیوں میں گھومتے تھے۔ لاہور میں تین دن تک قربانی کی رسم جاری رہتی تھی۔

مسلمانوں کے تہواروں میں عید اور بقرعید کے بعد دوسرے بڑے تہوار شب برات اور معراج شریف بھی ثقافتی رنگ لیے ہوتے تھے۔ معراج شریف کے موقع پر مسجدوں کو سجایا جاتا، گھروں پر مٹی کے دیے جلائے جاتے اور حلوہ وغیرہ پکا کر بانٹا جاتا، معراج شریف کے بعد

شب برات کا تہوار اس لحاظ سے بڑا اتھرلنگ تھا کہ اس پر آتشبازی چلائی جاتی تھی اور لچی حلوہ اس کا خاص پکوان تھا، بعض گھروں میں عورتیں خود لچیاں تلتی تھیں، لیکن عام طور پر لاہور کے ہندو اور مسلمان حلوائی لچیاں بناتے تھے۔ یہ میدے کی تلی ہوئی باریک تیہ والی روٹی ہوتی تھی، اسے پکڑنا اور اس کا نوالہ توڑنا مشکل ہوتا تھا کیونکہ وہ نرم اور لچکیلی ہونے کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل نکل جاتی تھی۔ لاہور کے مسلمان بیاہی ہوئی بیٹیوں کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تہوار بھیجتے تھے اور شب برات کی شام کو آتشبازی چلنا شروع ہو جاتی۔ ہر محلے میں دو دو ٹولیاں ایک دوسرے پر آتشبازی، پٹاکے، شُرلیاں اور ''پوں مار پٹاکے'' ایک دوسرے پر مارتے اور آتش و بارود کا یہ مظاہرہ گلیوں محلوں میں جنگ کی طرح پھیل جاتا، بہت سارے لڑکے جھلس جاتے تھے، بعض اوقات خوفناک لڑائیاں بھی ہو جاتی تھیں اور گھروں کی چھتوں پر انار، ہوائیاں اور پھلجڑیاں چلائی جاتی تھیں، اگر شب رات گرمیوں میں آتی تو گھروں کی چھتوں پر رکھی ہوئی چارپائیاں اور بسترے تک جل جاتے۔ جن گھروں کی چھتوں پر جلتی ہوئی ہوائیاں گرتی تھیں انہیں سارا سال یہ بات یاد رہتی تھی۔

لاہور شہر کے ہر محلے اور گلی کوچے میں مسلمان بزرگوں، صوفیوں اور درویشوں کے مزار کافی سارے تھے اور کسی نہ کسی بزرگ کا عرس ہر ہفتے یا مہینے میں منایا ہی جاتا تھا لیکن دو عرس بڑی دھوم دھام سے اور میلے کی صورت میں منائے جاتے تھے۔

ایک عرس حضرت میاں میر صاحب کا چھاؤنی میں منایا جاتا تھا اور اس کی ابتداء مغل بادشاہ شہنشاہ شاہجہان کے بیٹے اور جانشین داراشکوہ نے کی تھی اور مزار بھی داراشکوہ نے تعمیر کروایا تھا۔ داراشکوہ کی اپنی نسل کے حکمرانوں کی نسبت لاہور سے زیادہ محبت کا باعث لاہور میں مسلمان صوفیاء کے ادارے تھے۔ ان میں حضرت علی ہجویریؒ کا مزار اور حضرت میاں میر صاحب کا ادارہ داراشکوہ کے دل میں بستا تھا۔

حضرت میاں میر صاحب کا عرس کی تاریخیں بھی قمری تقویم کے تحت بدلتی رہتی تھیں اور لاہور چھاؤنی میں دھرم پورہ کے قریب حضرت میاں میر صاحب کا عرس بھی دو دن منایا جاتا تھا، میلوں اور عرسوں سے میری دلچسپی اس وقت صرف گہما گہمی اور انسانوں کے اجتماع کی کشش کا نتیجہ تھی، عمر بہت چھوٹی تھی لیکن میں یہ یاد کر کے حیران ہو جاتا ہوں کہ پتہ نہیں، میں اپنے

خالہ زاد بھائی کے بیٹے جُونے کے ساتھ میاں میر صاحب کے عرس پر کیسے پہنچ جایا کرتا تھا۔ ہم عرس میں خوب گھومتے، ایک ایک چیز اور ایک ایک چہرے کو بہت غور سے دیکھتے، ملنگوں، درویشوں اور صوفیوں کے ڈیروں پر بیٹھ جاتے، قوالیاں سنتے، مزار کا طواف کرتے، دعائیں مانگتے۔

مزار کے مشرق میں ایک بہت خوبصورت مغلائی طرز کا باغ تھا جسے داراشکوہ نے ہی بنوایا تھا۔ اور عرس کے موقع پر زائرین اس باغ میں آرام کرتے تھے۔ کھلونوں، مٹھائیوں اور عام استعمال کی چیزوں کی دکانیں لگتی تھیں اور نمکین بیسن اور سرخ مرچوں کا بنا ہوا میدے کا قتلمہ ایک خاص چیز تھی، جو تقریباً ہر میلے اور عرس پر ذوق وشوق سے کھایا جاتا تھا اس عرس میں بھی شہری اور دیہی آبادی کے لوگ شریک ہوتے تھے۔

لاہور میں سب سے بڑا عرس داتا صاحب کا منایا جاتا تھا۔ داتا صاحب کے عرس کی تاریخیں بھی چند سالوں بعد موسم کا نیا چولا پہن لیتی تھیں اور لاہور میں آٹھ دن پہلے داتا کا میلہ لگنا شروع ہو جاتا تھا۔ ٹکسالی دروازہ سے بھاٹی تک اور بھاٹی سے لوہاری تک دکانیں لگ جاتی تھیں اور بھاٹی چوک کے تمام باغوں میں تھیٹر، ورائٹی شو، میجک شو، تیسرے درجے کی سرکس جس میں ایک بوڑھا اور بیمار شیر بھی ہوتا تھا، یوسف سینڈو کا موت کا کنواں اور کھیل تماشوں کے کیمپ لگ جاتے تھے اور عرس سے پہلے ہی لاہور کے شہری عرس منانا شروع کر دیتے تھے۔ جب کہ دسویں محرم کی رات کو مزار کو غسل دیا جاتا تھا اور ۱۸ صفر کو حضرت امام حسینؓ کے چہلم کا دن عرس کے لیے مقرر تھا۔

عرس سے ایک دن پہلے چراغ ہوتے تھے اور پورے پنجاب سے آئے ہوئے زائرین اس وقت لاہور میں موجود ہوتے تھے۔ لاہوریئے جن میں ہندو اور سکھ بھی شامل ہوتے تھے، چراغ کی رسم میں شریک ہوتے اور چاروں طرف ڈھولوں کی آواز گونج رہی ہوتی۔

لاہور میں داتا صاحب تقریباً ۹۷۵ سال پہلے تشریف لائے تھے اور جس وقت وہ یہاں آئے سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان میں جھنڈا لہراتا تھا۔

لاہور پر اس کے مقرر کیے ہوئے گورنر وغیرہ موجود تھے لیکن حضرت داتا صاحبؒ محمود غزنوی کو ناپسند کرتے تھے اس لیے اس کی انتظامیہ کب یہ گوارا کر سکتی تھی کہ وہ غزنوی کے

پسندیدہ صوفیوں کی طرح داتا صاحبؒ کو سرکاری سطح پر احترام دیتی، اس لیے ان کے عرس کے تاریخی ماخذ صرف اکبر کے عہد میں ملتے ہیں، اور اکبر سے سکھوں کے عہد تک داتا صاحبؒ کا عرس منانے کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ لاہور میں داتا صاحبؒ کا عرس پچھلے چار ساڑھے چار سو سال کے سلسلے سے ملا ہوا ہے۔

مغل بادشاہ، وزیر اور بعض حکام داتا صاحب سے گہری عقیدت رکھتے تھے، سالانہ نذر نیاز دیتے تھے اور دربار کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیتے تھے۔ عرس میں شریک ہوتے تھے اس طرح جب مغل سلطنت زوال کا شکار ہوگئی اور سکھوں نے پنجاب میں حکومت قائم کر لی تو سکھ مہاراجے راجے اور رانیاں تک داتا صاحبؒ سے عقیدت کے رشتوں میں بندھی ہوئی تھیں اور عرس پر آنے والے زائرین کی خدمت اور آرام کے لیے نقد رقمیں پیش کی جاتی تھیں۔

بلاشبہ لاہور میں منایا جانے والا داتا کا عرس ہندوستان اور پاکستان میں منایا جانے والا ایک بڑا عرس ہے جس میں ہندوستان بھر سے عالم درویش، صوفی اور قلندر شرکت کرنے لاہور آتے تھے، جو داتا دربار کے پیچھے کھلے میدانوں میں ڈیرے لگاتے تھے۔

لاہور کے شہریوں کے لیے اس روز عید کا سماں ہوتا تھا اور وہ خاندانوں سمیت اس عرس میں شرکت کرتے تھے، ٹکسالی دروازہ، بھاٹی دروازہ اور لاہوری دروازہ تک عرس کے دن انسانوں کا سیلاب نظر آتا تھا۔ باغوں میں لوگوں کے ڈیرے لگے ہوتے تھے اور شام کے بعد تو وہاں قدم قدم چلنا مشکل ہو جاتا تھا، ہر جگہ تبرک تقسیم ہوتا، درود و سلام اور وعظ تلقین کی مجلسیں منعقد ہوتیں، ہندوستان بھر کے قوال نذرانہ وعقیدت پیش کرتے اور داتا صاحب کا عرس تین دن تک جاری رہتا۔

میں دو دن تو اکیلا ہی عرس کی سرگرمیوں میں شامل رہتا اور ایک دن اپنے والد کے ساتھ ٹکسالی دروازہ سے بھاٹی دروازہ کی طرف عرس دیکھنے آتا، رش اتنا ہوتا تھا کہ لوگوں کو بچے کندھوں پر اٹھانے پڑتے تھے اور لوگ رینگ رینگ کر آگے بڑھتے تھے۔

دربار کے آس پاس ایک قدم چلنا مشکل ہوتا تھا اور چاروں طرف سے زائرین کے ہجوم لہر در لہر پھیلے ہوتے تھے۔ ہاروں، چھوہاروں، میٹھے چنوں، میٹھی پھلیوں اور پھول نما بتاشوں، چوڑیوں، برتنوں اور مالاؤں، موتیوں اور روزانہ استعمال کی چیزوں کی دکانیں ختم ہونے میں

نہیں آتی تھیں، لوگ خود آ کر وہاں دیگیں پکاتے تھے اور لنگر تقسیم کرتے تھے، صوفیانہ ادارے پنجاب بھر سے اپنے اپنے سربراہوں کی قیادت میں مریدوں سمیت شرکت کرتے تھے اور ان کی رو سے داتا صاحب کا عرس ایک روحانی کانووکیشن کا درجہ رکھتا تھا۔ ان کے ڈیروں پر اکثر ہجوم رہتا تھا اور دربار کے پیچھے علامتی فقیروں کے ڈیرے لگتے تھے۔ ان میں ننگے فقیر، کن پاٹے فقیر اور دوسرے مجذوب نما فقیر بیٹھتے تھے۔ گرمیوں اور سردیوں میں بھی یہ آگ کا الاؤ روشن رکھتے تھے اور آگ کا یہ الاؤ مولا علی کے چج کے نام سے پکارا جاتا تھا، ان فقیروں کا مرکزی مقام داتا صاحبؒ کے مزار کے عقب میں کھڑکڑی پیر کا آستانہ تھا۔ جس کے آس پاس کھیت ہی کھیت تھے۔ کوئی مکان نہ تھا اور نہ ہی کوئی دوسری عمارت تھی، صرف کیکر اور ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ کھڑکڑی پیر تک جانے کے لیے کھیتوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہاں ہر جمعرات کو شہر کے گلوکار اور موسیقار آتے تھے لیکن عرس کے دنوں میں یہاں ایک طرح سے موسیقی کے مقابلے ہوتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے یہ نہ ختم ہونے والی رونقیں ہیں۔ عرس کی رونقیں عروج پر ہوتیں تو سہ پہر کے بعد امام حسینؓ کے چہلم پر تعزیئے کا جلوس اندرونِ شہر کے روٹ سے ہوتا ہوا اور چوک بھاٹی گیٹ میں پہنچ جاتا، اس وقت ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈالنے والے ملنگ رُک جاتے۔ تعزیئے کا جلوس آہستہ آہستہ کربلا گامے شاہ میں داخل ہو جاتا تو دوبارہ ڈھول بجنے لگتے اور دھمال ڈالنے والوں کی ٹولیاں گزرنے لگتیں۔

عرس کی آخری رات بڑی پُر رونق ہوتی تھی۔ دربار پر سلام کرنے والوں کی قطاریں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں اور یہ پورا علاقہ جگمگ کرتا تھا، باہر بھاٹی چوک میں کھلونوں، برتنوں کھانے پینے اور گھریلو استعمال کی چیزوں کی دکانوں پر رش ہوتا تھا اور دوسرے شہروں سے آنے والے زیادہ تر زیبائشی مالائیں، کڑے، چھلّے، چھوہارے، بتاشے، کوزہ مسری، چینی کے بنے ہوئے پھول وغیرہ خریدتے تھے۔

تیسرے روز عرس ختم ہو جاتا تھا لیکن عرس کے ہفتہ میں آنے والی پہلی جمعرات کو عورتیں سلام کرنے آتی تھیں۔ اس روز بھی پہلے جیسا میلے کا ساماں ہوتا تھا، عورتیں زیادہ تر مٹی، تاہم چینی اور چینی کے برتن خریدتی تھیں، داتا دربار سے پیر مکی کے مزار تک ان دکانوں کی قطاریں لگی ہوتی تھیں اور سامنے باغ میں (بھاٹی گیٹ اور ٹکسالی گیٹ) جھولے وغیرہ لگے ہوتے

تھے۔لکڑی کے ان جھولوں کی چڑ چڑ کی چیخ و پکار دور دور تک سنائی دیتی تھیں، اور شہری عورتیں ان جھولوں میں بیٹھ کر کیا محسوس کرتی تھیں؟

ہمارے محلے سے بھی مائی پٹھانی اپنی عقیدت مند عورتوں کے ساتھ جمعرات کے اس اجتماع میں شریک ہوتی تھی۔ میری ماں بھی مائی پٹھانی کی سہیلی تھی اور میں اپنی ماں کے ساتھ بھاٹی گیٹ میں لگے ہوئے اس میلے میں جایا کرتا تھا اور دوسرے بچوں کی طرح مجھے بھی لکڑی کے ان جھولوں میں بیٹھنے کا بہت شوق تھا۔

جب جھولے کی ایک پیڑھی اوپر سے ہو کر تیزی سے نیچے آتی تھی تو دل کو عجیب وغریب سا محسوس ہوتا، اور اس سے جو ہیجان پیدا ہوتا تھا، اس میں مجھے ایک لذت سی ملتی تھی۔ شاید بڑوں کے ساتھ بھی یہی ہوتا تھا، کیونکہ ہمارے محلے کی نوجوان لڑکیاں ان جھولوں میں بیٹھ کر بہت چیخ و پکار کرتی تھیں، جھولا جب اوپر سے نیچے آتا تھا تو بالی گھم گھما ہو جاتی تھی اور دوسری لڑکیاں آوازیں دیتی تھیں۔

''ہور تیز، ہور تیز، ہور تیز''

اور ہاتھوں سے جھولے کی پیڑھوں کو ایک طرف سے اوپر دھکیلتے ہوئے اور دوسری طرف نیچے کھینچتے ہوئے جھولے والوں کا وجود مشین میں ڈھل جاتا اور بالی کی طرح دوسری لڑکیاں بھی خوشی میں زور زور سے چیخیں مارنے لگتی تھیں۔

بالی اسحاق درزی کی تیسری بیٹی تھی اور اس کو بھی اپنی ماں چراغ بیگم کی طرح عرسوں اور میلوں کا بہت ہی شوق تھا۔ وہ داتا دربار کے میلے میں عورتوں کے دن درخت پر لگی ہوئی پینگ چڑھانے میں بہت مشہور تھی اور بھاٹی دروازے کی دوسری لڑکیاں بالی کے پینگ چڑھانے کے فن سے بڑی متاثر تھیں۔ کیونکہ اس روز بھاٹی گیٹ کے باغ میں لڑکیوں کے پینگ چڑھانے کے مقابلے ہوتے تھے اور بالی ہمیشہ کامیاب رہتی تھی، وہ جوان تھی اور ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بڑا بھائی کریم اسے میلوں پر جانے سے منع کیا کرتا تھا، پتہ نہیں کیا ہوا کہ داتا دربار کے میلے پر عورتوں کے دن ہر طرف سے داد پانے والی بالی کو دورے پڑنے لگے اور یہ مشہور ہو گیا کہ بالی پر جن کا سایہ ہے۔ وہ رات کو سوتے وقت ڈر جاتی ہے، اس کا جسم کانپنے لگتا ہے، اور زاروقطار رونے لگتی ہے۔

اگلے سال داتا دربار کا میلہ لگا تو بالی پینگ چڑھانے کے مقابلے میں شریک نہیں تھی۔ وہ ایک دن پہلے وفات پا گئی تھی۔ اس کو مرنے سے پہلے خون کی قے ہوئی تھی اور دیکھتے دیکھتے بالی مر گئی میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کی موٹی موٹی غلافی آنکھیں بند تھیں اور اس کے سرخ باریک ہونٹ اس طرح بھنچے ہوتے تھے جیسے مرتے وقت اسے بہت ہی دکھ ہوا ہو جوان جہان تھی اور مجھے اس کی موت پر بہت دُکھ ہوا تھا۔

غسل اور کفن کے بعد اس کی میت پر گوٹے والا دوپٹہ ڈالا گیا تو اس کا چہرہ ایکدم زندہ سا ہو گیا۔ لیکن میرے سامنے لوگ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اس کی میت کی چارپائی اٹھا کر چلے گئے تھے اس کے بعد داتا دربار کے میلے کی عورتوں کے دن بالی پینگ چڑھاتے ہوئے کبھی نظر نہیں آئی اور نہ ہی کسی نے اسے یاد کیا۔ قدموں کا میلہ، چھڑیوں کا میلہ اور مسجد وزیر خاں کے باہر لگنے والا سخی سرور کا میلہ بھی بیت گیا۔ لیکن بالی کی ماں اب ان میلوں میں اکیلی شرکت کرتی تھی، گلیوں محلوں میں گڈا گڈی بیاہ کرنے، بڑے گھروں میں آنکھ مچولی اور کھلے آنگنوں میں کوکلا چھپا کی کھیلنے والی لڑکیوں میں بالی بڑی پسند کی جاتی تھی، شادی بیاہ اور منگنی کے ہنگاموں میں ڈھولک بڑی مہارت سے بجاتی تھی، اسے کئی گیت زبانی یاد تھے لیکن یہ گیت بھی اسے مرنے سے نہ بچا سکے۔

''میرا شہر لاہور''

بشکریہ: آتش فشاں پبلی کیشنز ۱۹۹۱ء

گلیاں، کوچے اور بازار

سید شرافت حسین شفقت

اگر ہم انگریز عہد میں لاہور کا جائزہ لیں تو نہایت مناسب ہے کہ ہم اس کی ابتداء لاہور ریلوے اسٹیشن سے کریں جو کہ اس شہر میں داخلہ کا ایک سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ پاکستان کے اس سب سے بڑے اسٹیشن کا نقشہ ماہرین تعمیرات مسٹر ڈبلیو۔ سی۔ ای اور انجینئر برٹن نے ترتیب دیا۔ لاہور کا قلعہ ہمیشہ سے اس شہرت کی عظمت کی علامت اور شناخت رہا ہے۔ ان ماہرین نے اسٹیشن کی تعمیر میں اس اہمیت کو پیش نظر رکھا۔ یوں یہ محض ایک روایتی ریلوے اسٹیشن ہی نہیں بلکہ اس کی جاہ وجلال اور شوکت وسطوت سے آراستہ پروقار عمارت ایک نووارد کو پہلے ہی قدم پر اس شہر کی عظمت سے متعارف کرا دیتی ہے۔ اس کی تعمیر میں محض اس عہد کی ضروریات سے صرف نظر کر کے آنے والے دوسو برس کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ ۱۸۴۹ء میں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سرجان لارنس نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ ٹھیکیدار میاں محمد سلطان اس کی تعمیر کا منتظم و مہتمم تھا۔ صرف عمارت ہی کی تعمیر پر پانچ لاکھ روپے جبکہ ذیلی تنصیبات پر مزید ۳۲ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ عوام کے لیے سب سے پہلی ٹرین ۱۸۱۶ء میں لاہور سے امرتسر کے لیے چلائی گئی۔ ابتداء میں صرف ۸ پلیٹ فارم ریل ٹریکس سے منسلک تھے۔ وسیع مال گودام، متعدد انتظار گاہیں، غسل خانے، اسٹیشن ماسٹر اور دیگر عملہ کے لیے دفاتر، آرام گاہیں، بکنگ آفس اور تمام متعلقہ ضروریات وسہولیات کے لیے مختلف النوع تعمیرات کے ساتھ پانچ آہنی پل بھی نصیب کیے گئے۔ اس سے ملحق ہی وسیع وعریض ورکشاپ بنائی گئی، یہ تمام تعمیرات ۱۱۲۶ ایکڑ رقبہ پر محیط تھیں۔ ریلوے مسافر خانے کے بالمقابل ایک سرائے میں

سڑھیوں والا تالاب یعنی نہانے کے لیے باؤلی (سوئمنگ پول) بھی بنی تھی۔ اس کے قریب ہی برگنزا ہوٹل واقع تھا۔ یہاں سے سرکلر روڈ تک جانے والی سڑک (موجودہ برانڈرتھ روڈ کا تمام تجارتی بازار بمعہ ملحقہ رام گلیاں) کیلیاں والی سڑک کہلاتی تھی کیونکہ یہ تمام علاقہ کیلوں کے باغات پر مشتمل تھا۔

لاہور ریلوے سٹیشن سے ایک سڑک میاں میر چھاؤنی تک جانے کے لیے تیار کی گئی۔ اسی کے متوازی دوسری سڑک دو حصوں میں منقسم تھی، شملہ پہاڑی تک یہ ایمپریس روڈ تھی جبکہ شملہ پہاڑی کے بعد یہ ڈیوس کہلاتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے قرب وجوار کے علاقہ کو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر ڈونالڈ میکلوڈ کے نام پر ڈونالڈ ٹاؤن کا نام دیا گیا مگر یہ نام مقبول نہ ہوا البتہ یہاں سے مال روڈ تک جانے والی سڑک اب بھی میکلوڈ روڈ ہی کہلاتی ہے۔ اسی سڑک پر لاہور کا مشہور لکشمی چوک واقع ہے۔ ۱۹۲۰ء تک یہ ایک ویران اور سنسان علاقہ تھا یہاں ایک سیع قبرستان ہوا کرتا تھا جو بہت بعد میں اطراف میں سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر کے بعد مختصر ہوتے ہوتے اب بھی مومن پورہ کی صورت میں موجود ہے۔ موجودہ رائل پارک کے مقام پر ایک ہندو سیٹھ گوکل چند کی وسیع و عریض کوٹھی ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۲۴ء تک ویرانی کا یہ عالم تھا کہ سورج ڈھلنے کے بعد کوئی ادھر سے گزرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پھر کھلی جگہ ہونے کے سبب یہاں تھیٹر، سرکس اور نمائشیں لگنا شروع ہوئیں۔ خاموش فلموں کا زمانہ آیا تو یہاں بہت سے سینما وجود میں آ گئے۔ لالہ لاجپت رائے اس شہر کے نہایت متمول رئیس، سماج سدھار سیوک، انتہائی فصیح البیان مقرر، آزادی کے متوالے اور ہندوستان کی مشہور و معروف لکشمی انشورنس کمپنی کے مالک تھے جس کے ہندوستان بھر میں متعدد دفاتر موجود تھے۔ انہوں نے اپنی انشورنس کمپنی کے لیے ایک انتہائی وسیع و عریض بلند و بالا خوبصورت لکشمی بلڈنگ تعمیر کی۔ لالہ لاجپت رائے نہایت سرگرم سیاسی ورکر بھی تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب اہل ہند میں انگریزوں سے نفرت عروج پر تھی اور انگریزی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ تھا انہی ناگفتہ بہ حالات میں جب نومبر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن برصغیر کا سیاسی تجزیہ کرتے کرتے لاہور پہنچا تو عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا افضل حق، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر سیتہ پال اور لالہ لاجپت رائے کی قیادت میں ہزاروں مظاہرین احتجاجی جلوس لے کر پہنچ گئے۔ پولیس نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے زبردست

لاٹھی چارج کیا جس سے لالہ لاجپت رائے شدید زخمی ہوئے۔ بھارت سبھا کے نوجوان اپنے بزرگ رہنما پر اس قدر بہیمانہ تشدد سے مشتعل ہو گئے اور انہوں نے ۱۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو اے ایس پی مسٹر سانڈرس کو گولیوں سے بھون ڈالا اور اس کیس میں متعدد نوجوان گرفتار ہوئے، کچھ فرار ہو گئے۔ خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا اور دیگر ملزمان کو مختلف المیعاد سزاؤں کے ساتھ تین نوجوانوں بھگت سنگھ، راج دیو اور سکھ دیو کو سزائے موت سنائی گئی جس پر ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کی شام پر عملدرآمد کیا گیا۔ لالہ لاجپت رائے بھی زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ گلاب دیوی ہسپتال بھی لالہ لاجپت رائے ہی نے اپنی والدہ کی یاد میں ان کے نام پر تعمیر کرایا تھا۔

لکشمی بلڈنگ جیسی خوبصورت عمارت کی تعمیر کے بعد اس کے سامنے عطر چند کپور نے ایک اور نہایت حسین اور طویل بلڈنگ تعمیر کرائی۔ یہ میکلوڈ روڈ اور ایبٹ روڈ کے سنگم پر مومن پورہ قبرستان تک دراز تھی۔ عطر چند کپور لاہور کے ممتاز و معروف و پبلشر تھے بالخصوص درسی کتب کی اشاعت کا یہ سب سے بڑا ادارہ تھا۔ اس کے بالمقابل نسبت روڈ اور میکلوڈ روڈ کے سنگم پر سیوک رام نے بلند و بالا طویل عمارت قائم کی۔ جس سے ملحق گیتا بھون بنی اسی زمانہ میں رنجیت بلڈنگ تعمیر ہوئی تو یہ تمام علاقہ بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور عالمی شہرت یافتہ غیر ملکی کمپنیوں کے دفاتر کا مرکز بن گیا بالخصوص رائل پارک فلمی دفتروں اور فلمی سرگرمیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ نتیجتاً اس تقریباً ایک مربع میل کی حدود میں متعدد ہوٹل اور ریسٹورنٹ قائم ہو گئے۔ لاہور ہوٹل اس مقام پر تھا جہاں سے ایک راستہ فلیمنگ روڈ سے گزرتا ہوا حضرت شاہ ابوالمعالی کے مزار اقدس کو جاتا ہے۔ یہ ادیبوں اور شاعروں کی پسندیدہ بیٹھک تھی۔ اس سے ذرا آگے ویرا ہوٹل ہوا کرتا تھا بعد میں آغا شورش نے اسے چٹان بلڈنگ میں تبدیل کر دیا۔ رائل پارک کے بیرون ہوٹل برسٹل اور اس ک علاوہ بہت سے ہوٹل تھے جن میں کنگ سرکل، ویسٹ اینڈ، پرنس ہوٹل اور مانسرو در ریسٹورنٹ شامل تھے۔ ان میں مانسرو در ریسٹورنٹ اینگلو انڈین کال گرلز کی فراہمی کے حوالے سے بھی ایک مخصوص شہرت رکھتا تھا۔ نسبت روڈ سے سرکلر روڈ بیرون لوہاری تک صرف دیال سنگھ کالج، دیال سنگھ لائبریری اور میو ہسپتال کی عمارات جدید تھیں وگرنہ تمام عمارات سکھ عہد کی تعمیر شدہ تھیں۔ میو ہسپتال کے بالکل سامنے ایک بہت بڑی لاتعداد کمروں پر مشتمل بھارت بلڈنگ تعمیر ہوئی۔ یہ اب بھی موجود ہے اور اس میں سرکاری دفاتر قائم

ہیں۔ یہ بلڈنگ شہر کے متمول رئیس ہرکشن لال گابا کی تھی ان کے بیٹے کنہیا لال گابا نہایت پڑھے لکھے، عالم فاضل اور دانشور تھے۔ تحصیل علم کے دوران تحقیق اور سچائی کے تلاش کے جذبے نے انہیں مسلمان بنا دیا۔ قبول اسلام کے بعد انہوں نے خالد لطیف گابا کا نام اختیار کر کے کے ایل گابا کے نام سے انگریزی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی علمیت کے سبب مسلمانان لاہوران کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اسی بھارت بلڈنگ کے سامنے عہد سکھی میں یہاں گوالوں کی کچی بستی ہوا کرتی تھی بالکل دیہات کا سا منظر تھا کچے مکان اور ان سے ملحق بڑے بڑے مویشیوں کے باڑے، مغلیہ عہد میں لاہور کی سب سے بری سبزی منڈی گڑھی شاہو میں ہوا کرتی تھی جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ساتھ ساتھ دکانیں ہوا کرتی تھیں، پھر جب کشیدگیوں میں اضافہ ہوا تو ہندو تاجر بیرون شاہ عالم سیتلا مندر سے موجودہ ہسپتال روڈ اور بانسانوالہ بازار میں آ کر آباد ہو گئے جب سرائے رتن چند کی تعمیر شروع ہوئی تو سبزی منڈی بھی گوالمنڈی ہی میں منتقل کر دی گئی۔ انگریزوں کی آمد کے بعد جب میو ہسپتال کی تعمیر کے لیے جگہ کا انتخاب ہوا تب یہ علاقہ غلاظت اور بدبو سے آلودہ تھا دوسرے انگریزوں کی فوجی چھاؤنی کے لیے دودھ کی فراہمی یہی گوالے کرتے تھے، فوجی چھاؤنی بھی انارکلی سے منتقل ہو کر میاں میر جا رہی تھی، چنانچہ یہ علاقہ گوالوں سے خالی کرایا گیا اور وہ لاہور کے ان نواحی علاقوں میں باآسانی منتقل ہو گئے جہاں سبزے کی فراوانی تھی۔ البتہ سبزی منڈی موجود رہی، بعدازاں شہر کے امیر اور متوسط ہندوؤں نے ۱۹۲۰ء کے دورانیہ میں یہاں جدید طرز کی بلند و بالا عمارات کی تعمیر شروع کی۔ ہندو طرز تعمیر میں صحن وسط میں کھلا رکھا جاتا تھا جب کہ چاروں طرف کمرے بنائے جاتے تھے۔ ہندو چونکہ نفسیاتی طور پر محتاط خرچ پسند ہوتے ہیں اس لیے ان کی تعمیرات میں بھی وسعت اور فراخی کی جگہ گھٹن کا احساس نمایاں ہوتا ہے البتہ بیرونی ماتھے پر وہ اپنے پسندیدہ دیوتا کا بت، بیل بوٹے اور روشندانوں میں رنگین شیشے لگانا بہت پسند کرتے تھے۔ دروازوں میں بھی وہ اضافی جالی والے دوہرے دروازے لگانا پسند کرتے تھے گھر کے باہر مختصر ساتھڑا بھی تعمیری و تمدنی ثقافت کا حصہ تھا البتہ حویلیوں میں جھروکے محرابیں اور بیل بوٹوں کے نقش و نگار بہت اہم ہوتے تھے۔ دروازے اور کھڑکیوں میں باریک کھدائی سے نقش و نگار اسے ایک آرٹسٹک شہپارہ بنا دیتے تھے۔ صحن میں تلسی کا پودا بھی بڑے اہتمام سے لگایا جاتا تھا۔

مسلم تعمیرات میں وسعت اور دیدہ زیبی پر توجہ زیادہ ہوتی تھی جبکہ سکھ تعمیرات نہایت سپاٹ اور سادہ ہوتی تھیں۔ گوالمنڈی میں قیام پاکستان سے قبل زیادہ تر ہندو رہائش پذیر تھے صرف گندا انجن سے آگے حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کے مزار یا دل محمد روڈ پر مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں تاج کمپنی کی پرانی عمارت تھی، قرآن مجید کی اشاعت میں اسے خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ شیخ عنایت اللہ یہیں بیٹھا کرتے تھے۔ یہاں پر سب سے خوبصورت بلڈنگ پنڈت گرودت شرما کی امرت دھارا بلڈنگ تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کا نسخہ کسی درویش کا عطا کردہ تھا اور یہ ہر مرض کے لیے شفا سمجھی جاتی تھی۔ بعد میں یہاں حکیم اجمل خان نے دواخانہ قائم کر لیا۔ قرشی دواخانہ کے حکیم محمد حسن قرشی بھی امرتسر سے ہجرت کر کے گوالمنڈی آن بسے۔ قرشی کا علاقہ ترکستان اور افغانستان کے درمیان واقع ہے، حضرت امیر خسرو کے اجداد اگرچہ ترک تھے مگر وہ بھی قرشی ہی میں آ کر آباد ہوئے۔ حکیم محمد حسن قرشی کا شمار یہاں کے رؤساء میں ہوتا تھا۔ وہ بیڈن روڈ پر طب کی دکان کرتے تھے۔ ان کے بیٹے آفتاب قرشی اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے، مولانا عبدالستار نیازی بھی ان کے ہم جماعت تھے۔ آفتاب قرشی نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا، وہ مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔ برف خانے کے چوک سے بائیں جانب عرب ہوٹل اور بسم اللہ پان وال کی دکان ہوا کرتی تھی۔ یہاں ہر وقت ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ گوالمنڈی چوک کے عارف ہوٹل کا پرانا نام تارا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اس پورے محلّہ میں صرف چوک میں جہاں اب مہر کی دودھ دہی کی دکان ہے، لالہ پرس رام کی پرچون کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اسی چوک میں امرتسریوں نے آمنے سامنے دو ہوٹل کھول لیے جہاں ہر وقت اونچی آواز میں فلمی ریکارڈ لگانے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ انہی میں سے ایک ہوٹل کی بالائی منزل پر امرتسر سے آئے ہوئے ساغر صدیقی نے سکونت اختیار کی، ان کا اصل نام محمد اختر شاہ تھا۔ سفید پوش بلکہ غریب خاندان سے تعلق تھا لیکن صبر و قناعت کی دولت سے مالا مال تھے۔ سولہ برس ہی کی عمر میں ناصر حجازی کے تخلص کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر اور مولانا تاجور نجیب آبادی نے اردو زبان کی ترویج اور ارتقاء کے لیے ''اردو مجلس'' کے نام سے ایک بزم قائم کی تو ساغر اس کے مشاعروں سے متعارف ہوئے اور بہت کم مدت میں انہوں نے اپنے عہد کے نامور

شاعروں سے اپنی شعری صلاحیت تسلیم کرالی۔ ایک طرحی مشاعرے میں اس زمانے کے نامورترین شعراء شریک محفل تھے جبکہ مسند صدارت پر جگر مراد آبادی متمکن تھے۔ مصرع طرح تھا

سجدہ گاہ عاشقاں پر نقش پا ہوتا نہیں

جب شمع محفل ساغر صدیقی کے روبرو کی گئی تو انہوں نے اپنی تازہ غزل سنائی۔

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
ہر شناور کو نہیں ملتا تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں
ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقام خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

نتیجتاً جب صدر محفل جگر مراد آبادی کی باری آئی تو انہوں نے کہا کہ ''حاصل مشاعرہ غزل ہو چکی ہے اب میری غزل کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر سٹیج پر ہی اپنی غزل پھاڑ کر ساغر کو سینے سے لگا لیا۔ قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں وہ انتہائی خوش پوشاک اور بناؤ سنگھار سے نہایت وضع قطع کے ساتھ رہتے تھے۔ غزل کا شگفتہ پن اور سریلا ترنم، ساغر ہمیشہ محفل لوٹ لیا کرتے تھے لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی قناعت کی حدود میں مزید محدود ہوتے گئے۔ مختلف نشوں کے ملاپ واختلاط نے ان پر جذب و بے خودی کی کیفیت پیدا کر دی اور صورتحال تبدیل ہوتے ہوتے یہ ہوگئی کہ

میکدے کی حدود میں ہوں گے
کیا بتائیں پتہ فقیروں کا

میلے کچیلے خاک سے اٹے بکھرے بال، خاک آلودہ چہرہ، کسی بھی فٹ پاتھ پر کلائی کا تکیہ بنا کر سو جاتے۔ بھاٹی سے لوہاری تک ساری دھرتی اس کی اپنی مملکت تھی، یہ ساری دھرتی اس کا اپنا بستر تھی جہاں جی چاہتا آسمان اوڑھ کر سو جاتا، مستی سے بڑھ کر سرمستی اور درویشی سے بڑھ کر مدہوشی تھی کہ

آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں
کون کہتا ہے کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

امرتسر سے آئے ہوئے ادیبوں اور شاعروں نے بھی گوالمنڈی ہی میں ڈیرہ جمایا۔ کھانے کے معاملہ میں چونکہ امرتسریے بھی لاہوریوں کی طرح باذوق اور خوش خوراک ہیں، تقسیم کے بعد اس علاقہ میں امرتسر کے مہاجر زیادہ آباد ہوئے، چنانچہ اشیائے خوردونوش میں گوالمنڈی کی سب سے پہلی دکان ۱۹۴۷ء ہی میں شمس دین نے تکہ کباب کی قائم کی۔ انہیں لاہور میں سب سے پہلے تکہ کباب متعارف کرانے کا اعزاز حاصل ہے۔ بعد میں یہاں سردار مچھلی والا، چھیدا سالن والا، یٰسین کلچے والا، جیجا دودھ والا، عنایت مٹھائی والا، چھجو پان والا اور قاسم شاہ دیسی گھی والا کی دکانیں قائم ہوئیں۔ ایروز سینما البتہ پہلے سے موجود تھا۔ تاج شاہ کی مسجد سے ملحق ایک اکھاڑہ تھا جبکہ ایک اور اکھاڑہ اسی رہگزر (موجودہ چیمبرلین روڈ) کی انتہا پر تکیہ میراثیاں کے ساتھ بنا ہوا تھا۔ تکیہ میراثیاں قیام پاکستان کے وقت گلوکاروں کے اجتماع کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اسی تکیے میں استاد بڑے غلام علی خان اور استاد برکت علی خان نے خان صاحب استاد بڑے عاشق علی خان سے صولی (لال رنگ کا بٹا ہوا دھاگہ) بندھوا کر شاگردی حاصل کی تھی، اسی احاطہ میں عاشق علی خان آسودہ خاک ہیں۔ یہیں برکت علی محمڈن ہال (اب بھی موجود ہے) سیاسی اجلاسوں کے لیے مخصوص تھا۔ خان بہادر محمد برکت علی خان کے آباؤاجداد افغانستان سے ہجرت کر کے شاہجہاں پور میں آباد ہوئے، برکت علی خان کے والد عارف خان پہلے پہل اودھ کے شاہی دربار سے منسلک تھے۔ بعدازاں مرہٹہ سردار جسونت راؤ ہولکر کے کماندار مقرر ہوئے۔ بھرت پور پر برطانوی قبضے کے بعد کرنل گارڈنر نے انہیں ۵۰۰ گھڑ سوار دستے کا کماندار مقرر کیا۔ برکت علی خان نے ۱۸۴۷ء میں ہوشیار پور کے تھانہ موگیراں میں بطور تھانیدار اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۸۴۸ء میں جب انہوں نے ایک معرکہ میں لارڈ جان لارنس کی جان بچائی تو اس نے ذاتی طور پر ۵۰۰ روپے انعام دے کر پنجاب ملٹری پولیس فورس کا رسالدار بنا دیا۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں چونیاں کے تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۸ء میں وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ لارنس نے انہیں ایبے سینیا کی جنگ کے دوران اعلیٰ خدمات پر خان بہادر کا خطاب دیا۔ جنوری ۱۸۸۲ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے

ریٹائر ہوئے۔ ان کے تعمیر کردہ اس ہال میں قائداعظم بھی دو مرتبہ تشریف لائے۔ اس کے بالمقابل موچی دروازے کا باغ لاہور کی تمام سیاسی اور احتجاجی تحریکوں کا نقطہ آغاز رہا ہے۔ گیارہ نومبر ۱۹۱۹ء کو گیارہ بج کر گیارہ منٹ پر ایک معاہدے کے تحت اتحادیوں نے ترکی کا علاقہ یونان کے حوالہ کر دیا۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکوں کے حق خودارادیت کے لیے آواز بلند کی تو اہل لاہور جو کہ انگریزوں سے پہلے ہی متنفر تھے، مصطفیٰ کمال پاشا کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ لاہور کی سیاسی تاریخ کا پہلا احتجاجی جلوس تحریک خلافت کے حوالہ سے اسی باغ سے مرتب و منظم ہو کر نکلا۔ اس کی قیادت لاہور کے سب سے بڑے بدمعاش نوردین کاڈے کے بیٹے فیروزالدین نے کی، جسے عدالت نے بیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ اسی باغ میں مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور خاکسار کے جلسے ہوتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریریں سننے کے لیے پورا شہر امنڈ آتا تھا۔ ساری ساری رات یہ جلسے جاری رہتے تھے۔ موچی دروازے کا اصلی نام موتی دروازہ تھا۔ عہد اکبری میں یہ دروازہ تعمیر ہوا اس کا کلید بردار موتی رام مرتے دم تک یہاں محافظ رہا۔ اس کی موت کے بعد سرکاری طور پر یہ دروازہ اسی سے منسوب کر دیا گیا جو بعدازاں عہد سکھی میں بگڑ کر موچی ہو گیا۔ اس کی اندرونی آبادی عہد مغلیہ ہی میں تشکیل پا چکی تھی، دروازے میں داخل ہوتے ہی عہد شاہجہاں میں تعمیر شدہ دو مساجد موجود ہیں۔ دربار مغلیہ کے امراء رؤساء نے بھی یہاں بہت سی ارفع و اعلیٰ عمارات تعمیر کرائیں جن میں سے بعض کے نقوش اب بھی واضح ہیں۔ مسجد وزیر خان کے بانی نواب سعد اللہ خان نے یہاں کالے پتھروں سے ایک حویلی تعمیر کرائی جو رنجیت سنگھ کے زمانے میں بارود پھٹنے سے منہدم ہو گئی۔ یہیں محمد شاہ کے زمانے کی تعمیر شدہ مبارک حویلی میں رنجیت سنگھ نے نادر شاہ کے جانشین شاہ شجاع الملک کو قید کر کے کوہ نور ہیرا چھینا تھا۔ سکھ عہد میں رنجیت سنگھ نے یہ حویلی سردار کہر سنگھ سندھیانوالہ کو عطا کی جس نے اسے نواب علی رضا قزلباش کے ہاتھ فروخت کر دی۔ علی رضا خان کابلی قزلباش تھے۔ ۱۸۳۹ء میں جب برطانوی فوج شجاع کے ہمراہ کابل پہنچی اور گھیراؤ میں آ کر افسروں سمیت گرفتار ہو گئی تو علی رضا نے ہزاروں روپے خرچ کر کے ان گرفتار شدگان کو دوران قید خوراک و دیگر ضروریات فراہم کیں اور بعدازاں قبائلیوں سے مذاکرات کر کے ہزاروں روپے تاوان ادا کر کے نجات دلائی۔ ایک اور

موقع پر جب انگریزی فوج کو اکبر خان نے قید کر کے ہزارہ بھیجا تب رئیسان ہزارہ اور اکبر خان کے محافظ صالح خان کو بھاری رقم دے کر رہائی دلائی۔ انہی کی کوششوں سے کابل کے قزلباش اکبر خان سے علیحدہ ہو کر انگریزوں کے حامی ہو گئے لیکن ان کی ان سرگرمیوں کی پاداش میں امیر کابل نے تمام جائیداد ضبط کر کے مکانات زمین بوس کرا دیئے۔ ۱۸۴۶ء میں کانگڑہ و کشمیر ۵۷۔۴۹۔۱۸۴۸ء میں دہلی میں خدمات سرانجام دینے پر اودھ کے ۱۴۷ دیہات، دو ہزار روپے ماہانہ وظیفہ اور لاہور کے اعزازی مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔ ۱۸۶۴ء میں نواب کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۶۵ء میں انتقال ہوا۔ تدفین کے لیے لاش کربلائے معلیٰ بھیجی گئی۔ ان کے تین بیٹے تھے، نواب سرنوازش علی خان، نواب ناصر علی خان اور نواب نثار علی خان، موخر الذکر کم عمری ہی میں فوت ہوئے، مبارک حویلی اب حویلی نثار خان کہلاتی ہے اور لاہور میں ذوالجناح کا مرکزی جلوس یہیں سے ہر برس کربلا گامے شاہ کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ اسی علاقہ میں حویلی شیر سنگھ، حویلی میاں فضل دین، معروف صحافی طاہر علی رضوی کے والد سید اکبر شاہ کی حویلی اور امام بارگاہ، کوچہ قاضیاں میں ممتاز دانشور شباب مفتی کے والد مفتی کفایت اللہ کی حویلی، محلّہ پیر گیلانیاں میں پیر اصغر علی شاہ، پیر نادر علی شاہ اور چن پیر شاہ کی حویلی تھی، انہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ محلّہ ککے زئیاں میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل غلام محمد کی حویلی تھی۔ عہد انگریزی میں قزلباش فیملی کے علاوہ ایک اور بااثر خاندان خان بہادر سید رجب علی شاہ ارسطو جاہ کا تھا، یہ گورنر پنجاب کے مشیر تھے انہی کے توسط سے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دہلی کے جگراؤں رئیس یہاں آباد ہوئے، اس خاندان نے چونکہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی جان بچائی تھی اس لیے انہیں وسیع پیمانے پر جاگیریں اور حویلیاں فراہم کی گئیں۔ پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین ممدوٹ بھی کوچہ پوربیاں میں سکونت پذیر رہے۔ یہ علاقہ متعدد محلوں اور کوچوں پر مشتمل تھا جن میں کوچہ تیر گراں، کوچہ کمان گراں، کوچہ زرگراں، کوچہ قاضیاں، محلّہ پیر گیلانیاں، محلّہ ککے زئیاں، نور گلی، کٹڑہ ولی شاہ، حمام میاں رانجھا، طویلہ نواب صاحب اور چوہٹہ مفتی باقر شامل ہیں۔ جن میں پنجاب اسمبلی کے سپیکر اور انجمن حمایت الاسلام کے صدر خلیفہ شجاع الدین، شمس العلماء، محمد حسین آزاد، حضرت مولانا دیدار علی شاہ، ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، سید محمد داؤد غزنوی، علامہ مرزا احمد علی امرتسری، شمس العلماء علامہ

سید علی الحائری، مجتہد اعظم علامہ سید قاسم علی شاہ، ذاکر سید امداد علی شاہ، پنجابی کے شاعر استاد عشق لہر، قمر الدین کامل، مولانا بخش، سید عابد علی عابد، پاکستان کے پہلے عالمی تن ساز اقبال بٹ فلمسٹار کملا اور غلام محمد، موسیقاروں میں استاد بڑے غلام علی خان، چھوٹے غلام علی خان، سارنگی نواز میاں رحیم بخش، استاد نیاز حسین شامی، لاہور کارپوریشن کے میئر ہادی علی شاہ۔ مشہور پبلشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، شیخ مبارک علی اینڈ سنز اور لاہور میں رنگین پرنٹنگ کے بانی حافظ قمر الدین بھی یہیں رہائش پذیر تھے۔

اندرونی موچی دروازہ میں چوک نواب صاحب سے ملحق ہی اکبری منڈی قائم ہے اس کا اصلی داخلی دروازہ عہد اکبری میں تعمیر ہوا تھا۔ پہلے پہل یہ صرف شہنشاہ جلال الدین اکبر کی آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اسی نسبت سے یہ اکبری دروازہ کہلاتا تھا۔ عہد اکبری میں لاہور کی اشیائے خورد و نوش از قسم گندم چاول دال تیل کی منڈی اندرون لوہاری چوک جھنڈا میں ہوا کرتی تھی، حضرت حسو تیلی کی بھی یہیں دکان تھی اسی دکان پر ان کی نسبت سے جھنڈا لگا ہے اور چراغ جلتا ہے۔ اندرون اکبری کا علاقہ تمام کا تمام مغل عہد ہی سے ہندوستان کی بستی رہا۔ یہاں شہر کے متمول سیٹھوں ساہوکاروں اور بنیوں کی حویلیاں اور مکانات تھے۔ یہاں متعدد مندر حتیٰ کہ مردے جلانے کا مرگھٹ بھی تھا اور یہاں صدہا سادھیاں موجود تھیں۔ عہد شاہجہانی میں یہاں ہندو سوداگروں نے اشیائے خورد و نوش کے لیے دکانیں قائم کی تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں یہاں دال، چاول، گڑ، شکر، تیل کی تقریباً سو دکانیں تھیں جن میں پانچ مسلمانوں کی تھیں۔ قیام پاکستان تک ان دوکانوں کی تعداد دو سو سے زائد تھی جن میں مسلمانوں کی مزید کم ہو کر صرف چار دکانیں رہ گئی تھیں۔ تب یہ راشن بازار کہلاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دیسی گھی روپے سیر ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ زرعی پیداوار کے حوالہ سے ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا لکن تب بھی بہت سی زرعی اجناس اور مصالحہ جات بیرونی ممالک یعنی ایران سے سوکھا دھنیا اور زیرہ، سپین، انڈونیشیا اور مڈغاسکر سے لونگ، تائیوان سے کالی مرچ منگوائی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں چائے کی پتی کا کوئی وجود نہ تھا۔

یہیں سے ایک راستہ اندرون دہلی دروازہ کشمیری بازار نکل آتا ہے، تکیہ سادھواں کشمیریاں سے سید پطرس اور سید زیڈ اے بخاری نے بہت شہرت پائی۔ عہد مغلیہ میں کشمیری

سوداگر اس مقام پر عارضی بازار لگایا کرتے تھے، پھر یہ کاتبوں کا مرکز اور کتب فروشی کا مرکز بن گیا۔ اس زمانے میں اعظم مارکیٹ کی جگہ کھلا میدان اور اکھاڑہ ہوا کرتا تھا۔ رنگ محل کے موجودہ صرافہ بازار میں سونے کے زیورات کی صرف ایک دکان تھی، اس کا مالک مسلمان تھا اس کا نام محمد اشراف تھا اور یہ اسی کے نام پر اشراف بازار کہلاتا تھا، جب چند دکانیں مزید قائم ہوئیں تو یہ اشراف سے صراف اور پھر صرافہ بازار بن گیا۔ گمٹی بازار میں کپڑوں اور ٹوٹوں کی دکانیں ہوا کرتی تھیں ایک ایسے ہی کپڑا فروش کورشید کاردار نے فلمی ہیرو بنا دیا اس کا نام نذیر تھا، نذیر ٹوٹیاں والا کی سورن لتا کے ساتھ بہت فلمیں مشہور ہوئیں۔ گمٹی بازار سے پانی والا تالاب کے نزدیک سودی کاروبار کا بادشاہ بلاقی شاہ ہوا کرتا تھا وہ ایسے رئیس زادوں کی تلاش میں رہتا تھا جن کے باپ نئے نئے مرے ہوں وہ اشٹام پیپر لکھوا کر سود پر بھاری قرضے دیتا تھا۔ لوگوں میں بلاقی شاہ کا نام چالاکی اور ہوشیاری کا سمبل تھا۔ پانی والا تالاب ہی میں حکیم حسن عسکری کا مطب واقع تھا یہیں ایک اور اہم شخصیت میاں امیر الدین کی تھی، ان کا بیٹا صلاح الدین صلی، علامہ اقبال کا داماد تھا۔ چونا منڈی میں ڈرامہ نگار ڈاکٹر انور سجاد کے والد ڈاکٹر دلاور حسین علاقہ کی بڑی مقبول شخصیت تھے، نزدیک ہی شیرانوالہ دروازے میں حضرت مولانا احمد علی اور مستی دروازے کے باہر حکیم نیر واسطی ہوا کرتے تھے۔ ان کا مطب جب مریضوں سے خالی ہوتا تو شاعروں ادیبوں اور دانشوروں سے بھر جاتا۔

شاہ عالمی دروازے میں تمام تر ہندو رہتے تھے ان میں سیتارام بڑا متمول، جی دار اور سرکار دربار میں رسائی رکھنے والا بدمعاش طبع شخص تھا۔ تقسیم کے دورانیہ میں جب ہندو مسلم فسادات جوبن پر تھے اور ایک دوسرے کی املاک لوٹی اور جلائی جا رہی تھی، اس کا چیلنج تھا کہ کوئی اس کی حویلی کو لوٹنا تو کجا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس چیلنج سے مشتعل ہو کر اس کی حویلی کو لڑکوں نے ایسی آگ لگائی کہ پوری شاہ عالمی خاکستر ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ شاہ عالمی میں کبھی نواب وزیر خان کا پری محل ہوا کرتا تھا اب اس کی باقیات میں صرف مسجد پری محل نہ صرف موجود ہے بلکہ ہر وقت آباد رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاپڑ منڈی ہوا کرتی تھی۔ عہد مغلیہ ہی سے یہاں بھنے ہوئے چنے، تلی ہوئی دال سیویاں، پکوڑے اور مختلف اقسام کے پاپڑ بنتے اور بکتے تھے۔ ہندو چونکہ گوشت نہیں کھاتے اس لیے مختلف اجناس ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ تمام

محلہ ہندوؤں کا تھا اور وہی یہ تمام کاروبار کرتے تھے۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں اچھرہ میں واقع بھیرو جی کے مندر کا مہنت جوالا ناتھ بھی یہاں پکوڑے بیچا کرتا تھا۔ یہ بہت بڑا عالم اور عامل بھی تھا، موراں طوائف کی ماں کا جادو اسی نے اتارا تھا، موراں کے سبب رنجیت سنگھ بھی اس کا احترام کرتا تھا۔ موراں اور اس کی بہن ممولاں یہیں رہتی تھیں، یہیں موراں نے ہندو ہوتے ہوئے یہاں ایک نہایت عالی شان مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی بھرپور آباد ہے۔ اس سے چند قدم آگے لاہور شہر کا سب اولین اور مرکزی دروازہ لوہاری ایستادہ ہے۔ اس سے ذرا آگے موری دروازہ ہے۔ یہاں عہد قدیم میں شہر کے گندے پانی اور گندگی کے نکاس کے لیے صرف ایک چھوٹی سی موری ہوا کرتی تھی جسے کھولا کر کے محمود غزنوی پہلی مرتبہ لاہور میں داخل ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ذرا آگے جائیں تو ہندوؤں کے زمانہ حکومت سے لاہور کا سب سے زیادہ پررونق بھاٹی چوک آباد ہے۔ حضور حضرت داتا علی ہجویریؒ کی لاہور تشریف آوری کے وقت یہاں دریائے راوی کا آبی کشتیوں کا گھاٹ ہوا کرتا تھا۔ مسافروں کی آمدورفت کی وجہ سے یہ نہایت آباد علاقہ تھا۔ یہیں ایک اونچے ٹیلے پر حضرت داتا گنج بخشؒ نے قیام فرمایا۔ یہ عین وہی مقام ہے جہاں اب آپ کا مزار اقدس واقع ہے۔ عہد انگریز میں فصیل کے باہر باغ میں نہر بہتی تھی اور تمام علاقہ مولسری کے درختوں کی مہک سے سرشار رہتا۔ شیش محل روڈ پر بابا کھڑ کھڑ پیر کا مزار اور تکیہ تھا یہاں ہر جمعرات شہر کے تمام بڑے گلوکار اور فنکار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خان صاحب عاشق علی خان صاحب سے محمد رفیع تک کوئی ایسا گلوکار نہیں جس نے یہاں حاضری نہ دی ہو۔ داتا حضور کے مزار مبارک سے امام بارگاہ کربلا گامے شاہ تک ٹھیکیدار میلا رام کی ٹیکسٹائل ملز ہوا کرتی تھی اسی کے ساتھ لال کوٹھی میں اس کی رہائش تھی، یہ نہایت غیر متعصب روشن خیال اور مخیّر انسان تھا۔ یہیں اس کا تعمیر کردہ کراؤن تھیٹر ہوا کرتا تھا جسے لوگ میلا رام کا منڈوا بھی کہا کرتے تھے۔ اور رینٹ ہوٹل کے مقام پر لکڑیوں کا ٹال ہوا کرتا تھا۔ یہ تمام علاقہ نہایت وسیع وعریض کھلا ہوا ہوتا تھا، چنانچہ متعدد تھیٹر کمپنیوں نے مستقل تھیٹر قائم کر لیے تھے۔ ان میں ولنگٹن سینما کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد سے ملحق ایک سکھ کا چنڈو خانہ ہوا کرتا تھا جب فلموں کا دور آیا تو اس نے اس چنڈو خانے کی جگہ پر پیراماؤنٹ سینما تعمیر کیا۔ اب سینما تو موجود نہیں البتہ مسجد اور دو بزرگوں حضرت سید سلطان بخاریؒ اور سید نتھو شاہ

بخاریؒ کے مزارات اقدس موجود ہیں۔ پیراماؤنٹ سینما کے منیجر سید برکت علی شاہ کے دفتر میں تمام دن فلمی فنکاروں اور گلوکاروں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ یہیں تمام فنکار اکٹھے ہو کر مختلف سٹوڈیوز کی شوٹنگز کے لیے روانہ ہوتے، ایک طرح یہ فنکاروں کے پک اینڈ ڈراپ کا جنکشن تھا۔ سید برکت علی شاہ، سید ہونے کے ناطے نہایت مہمان نواز تھے، موجودہ معروف فلمی کہانی نویس اور ہدایتکار سید نورانہی کے صاحب زادے ہیں، اسی چوک میں کرکٹر سلیم الطاف کے دادا اور ٹیلی ویژن کے کمپیئر نعیم بخاری کے والد ڈاکٹر سید محمد طفیل شاہ کے دست شفاء کی بہت شہرت تھی۔ پہلوان شفیع مشین مین اور رستم پان والا کی دکان ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، فلمی فنکاروں، گلوکاروں، موسیقاروں، پہلوانوں اور سیاسی کارکنوں کے اجتماع کا مرکز تھی۔ اندرونی بھاٹی دروازہ داخل ہوتے ہی بائیں جانب ذیلداروں کا خاندان تھا جن میں بشیر ذیلدار لاہور کی نامی گرامی شخصیت تھے، یہیں کونے میں دودھ دہی کی دکان تھی، سامنے تمباکو کی چھوٹی سی دکان، پھر مطب، آگے بھاساجھے کی دودھ اور مٹھائی کی دکان، عطا محمد شربت مربے والے، پھوجا قصائی، گھوٹا حلوائی، شیدا پہلوان پان سگرٹ بیچتا تھا حالانکہ اس کا بڑا بھائی محمد شریف سیشن جج تھا، اس کے ساتھ پیسو کا ہوٹل تھا۔ یہاں ایک آنہ میں بکرے کے بھنے گوشت کی پلیٹ اور ایک پیسہ میں روٹی ملتی تھی۔ صرف روٹی لینے والے کو دال مفت ملتی تھی۔ قیام پاکستان تک لاہور میں پیسہ تندوروں کی بھرمار تھی۔ اس کے سامنے بوڑھے بیلی رام پنساری کی دکان تھی، یہاں آٹا، دال، چاول، تمام مصالحہ جات، جڑی بوٹیاں اور دوائیاں دستیاب تھیں اس سے ملحق گڑ کی ریوڑیاں، گزک اور پتاشے بنانے کی دکان تھی، اس کے اوپر گلوکار علی بخش ظہور کی بیٹھک پر رات گئے تک موسیقی کی محفلیں سجی رہتیں۔ محمد دین اور غلام محمد ٹیلرز بھی یہیں تھے۔ غلام محمد صرف فلمی اداکاروں کے ڈریسز بناتا تھا، چنانچہ یہاں ہر وقت فلمی فنکاروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ گلاب دین وکیل بھی یہیں رہتے تھے وہ روایتی وکیل سے زیادہ خدائی خدمت گار تھے جہاں کسی کی حق تلفی دکھائی دیتی از خود اپنی خدمات پیش کر دیتے اور جب تک مظلوم کو انصاف نہ دلاتے چین سے نہ بیٹھتے۔ منھا گجھا پہلوان بھی یہیں پتنگ سازی کا کارخانہ چلاتا تھا۔ اندرون بھاٹی دروازہ اونچی مسجد عہد اکبری میں قلعہ لاہور کے شاہی سقہ نے تعمیر کرائی۔ اس مسجد میں حضرت وارث شاہؒ اور حضرت بابا بلھے شاہؒ کے مرشد حضرت شاہ عنایت قادریؒ امامت و خطابت فرمایا کرتے

تھے۔ جبکہ حضرت شاہ عنایتؒ کے مرشد حضرت سید احمد رضا شاہؒ کا مزار مبارک ذرا فاصلے پر بازار جج سے بازار شیخوپوریاں جاتے ہوئے واقع ہے۔ اونچی مسجد سے ملحقہ گلی میں برصغیر کے نامور گلوکار محمد رفیع کی حجامت کی دکان تھی، گانے کا شوق تھا ایک مرتبہ گھڑ کھر پیر کے مزار پر گایا تو فیروز نامی نے ان میں چھپا گلوکار بھانپ لیا اور پھر انہوں نے ہی متعارف کرایا۔ اسی گلی میں گلوکار شفیع نا گی اور مرزا ادیب کے آباؤ اجداد بھی رہتے تھے۔ محلّہ جوگیاں میں عہد مغلیہ سے بھی قدیم حضرت شادھو ولی شاہ کے مزار کے ساتھ اکھاڑہ ہوا کرتا تھا۔ یہیں میاں شہباز کی بیٹھک میں اورینٹل کالج کے شعبہ ادبیات عربی کے سربراہ شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ جغرافیہ کے سربراہ شیخ عبدالعزیز، حکیم احمد شجاع، سید امتیاز علی تاج، علامہ اقبال اور اسی عہد کے دیگر سبھی بڑے ادیب شاعر اور دانشور یہیں محفلیں سجاتے تھے۔ محلّہ جوگیاں سے آگے بازار حکیماں میں آج بھی فقیر فیملی کا فقیر خانہ آباد ہے۔ اس خاندان کے جدامجد سید غلام شاہ، بادشاہ محمد شاہ کے زمانہ میں نواب عبدالصمد اور نواب زکریا خان کے ناظم تھے۔ ان کے بیٹے غلام محی الدین ایک زیرک طبیب اور حکیم حاذق تھے۔ فقیر امانت شاہ قادری کے حلقہ ارادت میں آنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے فقیر کا لقب اختیار کیا۔ ان کے تین بیٹے فقیر عزیز الدین، فقیر امام الدین اور فقیر نور الدین تھے۔ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں فقیر امام الدین امرتسر کے قلعہ گووند گڑھ کے قلعہ دار تھے۔ ۱۸۴۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ فقیر عزیز الدین رنجیت سنگھ کے ذاتی طبیب اور وزیر اعظم تھے۔ رنجیت سنگھ جب بھی کسی مہم پر روانہ ہوتا تو سلطنت کا مکمل انتظام صرف اور صرف عزیز الدین کے سپرد کرتا۔ فقیر عزیز الدین درویش طبع، صوفی منش لیکن انتہائی سیاسی بصیرت کے حامل تھے۔ انہوں نے دوسرے سکھ سرداروں اور وزیروں کے برعکس رنجیت سنگھ کو ہمیشہ انگریزوں کے ٹکراؤ سے محفوظ رکھا۔ دسمبر ۱۸۴۵ء کو ان کا انتقال ہوا۔ فقیر نور الدین بھی رنجیت سنگھ کے طبیب، وزیر اور معتمد خاص تھے ان کا ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوا۔ فقیر عزیز الدین کے چھ بیٹوں میں سے فقیر سید جمال الدین ۱۸۷۰ء میں لاہور کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ یکم جنوری ۱۸۹۲ء کو انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ فقیر سید نور الدین کے چار بیٹوں میں سے فقیر سید ظہور الدین کو ۱۸۸۳ء میں برطانوی حکومت کے لیے ۲۷ برس تک خدمات سرانجام دینے پر ۳۱۵ روپے ماہانہ پنشن،

۱۲۰۰ روپے سالانہ خاندانی پنشن اور گوجرانوالہ میں ۱۵۰۰ ایکڑ زرعی زمین عطا کی گئی۔ فقیر سید قمر الدین کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا اور خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ فقیر سید شمس الدین ۱۸۶۲ء میں لاہور میں اعزازی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ فقیر سید حفیظ الدین پنجاب کے تحصیلدار تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۸۶ء میں ہوا۔ ان کے بیٹے فقیر برہان الدین لاہور کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۰ء میں وہ لاولد انتقال فرما گئے۔

اسی فقیر خاندان کا فقیر خانہ پنجاب کا دوسرا بڑا عجائب گھر ہے۔ بادشاہی مسجد میں محفوظ آثار مبارک کی تعداد ۲۷ تھی جن کی سکھ عہد میں عقیدت و احترام سے حفاظت کی گئی۔ ۱۸۴۶ء میں جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کیا تو انہیں عارضی طور پر محدود کر کے محفوظ کر دیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں یہ تبرکات انجمن اسلامیہ کے سپرد کیے گئے جس نے انہیں شاہی مسجد میں عوام کی زیارت کے لیے سجا دیا۔ ان تبرکات کے علاوہ بھی مزید تبرکات تھے جو فقیر نورالدین نے شاہ محمد باز کے وارثان سے تین لاکھ روپے میں خریدے اور ان کی نگہداشت کے لیے آٹھ لاکھ روپے کی جائیداد وقف کی۔ ۱۹۴۸ء میں لاہور میوزیم کا بیشتر حصہ تقسیم ہو کر ہندوستان چلا گیا۔ تب میوزیم کا سناٹا دیکھ کر فقیر سید نورالدین کے پڑپوتے، میجر فقیر سید مغیث الدین نے لاہور میوزیم کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے اپنے آباؤاجداد کا یہ قیمتی ترین اثاثہ چار شرائط پر لاہور میوزیم کے سپرد کر دیا۔ (۱) تمام نوادر ایک جگہ رہیں۔ (۲) ان پر فقیر خانے کا عطیہ تحریر کیا جائے۔ (۳) یہ نوادرات صرف لاہور میوزیم میں رہیں گے۔ (۴) اگر کسی سبب میوزیم بند کیا جائے تو یہ تمام واپس فقیر خانے کے حوالہ کیے جائیں گے۔ سات سال تک یہ اثاثہ بے احتیاطی کے ساتھ میوزیم میں پڑا رہا اور بالآخر انتظامیہ نے شرائط ماننے سے انکار کرتے ہوئے اپریل ۱۹۵۲ء میں یہ نوادرات واپس کر دیئے لیکن ان میں سے ملکہ وکٹوریہ کی دی ہوئی عینک اور لارڈ ایمرسٹ کا تحفہ ہیرے سے آراستہ پنسل غائب تھیں۔ کچھ نوادرات پانی لگنے سے بھی خراب ہو چکے تھے، چنانچہ ان نوادرات کو فقیر خانے میں نمائش کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ ان کی کل تعداد چار ہزار سے زائد ہے جن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام، خاتون جنت حضرت سیدہ

فاطمۃ الزہرہ علیہا السلام، حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے منسوب مقدسات بھی شامل ہیں۔ فقیر خانہ سے ملحق ہی سر سید مراتب علی شاہ کی قائم کردہ نقش گیلری موجود ہے۔ دوسری جانب پشت پر ان کی بیگم محترمہ سیدہ مبارک بیگم کی قائم کردہ امام بارگاہ ہے۔ نہایت نیک اور سخی خاتون تھیں۔ یہیں پر سید مراتب علی اور سیدہ مبارک بیگم آسودۂ خاک ہیں۔ فقیر خانہ کے پاس ہی سید صادق علی شاہ کی رہائش گاہ تھی، انگریز دور میں یہ وہ سب سے پہلے مسلمان تھے جو مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے، معروف سیاستدان مشاہد حسین انہی کے نواسے ہیں۔ فقیر خانے سے ذرا آگے بازار حکیماں کے خاتمہ پر بازار جج محمد لطیف واقع ہے۔ سید محمد لطیف ۱۸۴۵ء میں منشی سید محمد عظیم کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کا شجرہ نسب ۲۷ ویں پشت میں دسویں امام حضرت امام الہادی النقی علی ابن محمد التقی صدق اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ پنجاب کے متعدد اضلاع میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج رہے۔ ۱۹۰۲ء میں پنجاب چیف کورٹ کے جج کے عہدے کے لیے نامزد ہوئے مگر تقرری سے پیشتر ہی بوجہ ناگہانی علالت ۱۹۰۲ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے والد منشی محمد عظیم نے لاہور سے لاہور کا سب سے پہلا اخبار ''دی لاہور کرانیکل'' جاری کیا تھا۔ شاید آپ یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۸۰ء میں منشی محمد عظیم کی ماہانہ آمدنی ایک لاکھ روپے ماہوار تھی۔ لاہور میں ذوالجناح کا مرکزی جلوس اندرون موچی دروازہ نواب قزلباش کی نثار حویلی سے نکلتا ہے۔ اس خاندان نے لاہور و دیگر مقامات پر امام بارگاہوں کی تعمیر و تزئین اور مجالس کی نذر و نیاز پر ہر زمانہ میں لاکھوں روپے صرف کیے ہیں۔ صرف ذوالجناح ہی کی نگہداشت کے لیے کروڑہا روپے کی جائیداد وقف ہے لیکن یہ بات بھی قارئین کے لیے حیران کن ہوگی کہ اس خاندان کے سربراہ نواب نوازش علی خان، عشرہ محرم کی مجالس، نذر و نیاز اور عزاداری کی ضروریات کے لیے ہر سال ماہ محرم میں منشی محمد عظیم سے پانچ سو روپے قرض لیا کرتے تھے اور سال بھر میں بتدریج ادا کرتے تھے۔

۱۹۲۳ء سے پہلے گلیوں اور بازاوں میں لکڑی کے بلند ایستادہ کھمبوں پر مٹی کے تیل کے بڑے لیمپ جلتے تھے۔ کمیٹی کا عملہ ہر شام ان میں تیل انڈیلا کرتا تھا۔ گلیوں، بازاروں اور چوراہوں پر چاروں طرف شیشہ والی قندیلیں تمام رات روشن رہتی تھیں۔ گھر کی چوکھٹ پر بیرون و اندرون چھوٹے محرابی طاق چراغوں کے لیے بنے ہوتے تھے۔ ۱۸۴۹ء میر

انگریزوں کی آمد کے وقت اندرون شہر میں صفائی اور نکاسی آب کا نظام انتہائی بدترین تھا۔ انگریزوں نے سب سے پہلے شہر کی صفائی پر توجہ دی، غلاظت کے ڈھیر ختم کر کے گلیوں بازاروں میں ماہی پشت پختہ فرش تعمیر کیے گئے۔شہر کے چاروں طرف نہر جاری کی۔۱۹۲۴ء میں بجلی کی آمد قدیم لاہوریوں کے لیے حیران کن کرشمہ تھا۔۱۹۳۴ء سے پہلے لاہور میں سواری کے لیے جانور یا جانوروں کے کھینچنے والی گاڑیاں ہی نقل وحمل کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ۱۹۳۴ء میں پہلی مرتبہ سیوک رام نے سٹیشن سے راوی تک کے لیے بس چلائی۔شہر کے ہر دروازے پر اس کا سٹاپ تھالیکن لوگ خوف کے مارے بس میں چڑھنے سے ڈرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں نندابس سروس نے اندرون وبیرون لاہور بس سروس کا آغاز کیا۔

۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم دوئم نے لاہور کی سماجی زندگی میں مہنگائی اور قیمتوں میں اضافہ کو جنم دیا۔ پہلے ایک پیسہ میں دوروٹیاں اور دال مفت ہوا کرتی تھی لیکن جنگ شروع ہونے کے بعد ایک پیسہ میں صرف ایک روٹی اور دال کی مفت مقدار بھی نصف ہو کر رہ گئی تھی جنگ سے پہلے چنے کی دال ٹکہ سیر تھی جو کہ بڑھ کر ایک آنہ سیر ہو گئی تھی، یہ ایک دوگنا اضافہ تھا، اس وقت مزدور کی یومیہ اجرت چار آنے، سپاہی کی تنخواہ دس روپے ماہوار اور تعلیم یافتہ کلرک بابو کی ماہانہ تنخواہ پندرہ روپے تھی۔ سب سے بڑا سکہ پونڈ تھا یہ خالص سونے کا تھا۔ ایک تولہ ہونے کی نسبت سے اس کی شرح مبادلہ پندرہ روپے تھی، جنگ عظیم کے دوران سونے کی قیمت پندرہ روپے تولہ سے بڑھ کر پینتیس روپے تک جا پہنچی۔ روپیہ، اٹھنی، چونی اور دونی بھی خالص چاندی کی ہوتی تھیں۔ ایک روپے میں سولہ آنے، ایک آنہ میں چار پیسے، اس ایک پیسہ میں تین پائیاں ان تین پائیوں میں پھر چار دمڑیاں ہوا کرتی تھیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک دمڑی میں دو کوڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ اجناس کی فراوانی اور ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک دمڑی میں بھی گڑ شکر تیل اور سوجی میدہ مل جایا کرتا تھا۔ ان حالات میں سکوں کی دھاتی ساخت ہی تبدیل نہ ہوئی بلکہ کاغذی نوٹوں کی ریل پیل میں ہزار روپے کا نوٹ بھی جاری کر دیا گیا اچانک اجناس اور اشیائے ضروریہ میں اتنی کمی ہو گئی کہ آٹا، چینی، مٹی کا تیل حتیٰ کہ لاہور میں کپڑا بھی راشن کارڈ پر ڈپو سے ملتا تھا۔ جنگ کے سبب اسلحہ سازی، اجناس کی فراہمی، بڑے پیمانہ پر فوجی بھرتی اور ان فوجیوں کے لیے لباس، یونیفارم، جوتوں اور دیگر اشیائے ضروریہ کے

سبب نہ صرف یہ کہ صنعت وحرفت میں اضافہ ہوا بلکہ بے روزگاری بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ جنگ کے خاتمہ پر آزادی کے وعدے کے سبب اندرون شہر، مال اور انارکلی میں گہما گہمی اور رونقیں عروج پر تھیں۔

مال روڈ

مال روڈ لاہور کی سب سے خوبصورت اور مرکزی شاہراہ ہے۔ عہد سکھی میں موجودہ سیکرٹریٹ کے مقام پر مقبرہ انارکلی کے وسیع باغ میں فوجی چھاؤنی قائم تھی جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کیا تو اس مقام سے مقبرہ نیلا گنبد تک فوجی چھاؤنی بنالی۔ انارکلی کے مقبرہ کے کلس پر صلیب نصب کر کے گرجا بنالیا اور مسجد نیلا گنبد میں کھانے کے لیے میس بنالیا۔ جب کینٹ کے دورافتادہ مقام پر پختہ مستقل چھاؤنی کا آغاز ہوا تو سول سیکرٹریٹ سے کینٹ تک وسیع پختہ شاہراہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ تمام رہگذر نہایت ویران اور جنگلات پر مشتمل تھی۔ ۱۸۵۱ء میں لیفٹیننٹ کرنل نیپیئر کی نگرانی میں آغاز ہوا۔ سڑک کی تعمیر کے دوران یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اس سڑک کے دورویہ جدید طرز تعمیر پر مشتمل سرکاری عمارات تعمیر کی جائیں اور ان عمارات کے ساتھ ساتھ حکومت برطانیہ کے مقامی وفادار اکابرین کو بھی نجی تعمیرات کی سہولت دی جائے تاکہ ان کی موجودگی میں سرکاری عمارات کا بھی تحفظ ہو سکے۔ ۱۸۷۰ء میں ڈیوک آف ایڈنبرا کی لاہور آمد سے قبل یہ ایک سپاٹ پختہ سڑک تھی جس پر درخت تو کجا سبزے کی ایک پتی بھی نہ تھی، چنانچہ پہلے مرحلے میں سڑک کو دورویہ کر کے گھنے درخت لگانے اور دائیں بائیں عمارات کی تعمیر کے لیے قواعد وضوابط متعین کیے جن کی تعمیرات کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایگزیکٹو انجینئر سر گنگارام کی مشاورت اور محنت نے اسے حسین سے حسین تر بنادیا۔

ہمارے لیے مناسب ہوگا کہ ہم مال روڈ کے جائزہ کی ابتداء لوئر مال سے دائیں جانب سے داخل ہو کر اسی سمت سے نہر تک پہنچ کر واپس لوئر مال آنے کے حوالے سے کریں، یوں آغاز راہ پر سب سے پہلے ٹاؤن ہال کی عمارت ہے۔ ۱۸۳۷ء میں سلطنت انگلشیہ ملکہ وکٹوریہ کے مکمل احکامات واختیارات کے تحت ہوئی۔ نصف صدی کی کامیاب ترین حکمرانی کے بعد ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی گولڈن جوبلی منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقع پر اہل

لاہور کی جانب سے ملکہ کو خراج تحسین پیش کرنے اور ایک شایان شان یادگار بطور تحفہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈیزائنوں کے مقابلے میں مسٹر یوگ سن کا ڈیزائن اول قرار دے کر انہیں ۵۰۰ روپے انعام دیا گیا اور انہی کی تجویز پر اس جگہ کا انتخاب کیا جو لوئر مال اور مال کا سنگم تھی۔ ۱۸۸۷ء میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ایچی سن نے بنیاد رکھی۔ فروری ۱۸۹۰ء میں وکٹوریہ جوبلی ٹاؤن ہال کی تکمیل ہوئی جس کا افتتاح ڈیوک آف کلارنس نے کیا۔ لاہور کے عوامی نمائندوں پر مشتمل ایک میونسپلٹی کمیٹی ۱۸۶۲ء میں تشکیل دی گئی تھی جس کا دفتر بیرون بھاٹی گیٹ تھا، اسے یہاں منتقل کر دیا گیا۔ عوامی نمائندوں کے اجلاس کے لیے دوسری منزل پر دیوار کے فرش سے ۴۰×۸۰ فٹ ہال بنایا گیا۔ اس عمارت کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کے لیے عمارت کے مرکزی دروازے کے سامنے ایک خوبصورت فوارہ راجہ ہربنس سنگھ نے بطور نذر نصب کروایا۔

ٹاؤن ہال کے داخلی دروازے کے عین سامنے مال روڈ کی دورویہ سڑکوں کے وسط میں ایک خوبصورت سرسبز پلیٹ فارم پر ڈیکوریشن پیس کی مانند ایک تاریخی توپ ''زمزمہ'' نصب ہے۔ زمزمہ بیک وقت عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں جدا جدا معنی رکھتا ہے۔ عربی میں ''رک رک کر چلنے والی چیز۔'' فارسی میں ''شیر کی دھاڑ'' اور ترکی میں یہ ''ہتھوڑے'' کے لیے مستعمل ہے۔ ۱۴ فٹ ساڑھے چار انچ لمبی اس توپ کے دہانہ پر فارسی میں کندہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کے حکم پر اس کے وزیر شاہ ولی خان نے شاہ نظر نامی کاریگر سے ۱۷۵۷ء میں بنوائی تھی۔ یہ ایک جیسی دو توپیں تھیں جن میں سے ایک تو احمد شاہ ابدالی کابل لے گیا۔ یہ پیتل اور تانبے کے آمیزے بھرت سے تیار ہوئی تھی۔ ان توپوں کی تیاری کے لیے لاہور کے ہر غیر مسلم گھر سے پیتل یا تانبے کا ایک ایک برتن بطور جزیہ لیا گیا تھا۔ یہ اٹھارہویں صدی کی سب سے بڑی تباہ کن اور قلعہ شکن توپ تھی۔ اسے سب سے پہلے احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے خلاف استعمال کیا۔ ۱۷۶۲ء میں ہری سنگھ بھنگی نے لاہور پر حملہ کر کے کوٹ خواجہ سعید کے مقام پر اسے اپنے قبضہ میں لے لیا یوں یہ بھنگیوں کی توپ مشہور ہوگئی۔ ۱۷۶۴ء تک یہ لاہور کے قلعہ میں بیکار پڑی رہی۔ ۱۷۶۴ء میں جب لاہور پر لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ قابض ہوئے تو چڑت سنگھ سکر چکیہ نے ان کی کافی مدد کی تھی جس پر انہوں نے یہ توپ اسے بطور تحفہ دے دی اس نے اسے گوجرانوالہ میں واقع اپنے قلعہ کے برج پر نصب کر دیا بعد

میں یہ توپ دو سگے بھائی سردار احمد چٹھہ اور پیر محمد چٹھہ اپنے ساتھ احمد نگر لے گئے جہاں اس کی ملکیت کے تنازع پر پیر محمد کا ایک بیٹا اور سردار احمد کے دو بیٹے مارے گئے۔ اس تنازع میں گوجر سنگھ تصفیہ کرانے کے چکر میں زمزمہ کو اپنی تحویل میں لے کر گجرات چلا گیا۔ ۱۷۷۲ء میں یہ پھر سکر چکیہ کے قبضہ میں آ گئی اور وہ اسے رسول نگر لے گیا۔ ۱۷۷۳ء کی لڑائی میں یہ جھنڈا سنگھ بھنگی کے ہاتھ آئی وہ اسے امرتسر لے گیا پھر یہ رنجیت سنگھ کے قبضہ میں آئی اور اس نے اسے ان گنت معرکوں میں استعمال کیا۔ مسلسل استعمال کے بعد جب یہ ملتان کی جنگ میں ناکارہ ہو گئی تو لاہور (لوہاری) دروازے کے باہر سجا دیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں ڈیوک آف ایڈنبرا کی آمد پر اسے موجودہ مقام پر نصب کیا گیا۔

زمزمہ کے بالکل مقابل ٹاؤن ہال کی سمت میو انڈسٹریل سکول آف آرٹس اینڈ ڈیزائن (موجودہ N.C.A) کی عمارت ہے جو ۱۸۸۳ء میں تعمیر ہوئی اس کا تفصیلی ذکر تعلیمی اداروں کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ملحقہ چھوٹے بڑے گنبدوں اور محرابوں والی ایک نہایت پرشکوہ عمارت پر انگریزی میں لفظ ''میوزیم'' کندہ ہے یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جو ''میوزز'' سے وجود میں آیا (میوزک بھی اسی سے ماخوذ ہے)۔ روایت ہے کہ تخلیق کے یونانی دیوتا ''زیوس'' کی دیوی ''آ ئرس'' سے نو حسین و جمیل بیٹیوں نے جنم لیا۔ ہر بیٹی فنون لطیفہ کی مختلف اصناف مصوری، مجسمہ سازی، رقص و موسیقی وغیرہ کی بانی تھی۔ اگرچہ ہر ایک کا علیحدہ انفرادی نام تھا مگر اہل یونان عقیدتاً انہی مشترکہ لفظ ''میوزز'' سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی موت کے بعد ان کی یاد میں بننے والے مندروں کو میوزیم کا نام دیا گیا کیونکہ ان کے شاگرد اور فنون سے وابستہ فنکار انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان مندروں میں اپنی اپنی تخلیقات کے فن پارے نذر کرتے تھے۔ اہل یونان نے جب ۳۰۰ برس قبل مسیح سکندریہ میں ان عجیب و غریب نادر و نایاب اشیاء کو ایک مقام پر جمع کیا تو اسے اسی نسبت سے میوزیم کا نام دیا یہ ''پٹولمی میوزیم'' دنیا کا پہلا عجائب گھر تھا۔ لاہور میوزیم ابتداء میں قدیم نوادرات اور حیرت انگیز فن پاروں اور دستکاری کے نمونوں کا مرکز تھا۔ تحقیق اور تلاش کی پیش رفت میں وادی سندھ کی قبل از تاریخ کی تہذیب کے نمونوں سے انفرادی طور پر نسل در نسل منتقل ہونے والا ثقافتی ورثہ بھی عطیات کی شکل میں یہاں جمع ہوتا رہا۔ پہلے پہل ان کی اولین نمائش ۱۸۶۶ء میں اس مقصد کے لیے قائم کی گئی

ٹولنٹن میں ہوئی۔اس نمائش کے بعد وہ لاتعداد اشیاء بھی مزید منظر عام پر آئیں جو نسل درنسل نجی تحویل میں چلی آ رہی تھیں۔ ان متروک شدہ قدیم برتنوں، پرانے نمونوں کے دھاتی زیورات، دستکاری کے خستہ پارچات، تلواروں، تیر کمانوں اور مجسموں کا ان کے نزدیک کوئی مصرف نہ تھا اور قیمتی ترین ہونے کے باوجود یہ ردی میں بھی فروخت ہونے کے قابل نہ تھیں جبکہ ان کے اظہار کے لیے یہ بہتری جگہ تھی، چنانچہ ۳ فروری ۱۸۹۰ء کو ملکہ وکٹوریہ کے خاوند پرنس البرٹ نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔اس عمارت کا ڈیزائن لاک وڈ کپلنگ اور بھائی رام سنگھ نے مشترکہ طور پر تیار کیا جبکہ اس کی تعمیر کے منتظم و مہتمم رائے بہادر گنگا رام تھے۔ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی تقریبات کے لیے مختص رقم کا ایک بڑا حصہ محفوظ تھا۔عوامی چندے کی اس رقم میں سے ایک لاکھ باسٹھ ہزار روپے کی لاگت سے یہ ۱۸۹۳ء میں مکمل ہوئی۔اس عجائب گھر میں پتھر کے زمانہ، وادی سندھ کی قبل از تاریخ تہذیب کی باقیات، ۶۰۰ قبل مسیح بدھا کی زندگی پر مشتمل گندھارا آرٹ، ہندی، جینی، اسلامی، مغلئی، سکھی اور مسیحی ادوار کے نمونے، یونانی و باختری عہد سے انگریز عہد تک کے نوادرات، پارچات، زیورات، ظروف، مجسمے، ہتھیار، سکے اور تصاویر کے علاوہ یہاں ملکہ وکٹوریہ کا وہ قد آدم مجسمہ بھی محفوظ ہے جو پہلے چیئرنگ کراس پر ایستادہ تھا۔ اس تمام عمارت میں قدرتی اور مصنوعی روشنی کا بہترین انتظام ان نوادرات و عجائبات میں پنہاں باریک سے باریک ترین فن کو بھی بہترین اجاگر کرتا ہے۔

نواب وزیر خان کی بارہ دری اسی میوزیم سے پیوستہ ہے یہاں ۱۸۸۴ء میں دارالمطالعہ قائم کر کے پنجاب پبلک لائبریری کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس کا تفصیلی ذکر 'لائبریریاں' میں درج ہے۔اس کے بالمقابل ٹولنٹن مارکیٹ ہے۔۱۸۴۶ء تک انگریزوں نے مقامی طور پر اور اردگرد سے بڑے پیمانے پر ان اشیاء کو اکٹھا کیا جس کا کچھ حصہ اب بھی لاہور میوزیم میں محفوظ ہے۔انہوں نے اس پوشیدہ خزانے کو جو اب تک محض شہنشاہوں اور نوابوں تک محدود تھے، عوام سے متعارف کرانے کا فیصلہ کیا اس مقصد کے لیے اس مقام پر ایک عارضی عمارت (ٹولنٹن) TOLINGTON قائم کر کے یکم جنوری سے ۷ اپریل تک اس خطہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عوام کو ان کے اپنے تاریخی ورثہ سے متعارف کرایا گیا۔ بعدازاں لاہور میونسپل کمیٹی نے اسے اشیائے خوردونوش کی سپر مارکیٹ میں تبدیل کر دیا، چونکہ یہ عارضی نمائش کے نقطہ نظر سے

تعمیر ہوئی تھی اس کے باوجود ڈیڑھ سو برس تک یہ قائم رہی اس کی خستگی کے سبب مسمار کر کے تجدید لاہور کے تحت قدیم طرز پر پھر سے تعمیر کی جا رہی ہے۔ اس مارکیٹ کے بعد ایک سڑک ہے جو پرانی انارکلی بازار سے انارکلی بازار کو ملاتی ہے یہ سڑک عبور کرنے کے بعد وسیع وعریض کمرشل بلڈنگ ہے عہد مغلیہ میں یہاں طوائفیں خیمے نصب کر کے بازار عیش سجاتی تھیں۔ عہد سکھی میں جب یہ علاقہ ویران ہوا تو یہ انارکلی میں چلی آئیں۔ عہد انگریزی میں انہیں انارکلی سے موجودہ بازار حسن کی طرف دھکیلا گیا۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں کمرشل بلڈنگ کے مقام پر بہت بڑا دھوبی گھاٹ تھا اس کے عقب میں یہ علاقہ اب بھی دھوبی منڈی کہلاتا ہے۔ کمرشل بلڈنگ کے مقام پر پہلے پہل صرف ایک دیوار قائم کر دی گئی تھی۔ بہت عرصہ بعد یہاں کمرشل بلڈنگ تعمیر ہوئی جس میں جنرل سٹور، کیمسٹس، عطر فروش، کلاتھ مرچنٹس اور ٹیرلنگ کی دکانوں کے علاوہ شراب فروشی کی مشہور دکان ایڈلجی وائین سٹور بھی یہیں موجود تھی۔ اس بلڈنگ کے اختتام پر میکلیگن روڈ اور میکلیگن روڈ کے کارنر پر سن لائٹ انشورنس کمپنی کی عالی شان بلڈنگ تھی جس سے ملحقہ ریزرو بینک آف انڈیا کی عمارت تھی جس کے بعد جنرل پوسٹ آفس کی انتہائی خوبصورت بلڈنگ تھی۔ اس عمارت کی تعمیر سے پہلے ڈاک کا نظام پنجاب پبلک لائبریری کے ایک مختصر سے حصہ میں تھا۔ ۱۹۱۲ء میں تعمیر شدہ اس عمارت میں ابتدائی طور پر زیری منزل میں ۳۳ اور دوسری منزل میں ۱۹ کمرے تھے۔ اس عمارت کا کلاک ٹاور اور برجیاں نہایت شاندار ہیں، حال ہی میں قدیم طرز پر جدید انداز میں پھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد میکلوڈ روڈ گزر رہی ہے جس کا چوک مال روڈ کے وسط میں ہے یہاں اس چوک میں سر جان لارنس کا کانسی کا بنا ہوا قد آدم مجسمہ ہوا کرتا تھا۔ اس مجسمہ کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قلم تھی اس کے کتبہ پر لکھا تھا کہ میں نے تلوار کے ساتھ تمہاری حفاظت اور قلم کے ساتھ خدمت کی ہے۔ سر جان لارنس ۶۹۔۱۸۶۴ء تک پنجاب کا پہلا گورنر رہا اس مجسمہ کی نقاب کشائی ۱۸۸۷ء میں گورنر پنجاب سر چارلس ایچی سن نے کی۔ جنرل پوسٹ آفس کے بعد میکلوڈ روڈ عبور کر کے ہائی کورٹ کی انتہائی پروقار عمارت قائم ہے۔ یہ ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوئی۔ اسکا نقشہ ماہر تعمیرات انجینئر بروسنگٹن نے تیار کیا جبکہ اس کی تعمیر کے منتظم مسٹر ہلٹن تھے۔ عربی اور ہسپانوی طرز تعمیر کے اختلاط سے بنی اس عمارت کا مرکزی ہال ۵۵ فٹ طویل اور ۳۵ فٹ

عریض ہے جس کے دونوں اطراف متعدد کمرے ہیں۔ ۹۵ فٹ بلند دو مینار اور ۲۷ فٹ بلند دو برجوں کے مابین میزان عدل کا کتبہ نصب ہے۔ اس کی تعمیر پر ۳ لاکھ اکیاسی ہزار روپے صرف ہوئے۔ ہائی کورٹ کے بعد گنگا رام کی بلڈنگ تھی اس میں لاہور کے سب سے بڑے کیمسٹ جگت سنگھ اینڈ سنز کی دکان ہوا کرتی تھی اور بہت سی شاہراہوں اور عمارتوں کی طرح یہ دکان بھی مشرف بہ اسلام ہو کر فضل دین اینڈ سنز ہو گئی ہے۔ یہیں سنگر کمپنی کی بھی دکان تھی۔ اس کے ساتھ نصف دائرے میں ایک اور پرشکوہ عمارت دیال سنگھ مجیٹھیہ کی دیال سنگھ مینشن تھی اس بلڈنگ میں واسود یو ریڈیوز، پارکو ریڈیوز اور نادرن ریڈیوز کے شوروم تھے۔ اس بلڈنگ سے ذرا آگے طبقہ اشرافیہ کا من پسند ریسٹورنٹ ''سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ'' تھا۔ اس سے ذرا آگے مخملی کرسیوں اور مخملیں پردوں سے آراستہ ریگل سینما تھا اس سینما میں سوٹ اور ٹائی کے بغیر داخلہ نہیں ملتا تھا۔ اس کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی لاہور کا سب سے بڑا اور قیمتی ترین ڈیپارٹمنٹل سٹور کرپارام اینڈ برادرز تھا۔ اب یہ ڈیپارٹمنٹل سٹور بھی مشرف بہ اسلام ہو کر اپچ کریم بخش ہو چکا ہے۔ ویسے بھی کرپارام کے معنی اور کریم بخش کا مفہوم اپنے اپنے عقیدوں میں یکساں ہے۔ اس ڈیپارٹمنٹل سٹور کے۔۔ نذ ڈمپل روڈ اور اس سڑک کو عبور کرنے کے بعد کانڈانوالہ موٹرز، سیٹغلز ہوٹل، نارائن داس موٹرز، الفریڈ اینڈ کمپنی اور جسٹس شاہ دین کی بلڈنگ میں ''لورنگ ریسٹورنٹ'' ہوا کرتا تھا۔ اس بلڈنگ کے سامنے یوکلپٹس کے خوبصورت درختوں کی قطار ہوا کرتی تھی۔ اب تجدید لاہور کے تحت اس عمارت کی بیرونی عظمت رفتہ تو کسی حد تک بحال ہوئی ہے مگر یوکلپٹس قصہ پارینہ ہوئے۔ یہاں سے منٹگمری روڈ عبور کریں تو ۱۹۱۶ء میں تعمیر ہونے والی ''فری میسن بلڈنگ'' ہے۔ یہ یہودیوں کی خفیہ تنظیم کا ایک ایسا کلب تھا جہاں ممبران کے علاوہ کوئی داخل نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ۱۸۷۲ء میں میلا رام کے عطیہ کردہ ۱۳۲ ایکڑ رقبہ اور بہت سے پرندوں کی بلا معاوضہ فراہمی سے چڑیا گھر قائم ہوا جس سے ملحق ۱۸۶۰ء میں ۱۱۲ ایکڑ رقبہ پر اسی ہزار ملکی و غیر ملکی درختوں پر مشتمل قائم کردہ لارنس گارڈن تھا۔ اسی لارنس گارڈن میں ۱۸۶۱ء میں لارنس ہال کی تکمیل ہوئی۔ سر جان لارنس پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ ۱۸۵۹ء میں انہوں نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا مگر علالت کے سبب وہ اسی سال واپس انگلستان چلے گئے جہاں انہیں لارڈ کا خطاب دیا گیا اور تین سال بعد وائسرائے ہند بنا کر بھیجا

گیا۔۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۹ء تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ اس کا ڈیزائن انجینئر سٹون نے بنایا۔ اس کا مرکزی کمرہ ساڑھے تیس فٹ لمبا، ساڑھے بتیس فٹ چوڑا اور تینتیس فٹ اونچا ہے۔ یہ انگریز افسران کے باہمی چندے سے ۳۴ ہزار روپے میں مکمل ہوا۔ اسے سرکاری اجلاسوں، سٹیج ڈراموں اور ڈانس پارٹیوں کے لیے تعمیر کیا گیا اور اس کا تمام فرش چوبی رکھا گیا۔ اس سے ملحق ایک اور منٹگمری ہال ہے۔ یہ لارنس ہال سے بھی زیادہ وسیع و کشادہ ہے یعنی اس کا مرکزی ہال ۱۰۶ فٹ لمبا، ۴۶ فٹ چوڑا اور ۳۸ فٹ بلند ہے۔ اس کا فرش بھی دیودار لکڑی کا ہے۔ اس کا ڈیزائن گرڈوں نے تیار کیا اور ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے کی لاگت سے مکمل ہوا۔ یہ بھی ڈانس پارٹیوں کے لیے بنایا گیا تھا لیکن بعدازاں یہ مطالعہ گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس سے آگے حکمرانوں اور روسائے شہر کی جدید کوٹھیاں تھیں۔

اب ہم مال روڈ کو عبور کر کے واپسی کی راہ اختیار کریں تو اس راہ پر میلوں رقبہ میں پھیلا ہوا ایچی سن کالج ہے جو کہ ۱۸۸۶ء میں قائم ہوا۔ اس سے ذرا آگے لارنس گارڈن کے بالمقابل گورنر ہاؤس ہے۔ عہد شاہجہانی میں ایک تارک الدنیا بزرگ سید بدرالدین گیلانی نے یہاں سکونت اختیار کی اور اسی ویرانے میں ان کی تدفین ہوئی۔ دربار مغلیہ کا میر مہدی قاسم ان کا معتقد تھا۔ ۱۰۷۲ء ہجری میں اس نے آپ کا مزار تعمیر کرایا جس پر مغلیہ طرز کا بڑا گنبد قائم تھا۔ میر مہدی قاسم فن کشتی کا سرپرست تھا اس نے یہاں زور آزمائی کے لیے ایک اکھاڑہ بنوایا جس کی وجہ سے یہ مزار گنبد کشتیاں والا کہلانے لگا۔ رنجیت سنگھ کے دور میں جب جمعدار خوشحال سنگھ نے یہاں فوجی چھاؤنی قائم کی تو قبر مسمار کر کے مقبرہ و مسجد میں بارود بھر دیا اور قریب ہی رہائش کے لیے جدید انگریزی طرز کی ہشت پہلو کوٹھی بنالی۔ سکھ حکومت کے خاتمہ پر ڈپٹی کمشنر میجر میک گریگر نے اس پر قبضہ کر کے اسے پنجاب کے پہلے گورنر چارلس کی رہائش کے لیے منتخب کیا۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں یہ باقاعدہ حکومتی ملکیت میں لے لی گئی اور اسے گورنر ہاؤس قرار دے دیا گیا۔ گول کمرے سمیت یہ بائیس کمروں پر مشتمل شاندار عمارت ہے جس کے ڈائننگ ہال کے زیریں کمرے میں اب بھی مزار موجود ہے۔ وسیع باغ میں ساٹھ فٹ لمبا اور ۳۰ فٹ چوڑا تالاب بنایا گیا جسے اب سوئمنگ پول کہہ سکتے ہیں۔ ۱۸۴۹ء سے تاحال یہ لیفٹیننٹ گورنروں اور بعدازاں گورنر پنجاب کی اقامت گاہ کے لیے استعمال ہو رہا ہے اہم عالمی شخصیات کی بھی

یہیں رہائش اور مہمان نوازی ہوتی ہے۔

گورنر ہاؤس کے بعد موجودہ اواری ہوٹل کے مقام پر برطانوی عہد کا سب سے مہنگا نیڈو ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ واپڈا ہاؤس کی جگہ میال رام کی بلڈنگ میں میٹرو ریسٹورنٹ ہوا کرتا تھا۔ یہ فلمی فنکاروں اور اینگلوانڈین آزاد خیال لوگوں کی جنگ تھی جہاں کینڈل لائٹ میں کیبرے ڈانس (رقص ہفت حجابات) ہوا کرتا تھا۔ تاریخ انسانی میں اول ترین کیبرے ڈانس روم کے شہنشاہ ہیرودیاس کے دربار میں اس عہد کی مشہور رقاصہ سلومی نے کیا تھا اور اس رقص کے عوض اس نے یوحنا بنی کا سر طلب کیا تھا۔ ہیرودیاس اگرچہ یوحنا بنی کا مقلد تھا مگر اسے سلومی کی خواہش زیادہ عزیز تھی چنانچہ اس نے حضرت عیسیٰ کے حواری یوحنا بنی کا سر قلم کرا دیا۔ نیڈو ہوٹل کے بعد اسمبلی ہال کی بلڈنگ ہے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۳۵ء کو وزیر زراعت سر جوگندر سنگھ نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کا کل رقبہ ۱۶۶ کنال ۱۵ مرلہ ہے جس میں سے ۱۴۸ کنال رقبہ سبزہ زار پر مشتمل ہے جبکہ بقایا اراضی میں فن تعمیر کا یہ اعلیٰ ترین شاہکار اپنے بھرپور جاہ وجلال کے ساتھ قائم ہے۔ پہلے پہل اس کی تعمیر کے منتظم انجینئر سالمن تھی اس کی مدت ملازمت کے اختتام پر یہ پراجیکٹ پی۔ ایل ورما کے سپرد ہوا جنہوں نے ۱۹۳۸ء میں اسے مکمل کیا۔ اس عمارت میں زیرزمین تہہ خانہ ہے۔ بالائی منزل میں ایوان نمائندگان میں ۳۰۰ نشستیں ہیں۔ گیلری میں مہمان اور اخبارنویس اسمبلی کی کارروائی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ۶ کمیٹی روم، لائبریری اور کیفے ٹیریا بھی موجود ہیں۔ یہ سولہ لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں اس عمارت کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس کے سامنے موجودہ گراؤنڈ میں چیئرنگ کراس کے مقام پر سنگ مرمر کی خوبصورت ترین چھتری میں ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ نصب تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ملکہ کی موت کے بعد ۱۹۰۲ء میں نصب کیا گیا تھا۔ اب یہ عجائب گھر میں موجود ہے۔ الفلاح بلڈنگ کے مقام پر یوبیروئی سپورٹس، ایف ایچ پٹ مین ٹیلرز اور کیمسٹ کی دکانیں ہوتی تھیں۔ اسمٰعیل ٹیلر کے ساتھ فیروز سنز، وائٹ وے، لیڈ لا، جین اینڈ الرٹن، مائرہ موٹرز K شوشاپ، سول اینڈ ملٹری گزٹ، ایس رولو فوٹوگرافر۔ ۱۹۲۳ء کی تعمیر کردہ باوا ڈنگا سنگھ کی بلڈنگ کے بعد بیڈن روڈ اور ذرا آگے ہال روڈ، کے سی فین، حیات فرنیچر، ادبی دنیا، رینکن اینڈ کمپنی۔ ۱۹۶۲ء میں تعمیر کردہ مشن کیتھڈرل، مغربی دوائیوں کی دکان ای پلومر اینڈ کمپنی، کرپارام آپٹیکل ہاؤس،

کرپارام مشہور ماہر چشم ڈاکٹر دولت رام کے والد تھے اسی میسن نرسنگھ داس بلڈنگ میں ہیر ڈریسر امرناتھ جون کا ہیئر کٹنگ سیلون تھا۔ میکلوڈ روڈ عبور کر کے تارگھر کی بلڈنگ تھی۔ ۱۸۸۰ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور یہ انجینئر کنہیا لعل کی نگرانی میں مارچ ۱۸۸۱ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی لمبائی ۱۲۵ فٹ ۶ انچ اور عرض ۶۸ فٹ ۶ انچ ہے۔ ۱۱۲ ایکڑ رقبہ پر مشتمل اس عمارت میں بڑے ہال کے علاوہ ۱۳ کمرے تھی۔ یہ زمین نیلا گنبد میں حاجی محمد سعید کے مزار کے لیے وقف تھی مگر متولیوں نے گرجا کی تعمیر کے لیے فروخت کردی۔ پہلے یہاں گرجا تعمیر ہوا لیکن جب تارگھر کی ضرورت پوسٹ آفس کے قریب محسوس ہوئی تو چرچ کو عقب میں منتقل کر دیا گیا۔ نیلا گنبد چوک میں جارج پنجم کا مجسمہ نصب تھا۔ یہیں امپیرل بینک۔ لائیڈز بینک۔ وائی ایم سی اے۔ دیوی چند کی دکان جانکی داس اینڈ کمپنی، کافی ہاؤس، کے ایل مہرا کی کپڑے اور ٹیلرنگ کی دکان، یہ لاہور کی اشرافیہ کا پسندیدہ ترین ٹیلر ماسٹر تھا۔ یہیں ایک اور معروف دکان چیپ جان کلاتھ مرچنٹ اور ٹیلرنگ تھی۔ انارکلی کی راہگذر کے بعد پنجاب یونیورسٹی کی وسیع عمارت تھی یہاں سے گول باغ تک کا حصہ ایگزی بیشن روڈ کہلاتا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے باہر اس کے پہلے وائس چانسلر اے سی دوولنر کا مجسمہ تھا۔ اس کے بالمقابل سڑک کے وسط میں سر گنگارام کا مجسمہ تھا۔ اس سے آگے بینڈ سٹینڈ گارڈن یعنی گول باغ (ناصر باغ) اس مال روڈ کا نقطہ اختتام تھا یہاں جدوجہد آزادی کے سرفروش مقرر لالہ لاجپت رائے کا مجسمہ تھا جو ایک جلوس میں پولیس تشدد سے ہلاک ہوئے لکشمی چوک کی لکشمی بلڈنگ اور گلاب دیوی ہسپتال اسی کی یادگار ہیں۔

(بشکریہ: مصنف ''گمشدہ لاہور'' ۲۰۰۷ء)

لاهور......
فن تعمیر و آبادکاری

لاہور: تسلسل اور تبدیلی کے درمیان الجھا ہوا شہر

ڈاکٹر مبارک علی

جب بھی ہم کسی شہر کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں دو پہلو نظر آتے ہیں: ایک تسلسل اور دوسرا تبدیلی کا۔ جب ہم تسلسل کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے شہر کی وہ روایات جو وقت کے ساتھ پروان چڑھ کر مستحکم اور مضبوط ہوئیں۔ اور جن کا اظہار شہر کی عمارتوں، تہواریوں، میلوں اور لوگوں کی عادات، رویوں اور رہن سہن سے ہوتا ہے یہ روایات ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہتی ہیں اور وقت کے اتار چڑھاؤ کے باوجود اپنے تسلسل کو برقرار رکھتی ہیں۔ اس لیے شہر لاہور کے رہنے والوں کے لیے جب ''زندہ دلان لاہور'' یا ''لاہوریے'' کا استعمال کیا جاتا ہے تو وہ اس شہر کی روایات اور ان کے تسلسل کی غمازی کرتا ہے۔ اس سے شہر کی شناخت ہوتی ہے۔ شہر جس قدر تاریخی طور پر قدیم ہوتا ہے۔ اسی قدر اس شہر کے باشندوں کی تاریخی جڑیں گہری ہوتی ہیں۔ کیونکہ شہر کی روایات کی تشکیل میں ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے، جب یہ پختگی کو پہنچتی ہیں تو یہ شہر کی روح کو پیدا کرتی ہیں، شہر انہیں کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔

لیکن وقت کے تقاضے یہ بھی چاہتے ہیں کہ تبدیلی آئے اور ضروریات کے تحت شہر کو بدلا جائے۔ نئی عمارتیں ہوں، ان عمارتوں کی ساخت کے ساتھ ساتھ لوگوں کا طرز رہن سہن بھی بدلے، اور جدیدیت نئے رجحانات اور رویوں کو روشناس کرائے۔ اس لیے ہر شہر تسلسل اور تبدیلی کے درمیان کش مکش میں رہتا ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ تسلسل کی روایات کو ختم کر کے شہر کو

جدیدیت میں ڈھال دیا جائے؟ یا شہر کی تاریخی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے جدیدیت کو روشناس کرایا جائے تاکہ شہر کی شناخت مجروح نہ ہو۔ آج کے اس مضمون میں ہم شہر لاہور کو تسلسل اور جدیدیت کے پس منظر میں دیکھیں گے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو شہر لاہور اس وقت گمنامی سے نکلا کہ جب یہاں گیارہویں صدی میں غزنویوں کی حکومت قائم ہوئی۔ شہر میں قلعہ، مسجدیں، حویلیاں، بازار، خانقاہیں ومقبروں کی تعمیر نے اس شہر کو دنیا کے نقشہ پر ابھارا۔ وسط ایشیا و ایران سے آنے والے مہاجرین نے اس شہر کے کلچر میں اضافہ کیا، وقت کے ساتھ ساتھ شہر کی روایات پختہ ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ مغل دور میں اس شہر کی شناخت قائم ہوگئی۔ فصیلوں سے گھرا ہوا یہ شہر مسجدوں، مندروں، گردواروں، حویلیوں، بازاروں، گلیوں، باغوں اور مقبروں کا شہر بن گیا کہ جس میں قلعہ سیاسی طاقت کی علامت تھا اور اس کی مسجدیں مذہبی تسلط کو ظاہر کرتی تھیں۔

اس شہر میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب انگریزوں نے پنجاب کی فتح کے بعد ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی۔ یہ کولونیل لاہور تا، جو اپنے کردار اور خصوصیت کے لحاظ سے قدیم شہر سے مختلف تھا۔ اس کے گرد حفاظت کے لیے کوئی فصیلیں نہیں تھیں جو حکومت کے استحکام اور مضبوطی کو ظاہر کرتی تھی اسے اب کی اندرونی اور بیرونی حملوں کا خطرہ نہیں تھا۔ اس کی عمارتوں میں مشرقی اور مغربی طرز تعمیر کا ملاپ تھا، یہ ملاپ تسلسل اور تبدیلی کا تھا، یہ ایک پیغام تھا کہ برطانوی حکومت ایک تسلسیل کا حصہ ہے، قدیم روایات کی وارث ہے، مگر ساتھ ہی میں وہ جدیدیت کی علامت بھی ہے۔

اس شہر کی تعمیر میں اہل برطانیہ کا وہ تجربہ بھی شامل تھا کہ جو نئے شہروں کے سلسلہ میں یورپ میں استعمال ہوتا تھا۔ خاص طور سے ۱۸۴۸ء کے انقلاب یورپ نے انہیں یہ سمجھایا تھا کہ شہر کی شاہراہیں چوڑی اور سیدھی ہوں تاکہ اگر لوگ بغاوت کریں یا ہنگامہ بپا کریں تو انہیں فوج اور پولیس کے ذریعہ قابو میں لایا جاسکے۔ اس سے پہلے شہر کی تنگ گلیوں میں فوج کو لوگوں کی بغاوت کچلنے میں دشواری ہوتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے انگریزوں کو یہی سبق ہندوستان میں دیا۔ اس نے لاہور شہر میں انہوں نے شاہراہوں کو کشادہ اور سیدھا رکھا۔ ریلوے اسٹیشن کی عمارت کو بطور قلعہ تعمیر کرایا تاکہ کسی ہنگامہ کی صورت میں یہاں پناہ

لی جا سکے۔

پرانے اور نئے شہروں میں جو ایک فرق تھا وہ یہ کہ قدیم شہر میں سیاسی طاقت کی علامت قلعہ تھا اور مسجدیں مذہبی تسلط کا اظہار تھیں۔ نئے شہر میں انتظامیہ کی عمارتیں جن میں عدلیہ پوسٹ آفس، تعلیمی ادارے، میوزیم اور گرجا گھر شامل تھے۔ یہ گرجا انتظامیہ کی مذہبی وابستگی کو ظاہر کرتے تھے۔ پرانا اور نیا شہر دونوں تسلسل اور تبدیلی کی علامت بن کر ابھرے۔ لیکن یہ ایک دوسرے سے متضاد نہیں تھے، ان میں اشتراک کا پہلو تھا۔ اسی اشتراک نے شہر میں کاسمو پولٹن فضا کو پیدا کیا۔

کولونیل شہر میں سڑکوں، شاہراہوں اور عمارتوں کے نام ان شخصیتوں پر رکھے گئے کہ جنہوں نے یا تو برطانوی حکومت کے استحکام میں حصہ لیا تھا یا شہر کی ترقی میں کام کیا تھا۔ ان میں سے بعض اشخاص کے مجسمے شہر کی شاہراہوں پر ایستادہ کیے گئے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جس طرح سے تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل کی گئی۔ اسی طرح سے شہر لاہور کی تاریخ کو بھی بدلنے کی کوششیں ہوئیں۔ جن بنیادوں پر اس شہر کی تشکیل نو ہوئی۔ اسے ہم ''انٹی ہسٹری'' کا عمل کہہ سکتے ہیں، یعنی اس شہر کی قدیم تاریخ کو مٹا کر ایک نئی تاریخ بنائی جائے جس کی بنیاد مذہب اور نظریہ پر ہو۔ پاکستان میں انٹی ہسٹری کے رجحان کے بارے میں جب بات کی جاتی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ پاکستان کی تخلیق تاریخ کے دھارے کے خلاف ہوئی تھی؟ اسی وجہ سے اس کی تخلیق کے بعد شدت سے تاریخ کے خلاف جذبات ابھرے کہ تقسیم سے پہلے کی تاریخ کو مٹا دیا جائے اور ایک نئی تاریخ ترتیب دی جائے جو تاریخی تسلسل کو توڑ کر اس کی نئے سرے سے ابتدا کرے۔

تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجہ میں لاہور شہر سے ہندو اور سکھ چلے گئے۔ ان کی جگہ آنے والے مسلمان مہاجرین تھے۔ اس نے شہر کی بنیادی کرکٹر کو بدل دیا۔ اور اب یہ شہر مذہبی طور پر مسلمانوں کا شہر ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہر سے ہندو علامتوں اور نشانوں کو مٹا دیا جائے لہٰذا ہندو محلوں، عمارتوں اور سڑکوں کے نام بدل دیئے گئے۔ اس کی ایک مثال کرشن نگر سے دی جا سکتی ہے کہ جو نئے قالب میں ''اسلام پورہ'' ہو گیا۔ اس کی سڑکوں کے

جو نام تقسیم سے پہلے تھے، اب ان کی جگہ اسلامی نام آ گئے جیسے گردو یو بہادر، یدھشتر، ارجن اور سری رام روڈوں کے نام بالترتیب عالم گیر، عمرؓ، حیدرؓ اور ابوبکرؓ رکھ دیئے گئے۔ اشوک اسٹریٹ کو حسین اسٹریٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ سنت نگر کو تبدیل کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تشدید کے اضافے سے یہ سنّت نگر ہو گیا۔

اسی کے ساتھ دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ سڑکوں اور عمارتوں کے نام جو انگریزوں سے منسوب ہیں، انہیں بدلا جائے۔ کیا یہ قدم انٹی کولونیل تھا؟ میرا خیال ہے کہ نہیں اس کے پس منظر میں بھی یہی انٹی ہسٹری کا جذبہ تھا کہ ماضی سے تعلق توڑ کر شہر کی مذہبی شناخت کو ابھارا جائے اور تقسیم سے پہلے جو کاسموپولٹن ماحول تھا اسے تبدیل کیا جائے۔ چنانچہ ایبٹ روڈ، محمود غزنوی، ڈیوس روڈ، سر آغا خاں، جیل روڈ، غوث الاعظم، کوئنز روڈ، شاہراہ فاطمہ، دی مال، شاہراہ قائداعظم اور لارنس گارڈن باغ جناح اور منٹو پارک اقبال پارک ہو گئے۔

اگر آپ غور کریں تو ان ناموں میں آپ کو کنفیوژن نظر آئے گا اور نام رکھنے والوں میں تاریخی شعور کی کمی بھی نظر آئے گی۔ ان میں بے ترتیبی ہے، اسلامی عہد کے نام بھی ہیں، مسلمان حکمراں بھی ہیں، تو مسلم لیگ کے راہنما بھی۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ناموں کے ذریعہ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ کیا اہل لاہور اسلام کے ابتدائی عہد سے رشتہ جوڑیں یا ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں سے اور یا تحریک پاکستان سے؟

ان ناموں کے ذریعہ ہماری تاریخی مفلسی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اقبال اور جناح کے نام پر درجنوں اسکولوں، کالجوں، سڑکوں، اسپتالوں، پلوں اور کتب خانوں کے نام ہیں۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ ان دو کے علاوہ شاید ہمارے ہاں اور کوئی راہنما پیدا ہی نہیں ہوئے۔

شہر کو نظریاتی بنانے کی ایک کوشش یہ بھی ہوئی کہ شہر سے انگریزی عہد کے مجسّموں کو ہٹا دیا گیا۔ ان کی خالی جگہوں کو پُر نہیں کیا گیا۔ سوائے ملکہ وکٹوریہ کے مجسّمے کی جگہ کے کہ جہاں قرآن شریف رکھ دیا گیا ہے۔

شہر کی خوبصورت کا نیا خیال جو انتظامیہ کے ذہن کی پیداوار ہے۔ وہ یہ کہ اب جگہ جگہ چوراہوں پر ٹینک، ہوائی جہاز اور توپیں نصب کر دی ہیں اور ایٹم بم کے دھماکہ کے بعد چاغی کی پہاڑی کو بھی بطور خوبصورتی کے شہر میں بنایا گیا ہے۔ اس نے شہر کو اسلامی کے ساتھ فوجی بھی بنا

دیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سرکاری اور انتظامیہ کی ان تمام کوششوں کے باوجود شہر کے لوگوں نے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھا ہے۔ وہ شہر کی شاہراہوں، گلیوں اور عمارتوں کو اب بھی پرانے ناموں سے ہی یاد کرتے ہیں۔ سرکاری اور عوامی رجحانات کا یہ تصادم جاری ہے۔ لوگ تاریخی کو مٹانے پر آمادہ نظر نہیں آتے ہیں۔

کولونیل عہد کے ناموں کی تبدیلی کوئی انگریزی عہد سے نفرت کی بنا پر نہیں تھی، اس کی شہادت ہمیں ان رجحانات سے ملتی ہے کہ جو شہر میں بڑی تعداد میں اسکولوں کے نام ہیں۔ اب آپ کو ہر سڑک اور گلی میں آکسفورڈ، کیمبرج، بوسٹن، پرنسٹن اور ایسے ہی نام نظر آئیں گے جو لوگوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان ناموں میں بڑا اثر ہے اور ان ناموں کے اسکولوں میں پڑھنے والے ایسے ہی عالم فاضل بن کر نکلیں گے جیسے یورپ و امریکہ میں ان تعلیمی اداروں سے نکلتے ہیں۔

ایک رجحان یہ بھی ہے کہ جو سیاستدان برسراقتدار آجاتے ہیں وہ اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے سڑکوں، چوراہوں اور عمارتوں کے نام اپنے آپ پر یا اپنے آباؤاجداد کے نام پر رکھ دیتے ہیں تاکہ تاریخ میں اسی بہانے سے زندہ رہیں۔

شہر لاہور میں کینٹ کا علاقہ خالص فوجی ہے یہاں سڑکوں کے نام فوجی جنرلوں اور عہدے داروں کے نام پر ہیں۔ یہاں فوجی اور سویلین کے درمیان فرق کو ہر سطح پر برقرار رکھا جاتا ہے۔ مثلاً پارکوں، کلبوں اور اسکولوں میں سویلین لوگوں کے خاص خاص امتیاز کیا جاتا ہے۔

لاہور شہر کو جو مذہبی، نظریاتی اور فوجی بنانے کا عمل ہوا ہے اس کے اثرات ہم شہر کے لوگوں پر دیکھتے ہیں۔ مذہبی فرقہ واریت میں شدت آگئی ہے، ہر فرقہ کے لوگوں نے علیحدہ علیحدہ اپنی مسجدیں اور مدارس بنا لیے ہیں، جہاں مذہبی تنازعے پرورش پاتے ہیں۔ تشدد کی علامتوں نے لوگوں میں بھی دہشت گردی کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔ شہر کا ماحول اب کاسموپولٹن نہیں رہا۔ بلکہ اس کی جگہ گھٹا ہوا، تنگ نظری کا ماحول ہے کہ جس میں رواداری کا فقدان ہے۔ جب شہر اس طرح سے تبدیلی ہو جائے تو اس کی روح بھی مر جاتی ہے۔ یہاں اس صورت میں نہ تو علمی، ادبی اور فنی تخلیقات ہوتی ہیں اور نہ ہی اعلیٰ کلچر پروان چڑھتا ہے۔

لاہور چھاؤنی کا قیام اور شہر پر اس کے اثرات

پرویز وندل

پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۳۹ء میں وفات پائی۔ اور صرف دس سال کے اندر ان کے ورثاء نے پنجاب کی عظیم بادشاہی انگریزوں کو ہار دی۔ قدیم دور سے ہندوستانی حکمران کی موت یا کمزوری تخت نشینی کی خونخوار جدوجہد کا پیش خیمہ ہوتی جو ریاست کو کمزور کر دیتی اور اسے کسی دوررس سلامتی سے محروم کر دیتی۔

پرامن انتقال اقتدار کا کوئی پختہ سیاسی نظام وضع کرنے میں ہندوستانی حکمرانوں کی نااہلی نے باہر والوں کو اجازت دی کہ وہ فائدہ اٹھائیں اور یوں پیدا ہونے والے اقتداری خلاء میں درآئیں۔ انگریزوں نے تو اسی تغیر پذیر حالات کو استعمال کرنے کے فن میں خاص مہارت حاصل کی ہوئی تھی۔ دھوکے اور دغابازی کے ذریعہ اقتدار کے ایک دعویدار کو دوسرے سے نبرد آزما کراتے جس کا نتیجہ سیاسی ڈھانچے کا انہدام ہوتا۔ نرادسی چوہدری کے مطابق یہی بنیادی وجہ تھی جس کی بنا پر فرانسیسیوں اور ان کے پس رو برطانیوں کی رینگتی ہوئی فتوحات کو ہندوستان روک نہیں سکا۔

سکھ فوج (خالصہ) جوانمردی سے مُدکی، سوبراں، فیروز شاہ (۱۸۴۶ء) اور چیلیانوالہ، گجرات (۱۸۴۹ء) میں انگریزوں کے خلاف لڑی۔ جیسا کہ خشونت سنگھ نے بالتفصیل وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انگریز شکست سے بال بال بچے۔ بہرحال خالصہ شکست کھا گیا۔ برطانوی اور ڈوگرا برادران جنہیں اس سودے میں کشمیر مل گیا، جیت گئے۔ پنجاب ہندوستانی مقبوضات میں ضم کر لیا گیا اور برطانوی فوجی لاہور میں داخل ہو گئے برطانویوں نے اپنے فوجی

لاہور قلعے میں، اوران بیرکوں میں جنہیں برخاست شدہ خالصہ خالی کر گئے تھے ٹھہرائے۔ یہ بیرکیں اس وقت آج کی لوئر مال سے ٹولنٹن مارکیٹ اور سیکرٹریٹ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۲ء تک اس علاقے کو ''انارکلی سٹیشن'' کہا جاتا تھا۔ جبکہ آج کے نئے انارکلی بازار کو ''صدر'' کہا جاتا تھا۔ دیگر برطانوی فوجی ٹیکسالی گیٹ کے پار سے لے کر داتا صاحب کے مزار تک ٹھہرائے گئے تھے۔ ان فوجیوں کی تفریح کے لیے داتا صاحب کے مزار کے قریب ایک باغ بھی بنایا گیا تھا۔ ایک پرانا عیسائی قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔

اس مضمون میں ہم لاہور شہر کے طبعی خدوخال پر برطانوی اثرات کے عمل کا مختصر خاکہ پیش کریں گے۔ شروع کے مراحل میں تو جو طبعی انفراسٹرکچر موجود تھا اسے استعمال کیا۔ سکھ سپاہیوں کی خالی بیرکیں، مقبرے، بارہ دریاں، مساجد اور دیگر قدیم عمارات، بعض اوقات تو غیر موزوں طور پر استعمال کی گئیں۔

قاسم خان کے مقبرے کو چیئرمین بورڈ آف ایڈمنسٹریشن بعدازاں صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر اور پھر گورنر کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک مسجد کو ریلوے دفتر کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بعد میں وہاں پرنٹنگ پریس قائم کیا گیا۔ اور پہلا انگریزی جریدہ ''دی لاہور کرونیکل'' وہاں سے شائع کیا گیا۔ شاہ چراغ کے مقبرہ کو دفتر میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن ایک دفعہ جب برطانوی جم گئے اور انہوں نے اپنی حکومت مستحکم کر لی جو انہوں نے تین چار سال کی قابل ستائش قلیل مدت میں کی تو پھر انہوں نے اپنا انفراسٹرکچر تعمیر کرنا شروع کیا۔

پنجاب کی فتح سے پہلے برطانیہ کو ہندوستان کے معاملات کا ۲۰۰ سالہ تجربہ تھا۔ مدراس شہر کی بنیاد ایک چھوٹے سے تجارتی اسٹیشن جو کہ کورومینڈل ساحل پر واقع تھا۔ ۱۶۹۳ء میں رکھی گئی تھی۔ لیکن انیسویں صدی تک ساحل پر، پہلے تذبذب والے دور کے قلعہ نما قصبے اب برتری، اعتماد اور طاقت کے نئے اظہار کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے پہلے دور میں انگریزوں نے فوجی مبارزات کی حکمت عملی جس کی بنیاد فوجی جتھوں کی پرہجوم مقابلہ بازی کے برعکس متحرک اور مرتکز فائر پاور پر تھی، وضع کر لی تھی۔ انہوں نے شہروں کے قریب فوجی ٹھہرانے کا ایک نقشہ بھی بنا لیا تھا۔ قلعوں سے مختلف جو کہ شہروں کے اندر واقع

ہوئے تھے۔ یہ اسٹیشن شہر سے چار یا سات میل کے فاصلہ پر قائم کیے جاتے تھے۔ قلعے تعمیر کرنے اور انہیں دفاعی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی بجائے انہوں نے متحرک جنگ کی حکمت عملی (موبائیل وار فیر) جس کے تحت تیزی سے حرکت کرتے ہوئے فوجی جتھے ہلاکت آفرین فائر پاور کے ساتھ دشمن پر جب چاہیں حملہ کر سکتے ہیں۔ اختیار کر لی تھی۔ ایسے دشمن کے خلاف جو پیادہ فوج کے ہجوم کی تعداد پر انحصار کرتا تھا۔ ایک برتر فائر پاور والی چھوٹی طاقت کے لیے یہ منطقی حکمت عملی تھی۔

انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ آخر کار ان کی اصل دشمن مقامی آبادی ہے لہٰذا ان کی حکمت عملی تھی کہ ہندوستانی شہروں کو بے ہتھیار اور ناقابل دفاع رکھا جائے اور برطانوی فوجیوں کو مقامی آبادی سے دور چھاؤنیوں میں ہر وقت مستعد رکھا جائے۔ مقامی لوگوں سے فاصلہ صرف طبعی ہی نہ تھا، اسے ارادتاً سماجی اور سیاسی دائرہ تک بڑھایا جاتا تھا۔ تمام میل ملاپ کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ فوج میں ایک نظام اقتدار کہ وہ ایسی ذات ہیں جو سویلین لوگوں سے برتر ہے رائج کیا جاتا تھا۔ مقامی لوگوں اور ہر مقامی چیز کو حقارت سے دیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ شہر اور چھاؤنی کے درمیان طبعی رکاوٹ مثلاً نہر، ریلوے لائن یا مقامی فوجیوں کی بیرکیں بنائی جاتی تاکہ برطانوی علاقوں اور مقامی آبادی کو علیحدہ رکھتے۔ یہ ان کے لیے مقام فوقیت بھی ہوتا جس سے وہ چھاؤنی کی طرف حرکت کی نگرانی کر سکتے۔

برطانوی فوج ایک قابض فوج تھی وہ مقامی بغاوت کے خوف میں ہمہ وقت مبتلا رہتی اسے مقامی آبادی کی نہیں بلکہ برطانوی مفادات کی حفاظت کرنا تھی اور جہاں تک مقامی اشرافیہ کے مفادات، برطانوی مفادات سے ہم آہنگ ہوتے اس حد تک ان کی حفاظت بھی کرتی۔ مقامی لوگوں کے اخلاقی بگاڑ پیدا کرنے والے اثرات کا انہیں بہت خوف تھا۔ مقامی سپاہیوں اور افسروں کی بھرتی صرف وفادار خاندانوں تک محدود رکھی جاتی اور پھر رفتہ رفتہ پورے کے پورے علاقے بھرتی کے لیے مارشل نسل کے لیبل تلے بھرتی کے لیے مختص کر دیئے گئے۔ ایسے ''عنایت یافتہ'' علاقوں کے عام لوگوں کو اس خاص سلوک کی قیمت چکانی پڑتی۔ انہیں جان بوجھ کر پس ماندہ رکھا جاتا۔ تاکہ علاقہ میں روزگار کا صرف ایک ہی ذریعہ رہے اور وہ تھا فوج میں بھرتی ہونا جو نتیجتاً وفاداری کی ضمانت ہوتا۔

لاہور شہر کو غیر مسلح کرنا

سوائے قلعے کے جو برطانوی فوجیوں کے قبضہ میں تھا، شہر کے تمام دیگر دفاعی نظام یعنی فصیل اور خندق مکمل طور پر منہدم کر دیئے گئے۔ اس عمل میں بہت سے گھر جو بیرونی دیوار کے قریب بنائے گئے تھے وہ بھی متاثر ہوئے۔ کسی حد تک متاثرین کے نقصان کی تلافی کی گئی لیکن انہدام مکمل تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ انہیں شہر میں موجود سرکاری ملکیت والی زمین سے قطعہ منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس سلسلہ میں دی جانے والی کل رقم مبلغ -/۲۷۹۰ روپے تھی۔ جو اس دور میں کوئی چھوٹی رقم نہ تھی۔ کچھ گھر ایسے بھی تھے جن کی چھتیں فصیل شہر پر ٹکی ہوئی تھیں، انہیں بھی گرا دیا گیا۔ فوج کو قلعہ حضوری باغ، مسجد چوک اور اس تھوڑی سی کھلی جگہ پر جو شہر کی طرف ہے محدود کر دیا گیا تھا۔

شہر کے باہر والی خندق کو بھر دیا گیا اور ایک گول باغ بنا دیا گیا۔ خاص برطانوی انداز میں باغ لگانے اور اسے برقرار رکھنے کے اخراجات میونسپلٹی کے ممبروں پر ڈال دیئے گئے۔ ایک ایسا نقشہ موجود ہے جو عمومی طور پر خندق کے ایک دروازہ سے دوسرے دروازہ تک کی تقسیم دکھاتا ہے۔ اس میں سے ہر حصہ کسی نمایاں شہری کے نام ہے۔ اس شہر کا فرض تھا کہ وہ باغ لگائے اور اس کی نگہداشت کرے۔ ان شہروں میں سے زیادہ نمایاں فقیر شمس الدین، غلام محبوب سبحانی، لالہ رتن چند، ڈاکٹر اجودا ناتھ ہیں۔ تین دروازے، لاہوری، شاہ عالمی اور دہلی گرائے اور پھر سے بنائے گئے۔ ضرورت پڑنے پر توپوں کے استعمال کے لیے چوڑا کیا گیا۔

چھاؤنی کا قیام

لاہور چھاؤنی کی تعمیر پہلا بڑا تعمیری منصوبہ تھا۔ جو برطانیوں نے ۱۸۵۲ء میں لاہور میں شروع کیا۔ سنگ مرمر کی ایک تختی جس پر کندہ ہے ''اس تختی کو گاڑا گیا تاکہ اس جگہ کی نشاندہی ہو سکے جہاں لارڈ ہیپئر نے میاں میر چھاؤنی کا سنگ بنیاد رکھا اس تختی کو اس جگہ پر رکھا گیا جو چھاؤنی کے مرکزی نقطے کا نشان ہو۔ آج کل یہ تختی سینٹ میری Magdalene چرچ کے بالمقابل ایک چھوٹے سے سبز قطعے میں نصب ہے۔ شروع میں یہ ساتھ والے چوک کے مرکز

میں نصب تھی۔

۳۵ مربع کلومیٹر سے زیادہ جگہ لی گئی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس پر ضروری عمارات تعمیر کی گئیں شہر سے اس کا مقابلہ دلچسپ ہے۔ دیوار کے اندر والا شہر بھی قلعے کے ۲.۵ مربع کلومیٹر رقبے پر تعمیر ہے۔ اس وقت کے دیواری شہر کی آبادی کا تخمینہ ۱۷۵۰۰۰ سے ۲۰۰۰۰۰ تک لگایا جاتا ہے۔ چھاؤنی بمع صدر میں مقیم خدام کے صرف ۲۰۰۰۰ تھی۔

جگہ کا گھیراؤ، اس کا قیام، بلندی اور پھیلاؤ قابضین کے مرتبے، اتھارٹی اور طاقت کی بڑی لسانی علامت ہے۔

چھاؤنی کے خدوخال

چھاؤنی کے اندر عمارات منتشر اور بڑے بڑے گروپوں میں بہت زیادہ پھیلاؤ والا شہری انداز رکھتی تھیں۔ لاہور میں برطانوی چھاؤنی، ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح اپنی روح میں ایک کیمپ تھی جن میں کینوس کے خیموں کو اینٹوں اور گارے کی مستقل عمارات سے بدل دیا گیا ہو۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے دفاعی حکمت عملی دوہری تھی۔ اول یہ یقینی بنانا کہ مقامی آبادی کوئی مزاحمت نہ کر سکے اس لیے پرانے شہر کا دفاعی نظام تباہ کر دیا گیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ برطانوی فوجیں کسی بھی باغی عنصر کے لیے کوئی آسان نشانہ نہ فراہم کریں۔ چھاؤنی کے پھیلاؤ میں حکمت عملی کا دوسرا حصہ کارفرما تھا۔

پاکستان بلکہ تمام ہندوستان کے شہری باشندوں کے لیے چھاؤنی کا لفظ ان کے ذہنوں میں صاف، چوڑی، اور درختوں کے قطاروں والی سڑکوں جو ان کے محلوں کی خستہ حال تنگ گلیوں سے بدرجہا مختلف ہیں، کا تصور ابھارتا ہے۔ آج کے بزرگ شہریوں کو بھی یاد ہوگا کہ آزادی سے بیشتر چھاؤنی ایک ایسا علاقہ ہوتا تھا جس میں آپ بغیر سوچے سمجھے نہیں جاتے تھے۔ گو واضح طور پر ممانعت نہ تھی لیکن یقیناً اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ یہ مسلح افواج کا علاقہ تھا۔ جس میں کچھ سویلین خدام بھی ہوتے تھے۔ لاہور کے تعمیر شدہ تاروپود میں چھاؤنی برطانیوں کی طرف سے پہلی بڑی مداخلت تھی۔ جس نے قصبے کے ترتیبی پھیلاؤ کے تصورات، سڑکوں کے انداز، عمارات کے نقشوں، رہائشی فن تعمیر، اور شہری اشرافیہ کے طرز رہائش کو ہمیشہ

کے لیے تبدیل کر دیا۔اس نے پرانے کو نئے کے ساتھ رکھ دیا اور نئے حکمرانوں کی طرز رہائش، ان کی زمین اور کشادگی پر حاکمیت کے ذریعہ ان کی برتری کا واضح پیغام دیا۔محکوم رہن سہن میں حاکم کی نقل کرتے ہیں اور ہمارے ہاں اشرافیہ کی اپنی سماجی جڑیں کمزور رہی ہیں اس لیے یہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز بنتے گئے۔

چھاؤنی کا شہری انداز

لاہور میں چھاؤنی شمال، جنوب، خط مرتب کے ساتھ لکیری گئی۔مشرق،مغرب سڑکیں، مغرب میں سول اسٹیشن، نارکلی سے منسلک تھیں۔جبکہ بنیادی شمال جنوب لائن شمال کی طرف جاتی اور شالیمار باغ کے قریب امرتسر کو جاتی ہوئی جرنیلی سڑک سے ملتی اور جنوب کی طرف قصور جانے والی سڑک سے ملتی، یوں شہر کو کامیابی سے بائی پاس کرتی ہوئی نکلتی۔فوجیوں کی نقل وحرکت کے موقع پر وہ شہر میں سے گزرے بغیر مشقیں کر سکتے تھے۔چھاؤنی کے مرکز کا نشان ایک چرچ بنایا گیا۔جس کے ساتھ ہی ایک سروسز کلب تھا۔یہ چرچ آف انگلینڈ تھا۔یہ بڑی سڑک پر سنہری مرکزی نقطہ تھا اور میلوں دور سے دکھائی دیتا تھا۔رومن کیتھولک چرچ کو نسبتاً کم نمایاں جگہ دی گئی تھی۔مقامی لوگوں کے لیے کوئی عبادت گاہ فراہم نہیں کی گئی تھی۔

اول ترین عمارات میں سے ایک ۱۸۵۴ء میں بننے والی کمبائین ملٹری ہاسپٹل (CMH) تھا۔اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کیونکہ یہ فوج کی تمام شاخوں کو خدمت باہم پہنچاتی اور یہ شہر کے قریب چھاؤنی کی مغربی حد کے قریب بنائی گئی تھی۔سپاہیوں کی بیرکیں، رہائشی علاقے جنہیں لائینز کہتے ہیں اور رجمنٹوں کے دفاتر، فوجی نظم و انصرام کے مطابق تقسیم کیے ہوتے تھے۔سپاہیوں اور افسروں کے لیے مختصر رہائشی علاقوں کے درمیان اور برطانوی و مقامی فوجیوں کے درمیان سخت علیحدگی رکھی جاتی تھی۔فوجیوں کی رہائش گاہ مخصوص بیرکوں پر مشتمل ہوتیں۔یہ لمبے کمروں کے تسلسل پر مشتمل ہوتیں۔جن میں لمبی اطراف میں کھڑکیاں ہوتیں اور لمبی اطراف کے ایک یا دونوں طرف برآمدے ہوتے۔استعمال کی اشیاء جیسے پانی کی فراہمی، پانی کا کنواں یا ہاتھ والے نلکے اور پاخانے اجتماعی ہوتے۔اور خواب گاہوں سے دور رکھے جاتے۔دیواریں پختہ اینٹوں کی ہوتی تھیں جن کی چنائی مٹی گارے سے کی جاتی اور دیواروں کو

چونے کا پلستر کیا جاتا تھا۔لیکن مقامی بیرکیں مٹی کے پلاسٹر اور چونے کے کوٹ والی ہوتیں۔ چھت لکڑی کے بالوں،تکونی ڈھانچوں،جنہیں نالی دار لوہے کی چادروں سے ڈھانپا جاتا تھا پر مشتمل ہوتیں۔دروازے اور کھڑکیاں لکڑی کے ہوتے اور فرش بندی اینٹوں یا گاڑھے گارے سے کی جاتی۔افسروں کے گھروں کے نقشے ملٹری انجینئرنگ سروسز ہینڈ بک میں دیئے گئے معیار کے بنگلے ہوتے۔جن میں کمزوروں کو اکٹھا رکھا جاتا جن کے گرد گہرا برآمدہ ہوتا۔اور یہ بنگلہ قطعہ زمین پر علیحدہ اور اکیلا ہوتا۔باورچی خانے علیحدہ لیکن گھر کے ساتھ چھت والی گزرگاہ سے ملے ہوتے۔نوکروں کی رہائش گاہیں قطعہ زمین کے پچھلی طرف بنائی جاتیں اور یوں مختلف حصوں پر مشتمل یہ عمارت مکمل ہو جاتی۔غسل خانے کچھ کمروں کے ساتھ منسلک ہوتے جس میں پانی دستی نلکوں یا اسی قطعہ زمین پر کھودے گئے کنوؤں سے فراہم کیا جاتا تھا۔

بہشتی غسل اور دیگر ضروریات کے لیے پانی کی فراہمی کو یقینی بناتا۔گھر کے استعمال شدہ گندے پانی کی نکاسی کے لیے گھر کے پچھواڑے ایک غرقی بنائی جاتی تھی۔اصطبل،دھوبی گھاٹ،گاڑی کا گودام وغیرہ بھی عمارت کی پچھلی طرف ہی بنائے جاتے۔جب دو یا زیادہ گھر ایک دوسرے کے پچھواڑے ہوتے تو ایک چھوٹا سا مقامی گاؤں وجود میں آجاتا۔

چھاؤنی کے شمالی سرے پر فوج کے مقامی امدادی عملے کے گھروں دکانوں اور روزمرہ کی ضرورت کی اشیاء جیسے گوشت،سبزی،پولٹری،پھل،گاڑیوں کی چھوٹی موٹی مرمت بعد از اں فرنیچر اور موٹر کاروں کی مرمت کے لیے ورکشاپوں کے لیے کچھ علاقے مختص کیے گئے۔اس علاقے میں نوکر خریداری کرتے،اور مقامی لوگ دکانیں چلاتے۔یہ علاقہ جسے ''صدر بازار'' کہتے،ہندوستان کی تمام چھاؤنیوں کا سانجھا فیچر تھا۔اس علاقے کے لوگ برطانوی فوج کو زندگی کے لیے ضروری خدمات باہم پہنچاتے۔اور سماجی معنوں میں اپنے آپ کو حاکموں کے قریب تر محسوس کرتے۔یہ علاقے چھاؤنی کی انتظامیہ کے تحت ہوتا اور اس کے حفظان صحت کا بندوبست فوج کے دیئے گئے معیار کے مطابق کرنا ہوتا۔بنگلوں کے برعکس یہاں گھر ننگی اینٹوں سے مقامی سٹائل سے بنائے جاتے۔''صدر دروازہ''اور''بیٹھک کا دروازہ'' گلی میں کھلتے جبکہ دوسرے کمرے صحن میں۔گلیاں جن کی اطراف میں نالیاں بہہ رہی ہوتیں سیدھی اور چوڑی ہوتی تھیں۔لاہور کی گلیوں سے بالکل الٹ دیواری شہر کے طریقہ دکانداری کی طرح دکانیں

چھوٹی ہوتیں، یعنی گاہک گلی میں کھڑا ہوتا اور دکاندار سے جو لینا ہوتا پوچھتا تھا اور دکاندار گاہک کو وہ چیز فراہم کرتا، صرف استثناء کپڑے، جوتوں اور حکیموں کی دکانوں کو ہوتا۔ یہ حصہ صدر دراصل چھاؤنی کے لیے مقامی بازار ہوتا تھا۔ جگہ کا تفاعل اور دکاندار گاہک کے درمیان رشتہ چھاؤنی کے مرکز میں اس خریداری سے بالکل مختلف تھا۔ جو افسروں کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اعلیٰ قسم کی کشادہ صاف ستھری دکانیں جن کے شوکیس میں قرینے سے سجی ہوئی اشیائے فروخت ہوتیں۔ خاص طور سے افسروں کے لیے چھاؤنی کے مرکز میں بنائی گئی تھیں۔ اس محفوظ مرکز خریداری میں صاحبان یا نیم صاحبان اشیاء بلاواسطہ خریدتیں اگرچہ مقامی نوکروں کی مدد سے عام طور پر دکانیں یورپی صنعت کاروں کی ایجنسیاں ہوتیں اور انہیں یورپی لوگ یا ان کے معتمد اتحادی جیسے پارسی اور انگلوانڈین وغیرہ چلاتے۔ یہاں اشیاء اور خدمات کا وسیع تنوع پیش کیا جاتا۔ جن میں مختلف قسم کی شرابیں، فرنیچر (بکاؤ اور کرائے والا) درزی، بیکریاں، کرائے پر گاڑیاں قابل فروخت اور ان کی مرمت درآمدگی ہوتی۔ ذاتی اشیاء مثلاً تمباکو، خوشبوئیں، ریشمی کپڑے، یادآور چیزیں، شکار کھیلنے کے ہتھیار اور اسلحہ اور اسی طرح کی دوسری اجناس ہوتیں خاص طور سے مقبول عام ہر قسم کی یادآور چیزیں جو اکثر منعقد ہونے والے متعدد جشنوں اور تقریبات میں پیش کیے جانے کے لیے ہوتیں۔ گاہک اشیاء چنتے، اشیاء ان کے گھر پہنچا دی جاتیں۔ صاحبوں کو کوئی چیز اٹھائے جاتا۔

چھاؤنی کے مشرقی مضافات میں ڈیری فارم، مویشی گھر، رجمنٹوں کے اصطبل اور مویشیوں سے متعلق سہولتیں تھیں۔ چارہ اگانے کے لیے کھیت مشرق کی طرف ملحقہ دیہات کی زرعی زمینوں کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ رجمنٹوں کی پریڈ گراؤنڈیں، چاند ماری کے لیے قطعہ ہائے اراضی اور فوجی مشقوں کے لیے میدان چھاؤنی کے جنوبی حصے پر پھیلے ہوئے تھے۔ لاہور کے مقامی باشندے کے لیے چھاؤنی کا علاقہ اس کی گلیاں اور عمارتیں، اس کی کشادہ سڑکیں پیدل چلنے کی جگہیں، ان کے سفیدی شدہ کنارے، ایک اور ہی دنیا تھی۔ اس کے علاوہ جس میں صرف مقدس، خوف اور بے چینی کے احساس کے لیے ہی داخل ہوسکتا تھا۔ کیونکہ یہ سب ماحول اس کے لیے غیر مانوس تھا۔ کسی بھی اور چیز سے زیادہ چھاؤنی برطانویوں کی طاقت اور ثقافتی حاویت کی نمائندگی کرتی۔ برطانوی قصبے سے شہر لاہور پر گہرے اور دیرپا اثرات

چھوڑے۔ شہر پر اثر صرف شہری نقشے میں تبدیلی تک ہی محدود نہیں رہا۔ زندگی کا اسٹائل اور اس کھانے کی عمارت مختصراً یہ کہ سارا ثقافتی (خلفیہ) قومی مزاج ہی تبدیل ہو گیا۔ شہر کے امیر خاندان برطانوی حاکموں کی نقل کرتے اور ایک عام احساس تھا ہر انگریزی شئے ''دیسی'' سے بہتر ہے۔ سیدھی گلیوں میں پائپوں سے متعارف ہونے پر صاف پانی کی فراہمی اور گندے پانی کی نکاسی ضروری ہو گئی۔ اور پھر معمول بن گئی۔ بنگلہ ہر چند کہ چھوٹے پیمانے پر ہی بنے دل پسند گھر سمجھا جانے لگا۔ متوسط طبقے نے صدر کے شہری نقشوں کی نقل کی۔ تاکہ ایسے علاقے جیسے گوالمنڈی، کرشن نگر، محمد نگر وغیرہ بنائے۔

زیادہ امیر طبقات نے بنگلے کی کلی طور پر نقل کی تاکہ ماڈل ٹاؤن بنائیں جیسا کہ ماڈل ٹاؤن کی بنیاد رکھنے والے دیوان کھیم چند نے کہا ''ہم بھی برطانویوں کی طرح اچھے گھر چاہتے ہیں۔'' حکومت نے بھی اس خیال کو جی۔ او۔ آر (GOR) (۱۹۲۵) اور تقریباً اسی وقت میوگارڈنز بنا کر فروغ دیا۔ چوبرجی کوارٹرز نوکر شاہی کی نچلی پرتوں کے لیے، یہ بھی صدر ٹائپ گھروں کی عکاسی کرتے تھے۔ امیروں اور متوسط طبقوں کے گھر کے لیے نمونہ بن گئے۔

آزادی کے بعد بھی برطانویوں کی طے کی ہوئی لائنوں پر ہی تعمیرات ہوئیں اور لاہور امپرووومنٹ ٹرسٹ (Lahore Improvement Trust) بعد ازاں LDA کی بنائی ہوئی بہت سی رہائشی بستیاں شہری کالونیاں انداز کی نقل ہیں۔ سمن آباد اور مختلف گلبرگیں اس کی شہادت ہیں۔ شہری منصوبہ سازوں کی طرف کالونیائی رویوں کو ترک کرنے اور ایسے ماحول سے متعلق سوچنے جو عوام کی خوشی، بہبود پر منتج ہو غور وخوض نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کیا ہم اس حالت کو تبدیل کر سکتے ہیں؟ اور کیا ہمیں کوشش کرنی چاہیے؟ موجودہ شہری انداز انفراسٹرکچر کی کوالٹی مستفید ہونے والوں کی نشاندہی اور گھروں کی شکلیں جو LDA کی طرف سے منظور کی جاتی ہیں۔ جنہیں ہم بلاچوں و چرا قبول کیے جاتے ہیں۔ فطری یا لازمی نہیں ہیں۔ وہ ایک تاریخی ورثہ ہیں۔ اور ہم ان کی قدروں کو متعین کرنے اور انہیں تبدیل کرنے میں حق بجانب ہیں۔ ہم ماضی کو پیچھے نہیں لانا چاہتے۔ لیکن گو کہ وقت کو پیچھے نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن کم از کم اسے بہتر طور پر سمجھا اور مستقبل کی راہ عمل کو بدلا جا سکتا ہے۔

لاہور......نواحی آبادکاری وتوسیع

ڈاکٹر غافر شہزاد

شہروں کی توسیع و آبادکاری میں مسلسل اضافے کا رجحان کوئی نیا معاملہ نہیں ہے۔ قدیم زمانے سے شہر اس عمل سے گزرتے رہے ہیں مگر ایک فرق پڑ گیا ہے، گزرے زمانوں میں شہر آباد ہوتے تھے اور پھر تباہ بھی ہوتے تھے کبھی تو بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے یہ تباہی آتی اور کبھی قدرتی آفات شہروں کو بہالے جاتیں رہیں۔ لندن شہر کی مثال لیجئے ۶۰۰۰ ۴ مرتبہ آگ لندن شہر کے مختلف حصوں کو جلا کر راکھ کر چکی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں جرمن ائیر فورس نے بمباری کر کے ایک لاکھ سے زائد لندن کے گھر تباہ کر دیئے۔ ستمبر اور نومبر کے درمیان تقریباً تیس ہزار بم لندن شہر پر گرائے گئے۔ ۱۹۴۴ء میں جرمنی نے پہلی مرتبہ تین ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر کے آنے والے راکٹ بم لندن پر گرائے۔ ۱۹۴۵ء کی فتح کے بعد گریٹر لندن کا منصوبہ شروع ہوا شاہراہیں کشادہ کی گئیں، تنگ و تاریک گلیاں کھلی اور روشن بنادی گئیں شہر اتنا بڑا اور پُر ہجوم ہو گیا کہ لوگ لندن کی سڑکوں پر نکلنے کا سوچتے تو پہلے ہی تھکنے لگتے تھے، رش کا بوجھ لوگوں کے ذہن پر پڑتا تھا، شہر اتنا بڑا اور ایسا پھیل گیا کہ اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

اس حوالے سے اگر لاہور کی گذشتہ دو ہزار سالوں پر پھیلی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو لندن کے مقابلے میں لاہور کافی کم تباہ ہوا ہے، لاہور کا شہر قدیم جو کہ دریائے راوی کے بائیں کنارے پر آباد ہوا تھا اسے ایک جانب سے دریائے راوی کی طغیانیوں نے اگر مختلف وقتوں میں تباہ کیا ہے تو دوسری طرف شمالی جانب سے آنے والے بیرونی حملہ آوروں نے اس کی تباہی اور لوٹ کھسوٹ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ شاید یہی اہم وجہ تھی کہ جب بھی شہر آباد ہوتا،

اس کی توسیع جنوبی جانب ہی ہوتی، بیرونی حملہ آوروں کے خوف سے لوگ شہر قدیم کے گرد بنائی گئی فصیل کے اندر پناہ لیتے، بند عالمگیری دریائے راوی کی طغیانیوں سے شہر کو محفوظ رکھتا مگر شہر کی توسیع ہمیشہ جنوبی جانب ہی ہوتی رہی۔ شہر اور شہر میں بسنے والوں پر دریائے راوی اور شمالی حملہ آوروں کا خوف ہمیشہ طاری رہا۔ یہاں تک کہ آخر کار دریائے راوی نے اپنا راستہ بدل لیا اور شہر سے کئی میل دور ہٹ گیا جبکہ برطانوی تسلط کے بعد شمالی حملہ آوروں کی آمدورفت بھی مسدود ہو گئی مگر پھر بھی شہر کی توسیع اور آبادکاری جنوبی جانب ہی ہوئی اس لئے بھی کہ انگریزی عہد میں کنٹونمنٹ اور ماڈل ٹاؤن جیسی آبادیاں جنوبی جانب ہی بسائی گئی تھیں۔ شہر قدیم لاہور کی نواحی آبادکاری اور توسیع کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے تاریخی تناظر میں دیکھا جائے، تب ہی ہم توسیع و آبادکاری سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لئے جامعہ منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔

کنہیا لال ہندی نے تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ (۱) لاہور دریائے راوی کے بائیں کنارے سے دو میل کے فاصلے پر آباد ایک قدیمی شہر ہے۔ مغلوں سے قبل تغلق، خلجی اور لودھی سلاطین کے عہد میں دیپال پور کو پنجاب کا دارالحکومت ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے مگر بابر اور ہمایوں کے عہد میں شہر لاہور پنجاب کا دارالسلطنت بنا اور حاکم نشین ہونے کے سبب اس کی آبادی اور رونق میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ امیر خسرو نے آٹھویں صدی ہجری میں اپنی کتاب ''قرآن السعدین'' میں اس شہر کا نام لاہور درج کیا ہے۔ ؎

ازا حد سامانہ تا لاہور (کذا)

ہیچ عمارت نہ مگر در قصور

البتہ ''فوائدالفواد'' میں اس شہر کو ''لہانور'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ (۲)

کنہیا لال مزید لکھتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں اس شہر کی کھلی آبادی تھی، فصیل یا شہر پناہ نہ تھی، اکبر بادشاہ نے پہلی بار اس کے گرد پختہ حصار بنوایا (۳) فصیل کی دیوار بہت بلند اور چوڑی تعمیر کی گئی ایک ایک دروازے کے درمیان دس دس برج کلاں بنوائے، دروازے پختہ تعمیر کئے، قلعہ بھی پختہ بنوایا۔ یہ فصیل سکھ عہد تک برقرار رہی عہد انگریزی میں اس قدر بلند فصیل کو بے فائدہ قرار دیتے ہوئے پہلے اس کی قامت کو نصف کر دیا گیا۔

بعدازاں اسے بھی گرا کر ایک مختصر دیوار پختہ بنوادی گئی جو آج تک موجود ہے۔

شہر قدیم لاہور کی فصیل کے بیرون آبادی کا آغاز مغل بادشاہ ہمایوں کے عہد میں ہو چکا تھا اور رفتہ رفتہ جنوب اور جنوب مشرق اور مشرق کی جانب آبادکاری ہوتی چلی گئی۔ مغلیہ عہد سے قبل دریائے راوی شہر قدیم کے مشرق، شمال اور جنوب کی سمت بیرونی آبادی سے ٹکراتا ہوا گزرتا تھا، چونکہ شہر قدیم ایک بلند ٹیلے پر واقع تھا لہٰذا تین اطراف سے راوی کے گزرنے کے سبب بیرونی حملہ آوروں سے کافی حد تک محفوظ رہتا تھا مگر جن دنوں دریا میں پانی کی سطح کم ہوتی، شمالی جانب سے آنے والے حملہ آوروں اور غارت گروں کو کسی قسم کی مشکل یا مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شہر قدیم کے نواح میں آبادکاری کا آغاز ہوا تو جنوبی جانب کو ہی اولیت دی گئی۔

عہد ہمایوں میں سب سے پہلے لنگر خان بلوچ لاہور آیا تو بادشاہ نے اس کو جاگیر دی اور لاہور میں رہنے کی اجازت بخشی اور یوں لنگر خان بلوچ نے لاہور کے شہر قدیم سے باہر جنوبی سمت میں اپنا الگ محلّہ آباد کر لیا اور اپنی سکونت اسی جگہ اختیار کی۔ اس محلے کا قدیمی نام ''گزر لنگر خان'' قرار پایا۔ اس محلے میں بڑی بڑی حویلیاں اور پختہ مکانات لنگر خان اور اس کی اولاد نے تعمیر کروائے۔ یہ محلّہ عہد مغلیہ کے اخیر تک قائم رہا۔ بعدازاں سکھوں اور درّانیوں کی غارت گری کے سبب یہ محلّہ اجڑ گیا، اس کی آبادیوں میں سے اب کسی کا نام ونشان تک نہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں کشمیری خشت فروشوں نے اس عہد میں تعمیر حویلیوں اور عمارات کی اینٹیں نکال کر بیچ ڈالیں اور پھر اس جگہ نئی تعمیرات کا آغاز ہوا۔

۱۶۶۲ء میں جب دریائے راوی نے اپنا رخ بدلا اور شہر قدیم کی عمارتوں کو بے حد نقصان پہنچایا تو اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے عہد حکومت کے چوتھے سال ایک شاہی حکم نامہ جاری کیا کہ شہر کو دریائے راوی سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک مضبوط اور بلند بند تعمیر کیا جائے اور یوں دو کوس کی لمبائی میں حضرت شاہ بلاولؒ کے مزار تک بند اسکندری کی طرز پر بند عالمگیری کی تعمیر کی گئی۔ کئی جگہوں پر اس بند کی تزئین کرتے ہوئے باقاعدہ زینے تعمیر کئے گئے تاکہ پانی تک رسائی حاصل ہو سکے، اس عہد کی تصاویر میں انہیں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ بند کی تعمیر تقریباً عہد عالمگیری کے آخری سالوں تک جاری رہی۔ بند کی بنیادیں گہری کھدائی کر کے تعمیر کئے جانے

والے گول کنوؤں کے اوپر تعمیر کی گئیں، اس گہرائی میں لکڑی کے ستون بھی بند کی بنیادوں میں استعمال کیے گئے۔ بند عالمگیری آج بھی لاہور شہر کی شمال اور مغربی جانب موجود ہے جہاں بند روڈ تعمیر کی گئی ہے اور آج کل وہاں رنگ روڈ کی تعمیر کا مجوزہ منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔

مفتی تاج الدین نے اپنی کتاب مطبوعہ ۱۸۶۷ء میں عہد اکبری (۹۸-۱۵۸۴) میں شہر قدیم لاہور کی اندرونی آبادی کو نو محلّوں (گزر) میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں گزر جھجہ دیوانی، گزر مچھی ہٹہ، گزر روچھووالی، گزر مبارا خان، گزر تلوارہ خان، گزر ررڑہ، گزر شیخ محمد اسحاق، گزر شہباز خان اور گزر مانک چوک شامل ہیں۔ مفتی تاج الدین مزید لکھتے ہیں کہ شہر قدیم کے بیرون آبادی ستائیس گزر (محلّوں) پر منقسم تھی (۴)۔ تفصیلی احوال ان آبادیوں کا معلوم نہیں ہے۔ یہ آبادیاں عمومی طور پر شہر قدیم کے بارہ دروازوں کی بیرونی جانب واقع تھیں۔

مفتی تاج الدین اور کنہیا لال ہندی نے ممکنہ تفصیلات بسلسلہ آبادکاری بیرون شہر قدیم تحریر کی ہیں ان تفصیلات کی روشنی میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے بھی سکھوں کے عہد حکومت میں نواحی آبادیوں کے بارے میں احوال درج کیا ہے۔ (۵)

اگر مجموعی تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ شہر قدیم کے نواح میں مختلف طرح کی آبادکاری کے پیچھے سماجی، حکومتی یا مذہبی شخصیات رہی ہیں جنہوں نے ان محلّوں کی بنیاد رکھی اور پھر انہی کے نام سے یہ محلّے معنون ہوئے۔ ''گزر لنگر خان'' ملتان کے حاکم لنگر خان بلوچ نے بیرون لاہور بہ سمت جنوب آباد کیا۔ محلّہ پیر عزیز مزنگؒ المشہور موضع مزنگ ایک بزرگ پیر عزیز مزنگؒ نے کابل سے آ کر آباد کیا، مزنگ مغلوں کی ہی ایک گوت تھی۔ محلّہ لنگر خان کے قریب غربی جانب محلّہ موج دریا بخاری عہد اکبری میں آباد ہوا۔ اس مقام پر سب سے پہلے سید میراں شاہ بخاریؒ المعروف حضرت موج دریا بخاریؒ آ کر رہائش پذیر ہوئے جو ایک صاحب کرامت، عابد و زاہد بزرگ تھے۔ بادشاہ نے ارادت مندی کے اظہار کے لئے دو لاکھ روپے کی جاگیر خانقاہ کے درویشوں کے اخراجات کے لئے عطا کی، تب یہاں بڑا محلّہ آباد ہو گیا جو عہد مغلیہ کے اخیر تک رہا۔ پھر سکھوں اور احمد شاہی حملوں کے وقت اجڑ گیا، آج بھی یہاں سید موج دریا بخاریؒ کا پختہ مزار موجود ہے جس کے ساتھ محکمہ انکم ٹیکس کی عمارت تعمیر کر دی گئی ہے۔ محلّہ سید موج دریا بخاریؒ کے مشرق میں محلّہ سید چراغ شاہ گیلانیؒ مغل بادشاہ جہانگیر

کے عہد میں آباد ہوا۔ بعدازاں بے انتظامی اور بدعملی کے وقت بیرونی حملہ آوروں نے اس کو ویران کر دیا۔ سید شاہ چراغ لاہوریؒ کا مزار و مسجد آج بھی موجود ہے، اس جگہ پر انگریزی عہد میں چیف کورٹ لاہور کی عمارت تعمیر (۱۸۸۱ء) کر دی تھی۔ محلہ دولا واڑی اگرچہ مسمی دولا زمیندار جس کی گوت واڑی تھی، نے اول اول آباد کیا مگر جب یہاں سید عبدالرزاق مکیؒ آ کر سکونت پذیر ہوئے تو آبادکاری میں اضافہ ہو گیا، خانقاہ سید عبدالرزاق مکیؒ (نیلا گنبد) میں کوئی نہ کوئی بزرگ قیام پذیر رہے جس کے سبب یہ محلّہ بیرونی حملہ آوروں کی غارت گری سے محفوظ رہا۔ اس سلسلے کے آخری بزرگ حاجی محمد سعید تھے جن کی زیارت کے لئے احمد شاہ درانی بعداز فتح مرہٹہ لاہور آیا تو محلّے میں حفاظت کے لئے اس نے شاہی پہرے کا تقرر کیا مگر حاجی محمد سعید کے مرنے کے بعد گوجر سنگھ کی مثل نے اس محلّے کو لوٹ کر بے چراغ کر دیا۔ (۶)

بھاٹی دروازے کے باہر کچہری تک پھیلا ہوا سید شاہ شرفؒ کا محلّہ کہلاتا تھا، شاہ شرفؒ ایک عالم و عامل تھے اور ہزاروں لوگ ان کے مرید تھے۔ انہوں نے ایک عالی شان مسجد اور مزار بھی بنوایا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت شہر کے اردگرد جب خندق چوڑی کی گئی اور دوہرے دروازے لگوائے گئے تو سید شاہ شرفؒ کا صندوق نکلوا کر احاطہ مزار حاجی محمد سعید بہ مقام دولا واڑی محلّہ دفنا دیا گیا۔ آخر بیرونی حملہ آوروں نے اس محلّے کو بھی اجاڑ دیا۔ اسی طرح لکھی محلّے سے بہ سمت مشرق قدرے فاصلہ پر جہاں مزار شاہ درگاہیؒ موجود ہے، کبھی درگاہی شاہؒ کا محلّہ آباد ہوتا تھا، یہ بزرگ قادریہ سلسلے کے ایک فقیر عابد و زاہد تھے، انگریزی عہد میں یہاں تعمیرات کر دی گئیں البتہ مزار درگاہی شاہؒ آج بھی موجود ہے، اسی طرح درگاہی محلّے کے نواح میں شاہ بدرالدین گیلانیؒ نے محلّہ شاہ بدر آباد کیا جہاں ان کے ہم قوم شریف سید آباد تھے عہد اکبر میں آباد ہونے والا یہ محلّہ بھی مغلیہ عہد کے اخیر تک قائم رہا، پھر سکھ حملہ آور ہوئے اور فتح پا کر بہت سے سادات کو قتل کر دیا، محلّہ لوٹ لیا اور مکانات کو آگ لگا دی۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں یہاں صرف ایک مسجد شاہ بدرؒ کی باقی رہ گئی۔

محلّہ میانی مغل بادشاہ جہانگیر کے وقت شہر سرہند سے آنے والے بزرگ شیخ محمد طاہر قادری و نقشبندیؒ نے آباد کیا چونکہ وہ فقیر کامل تھے، چند سالوں میں ہزاروں لوگ ان کے مرید و شاگرد یہاں آباد ہو گئے چونکہ ''میانا'' پنجابی زبان میں مولوی عالم کو کہتے ہیں اور وہی

لوگ یہاں رہتے تھے اس وجہ سے یہ محلّہ میانی مشہور ہو گیا۔ سکھوں کے عہد میں جب غارتگروں نے محلّے کو لوٹا تو یہاں موجود ہزاروں قرآن نذرِ آتش کر دیئے گئے، بعد ویرانی اس محلّے کو شہر لاہور کے لوگوں نے قبرستان بنا لیا اور آج بھی یہاں تدفین کا سلسلہ جاری ہے۔

مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں شاہ ابوالمعالی قادریؒ نے لاہور کے بیرون سکونت اختیار کی تو یہ پیروں کا محلّہ مشہور ہو گیا۔ غارت گری کے دور میں ساکنانِ محلّہ بھاگ گئے اور محلّہ ویران ہو گیا مگر آج بھی مزار حضرت ابوالمعالیؒ موجود ہے۔

گڑھی شاہو سے متصل محلّہ سیّد سر دراصل اس وجہ سے معروف ہوا کہ یہاں سیّدوں کے ہزاروں مرید تھے۔ یہاں ایک قدیم تالاب پختہ بنا ہوا تھا جس کا پانی شفاء بخش تھا۔ غارت گری کے عہد میں یہ محلّہ بھی بے آباد ہو گیا۔ شہر قدیم کی فصیل کے بیرون بزرگوں کی سکونت کے سبب محلّے آباد ہوتے رہے اور پھر اجڑتے رہے۔ کچھ آبادکاریاں ایسی بھی ہوئیں جن کا سبب شاہی خاندان یا حکمران طبقہ کے افراد تھے۔ شہزادہ داراشکوہ نے محلّہ چوک داراشکوہ آباد کر کے محلّے کے وسط میں ایک وسیع چوک پختہ بنوا دیا۔ یہاں بڑے بڑے تجار کی کوٹھیاں تھیں، لاکھوں کا کاروبار ہوتا تھا، رنجیت سنگھ کے عہد میں ان عمارتوں کو گرا کر اینٹیں بیچ دی گئیں اور یوں یہ محلّہ اجڑ گیا۔

محلّہ مغل پورہ میں صوبہ لاہور کے امراء قیام پذیر رہے یہاں بڑی بڑی حویلیاں اور دیوان خانے تھے۔ سب سے پہلے احمد شاہ درانی نے اس محلّے کو لوٹا، اس کے بعد سکھوں نے اسے تین بار لوٹا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں یہاں کی حویلیوں کی اینٹیں نکالی گئیں تو کئی دفینے برآمد ہوئے۔

محلّہ زین خان نائب صوبہ لاہور نے اپنے نام پر آباد کیا جو کم و بیش ایک سو سال آباد رہا۔ زین خان کا اپنا عالی شان محل بھی یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔ سکھ غارت گروں کے عہد میں لوگ یہاں سے سکونت ترک کر کے چلے گئے۔

لاہور شہر کی تجار قوم خوجہ نے اپنی رہائش کے لئے بڑی بڑی عمدہ پختہ حویلیاں تعمیر کیں اور یوں یہ خوجیوں کا محلّہ مشہور ہو گیا، سکھ جب بھی حملہ آور ہوتے یہاں کے باسی ان کو کچھ نذرانہ پیش کر کے ٹال دیتے، مگر آخرکار سکھوں کی تین مثلوں نے متحد ہو کر حملہ کیا اور پھر جس کے ہاتھ

جو لگا، لوٹ لیا گیا۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں یہاں بھی ایک مسجد محفوظ رہ گئی تھی جس کو بارود خانہ کے اسٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

لاہور شہر کے بیرون ہال روڈ کے قرب میں لکھی محلہ آباد تھا جہاں ساہوکاروں اور مل داروں نے لاکھوں روپے کی عمارات اور حویلیاں تعمیر کر رکھی تھیں رنجیت سنگھ کے عہد میں جب خشت فروشوں نے ان گھروں کی بنیادوں کو کھودا تو اکثر دفینے نکلے، غارتگروں کے ہاتھوں لٹ کر یہاں کے مکین کچھ تو بہ سمت جموں بھاگ گئے اور کچھ نے لاہور کے حصار کے اندر پناہ لی۔

اس کے علاوہ لاہور شہر کے نواح میں بستی کوٹ عبداللہ شاہ کو عبداللہ شاہ بلوچ نے آباد کیا، قلعہ مہر مادو مراد بخش المشہور مادو آرائیں نے آباد کیا، قلعہ مہرا اگرچہ آرائیوں نے مل کر آباد کیا تھا مگر یہاں سب سے پہلے مہرا ترکھان نے رہائش اختیار کی لہٰذا اس کے نام سے یہ بستی مشہور ہوگئی۔ محلہ تاج پورہ ایک فقیر مسمی تاجا نے آباد کیا، محلہ جاٹ پورہ میں جاٹ آکر آباد ہوئے، محلہ تیل پورہ میں تیلی آباد تھے اور یہاں تیل کی ایک بہت بڑی منڈی لگتی تھی، مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں قصابوں کو شہر سے الگ آباد کرنے کے لئے محلہ قصاباں شہر قدیم کے نواح میں بہ جانب مشرق آباد ہوا۔ جہاں بڑے بڑے دولت مند قصاب رہتے تھے۔ سکھوں نے اس محلے کو بھی لوٹ کر نذرِ آتش کر دیا۔

شہر قدیم لاہور کے نواح میں محلہ دائی انگہ ایک دایہ انگہ نے آباد کیا، حفاظت کے لئے پختہ دروازے اور فصیل بنوائی گئی، اسی طرح دیوان رتن چند کے باغ والی جگہ پر دائی لاڈو نے محلہ دایہ لاڈو آباد کیا، یہاں مسجد بھی تعمیر کی گئی، طول و عرض اس محلے کا دیگر محلوں کی نسبت سب سے بڑا تھا۔ یہ محلہ دولا واڑی اور محلہ زین خان کے درمیان واقع تھا۔ یہاں بڑی بڑی عالی شان عمارتیں تعمیر تھیں جنہیں رنجیت سنگھ کے عہد میں کشمیری خشت فروشوں نے گرا کر اینٹیں بیچ دیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد تقریباً تمام ہندوستان ہی غارتگروں کی زد میں آ گیا۔ پنجاب میں سکھوں نے اپنی حکومت کر لی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے قبل شہر قدیم لاہور کو تین سکھ سرداروں نے اپنے قبضہ میں کر رکھا تھا۔ بیرون شہر قدیم دن دیہاڑے نواحی آبادیوں پر سکھ حملہ آور ٹوٹ پڑتے اور پھر جو ملتا لے اڑتے، جو لوگ مزاحمت کرتے ان کے گھروں کو

آگ لگادی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان سالوں میں بہت سے لوگ بیرون لاہور کی آبادیوں کو چھوڑ کر یا تو شہر قدیم کے اندر آن بسے یا پھر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ہجرت کر گئے۔ آخر جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہوئی تو رفتہ رفتہ اندرون شہر آبادکاری شروع ہوئی، بڑی بڑی حویلیاں امرائے سلطنت کے لئے تعمیر کی گئیں، شہر قدیم کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے خندق کھدوائی، دوہرے دروازے تعمیر ہوئے، فصیل کی مرمت کروائی گئی، غیر آباد محلّوں میں آبادکاری کا حکم دیا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ دورِ اقتدار میں شہر بہ خوبی آباد ہو چکا تھا۔ بیرونی کھنڈرات میں امرائے دربار نے بڑے بڑے باغات اور حویلیاں بنوائیں۔ شہر کے اندر اور بیرون عہد سکھی کے چالیس سال اور پھر انگریزی عہد کے بیس سال تک عمارتوں کو بنیادیں تک کھود کر کشمیری خشت فروش لاکھ پتی ہو گئے (۷)، مگر اینٹیں ختم نہ ہوتی تھیں، دفینوں کے لالچ اور اینٹوں کی فروخت کے کاروبار کے سبب جگہ جگہ گھڑے بن گئے۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں آبادکاری شروع ہو گئی مگر شہر کی صفائی کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا، گلی کوچوں میں کوڑا کرکٹ کے انبار پڑے رہتے تھے، مردہ جانوروں کی لاشیں گلیوں میں سڑتی رہتیں، بازاروں کی نالیاں کیچڑ میں لت پت رہتیں، کوئی محکمہ صفائی مقرر نہ تھا۔ (۸)

انگریزوں نے ۱۸۴۸ء میں جب لاہور کو اپنے قبضہ میں لیا تو شہر کی صفائی ستھرائی کی جانب توجہ دی۔ بازاروں اور گلیوں کی درمیانی نالیوں کو ختم کر کے ماہی پشت فرش باندھے گئے (۹) محکمہ صفائی کا تقرر ہوا، صبح و شام بازار صاف کر کے چھڑکاؤ کیا جاتا۔ یہ درستی شہر کی پہلے پہل ۱۸۵۰ء میں تھارن ہل اسسٹنٹ کمشنر کے عہد میں ہوئی۔ لوگوں کے لئے صاف پانی کی خاطر نلکے لگائے گئے، پختہ اور شاندار تالاب اور کنویں بنوائے گئے۔

انگریزی عہد میں لاہور کو پنجاب کا دارالحکومت قرار دیا گیا تو شہر کی گویا کایا پلٹ ہو گئی، اندرون شہر تو صفائی و مرمت اور سہولیات کی فراہمی کا سلسلہ شروع ہوا، بیرون شہر قدیم بھی آبادکاری کا نیا عمل شروع ہوا، انگریزی حکومت کے قبضے کے بعد سب سے پہلے لاہوری دروازے کے باہر فوج کے لئے بیرکیں بنوائی گئیں، کوٹھیاں تعمیر ہوئیں اور صدر بازار انارکلی کے نام سے ایک پختہ بازار تعمیر کیا گیا جو لوہاری دروازے سے شروع ہو کر ونتورہ صاحب کے پرانے بازار تک قریب ایک میل کے ہوگا (۱۰)، بازار کے دونوں اطراف دوکانیں اور اوپر

نشست گاہیں تعمیر کی گئیں، بہت سے محلّے بازار کے دوطرفہ آباد ہوئے، گویا شہر کے باہر نیا شہر آباد ہو گیا۔

انگریزی عہد کی دوسری آبادکاری حضرت میاں میر کے دربار سے ملحقہ کھلے میدان میں چھاؤنی میاں میر کے نام سے ۱۸۵۲ء میں ظہور پذیر ہوئی۔ یہاں بھی صدر بازار میاں میر کے نام سے ایک عالی شان بازار بنایا گیا، اور فوج کے رہنے کے لئے عالی شان بیرکیں اور عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے علاوہ انارکلی سے لے کر میاں میر چھاؤنی تک موضع مزنگ وگڑھی شاہو قلعہ گوجر سنگھ کے علاقے میں بے شمار مکانات اور کوٹھیاں تعمیر کی گئیں۔ انارکلی سے میاں میر چھاؤنی تک جانے کے لئے مال روڈ تعمیر کی گئی۔ یہ شہر کی ٹھنڈی سڑک مشہور ہوئی کہ اس کے دونوں اطراف درخت لگائے گئے اور پھر آنے والے سالوں میں اس سڑک کے دونوں اطراف بے شمار کالجز، چیف کورٹ، جنرل پوسٹ آفس، لارنس ونٹگمری ہال، گورنر ہاؤس، اسمبلی ہال، ایچی سن کالج وغیرہ کی عمارات نے شہر کا ایک نیا تشخص بنایا۔

شاہ عالمی دروازے کے باہر دیوان رتن چند کی سرائے اور تالاب کی تعمیر نے ایک نئی آبادی کو جنم دیا۔ یہاں ہر قسم کے اناج، گھی اور تیل کی منڈی قائم ہوئی، دور دور سے تجار اور سوداگر یہاں آتے، قیام کرتے اور کاروبار کرتے۔ یہاں تالاب پر غسل کا اعلیٰ انتظام موجود تھا۔

بھاٹی دروازے کے باہر بھی رائے میلا رام ٹھیکیدار نے ایک عالی شان سرائے اور عمدہ کوٹھی تعمیر کروائی، اسی طرح دہلی دروازے کے باہر محمد سلطان ٹھیکیدار نے زر کثیر خرچ کر کے ایک عالی شان ووسیع سرائے تعمیر کروائی، سرائے کے باہر شمال کی سمت میں ایک پختہ جدید بازار آباد کیا گیا جسے لنڈا بازار کہتے ہیں۔ سرائے اور ریلوے اسٹیشن آپس میں اس بازار کی وجہ سے مل گئے۔ ریلوے لائن اور ریلوے اسٹیشن کی تعمیر نے گویا انگریزی عہد کے شہر لاہور کو ایک نئی جمالیات سے نوازا۔ دہلی دروازے کے باہر شمال کی جانب ریلوے اسٹیشن تھا لہٰذا ریلوے کے محکمہ کے لئے ورکشاپس ورہائشی کوٹھیاں و دیگر لازمی عمارات، شہر قدیم کی مشرقی سمت جہاں انجینئرنگ یونیورسٹی ہے، تعمیر کروائی گئیں، انجینئرنگ یونیورسٹی بھی اول اول ریلوے والوں کا میکلیگن کالج ہی تھا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلے کے بعد ایک ریلوے لائن دہلی اور

دوسری جانب ملتان بچھائی گئی، اورانہی دونوں لائنوں کے درمیانی رقبے میں میاں میر چھاؤنی تعمیر کی گئی تھی۔

برطانوی حکومت نے عام شہریوں کے رہنے کے لئے شہر قدیم سے باہر کئی آبادیاں بسائیں۔ان میں موچی دروازے کے باہر گوالمنڈی، بھاٹی دروازے کے باہر سنت نگر، کرشن نگر، قلعہ گوجر سنگھ کے نواح میں محمد نگر، گڑھی شاہو جیسی آبادیوں کی تعمیر کے لئے سڑکیں بچھائی گئیں، پانی کی سہولت کے لئے پائپ بچھائے گئے، سیور کا سسٹم متعارف کروایا گیا، گھروں کے لئے پلاٹ قریب قریب مربع شکل کے رکھے گئے اور ہر پلاٹ کی کم از کم دو جانب سڑک تعمیر کی گئی۔ نئے تعمیراتی سامان اور ٹیکنیک نے شہر میں نئی جمالیات کو متعارف کروایا۔ ریلوے کے اعلیٰ افسران کے لئے میو گارڈن جیسی شاندار رہائشی اسکیم تیار کی گئی۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بیسویں صدی کے آغاز میں ماڈل ٹاؤن کے نام سے ایک ماڈل رہائشی اسکیم متعارف کروائی گئی جو کہ شہر قدیم سے کئی میل دور جنوبی جانب واقع تھی، سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت غالباً یہ پہلی ماڈل بستی تھی جو بسائی گئی۔

برطانوی عہد میں تعمیر ہونے والے کنٹونمنٹ اور ماڈل ٹاؤن نے آنے والے دنوں کے لئے شہر لاہور کی جنوبی جانب توسیع کے لئے راہیں متعین کر دی تھیں۔کنٹونمنٹ کے لئے جگہ کا انتخاب اگرچہ عسکری ضرورت اور نقطہ نظر کے مطابق کیا گیا تھا۔

شہر قدیم جہاں کم و بیش ایک لاکھ افراد رہائش پذیر تھے، ڈھائی مربع کلومیٹر کے رقبہ پر آباد تھا جبکہ نئی آبادی کنٹونمنٹ کے لئے پینتیس مربع کلومیٹر کا رقبہ کم و بیش بارہ ہزار لوگوں کے (۱۱) رہنے کے لئے ایک مستطیل کی شکل میں مختص کیا گیا، شہر قدیم کے مقابلے میں جہاں آڑی ترچھی گلیاں تھیں، کنٹونمنٹ کی سڑکیں قائمۃ الزاویہ تعمیر کی گئیں، کھلی کشادہ سڑکیں ایک جانب جدید تر شہری سہولیات کی فراہمی کے لئے مطلوب تھیں، وہاں بستی کا تاثر بھی بہت عمدہ بنتا تھا۔شہر قدیم سے باہر چند میل کے فاصلے پر بسائے جانے والے کنٹونمنٹ میں بسنے والوں اور مقامی باسیوں کے درمیان عہدہ، رتبہ اور سماجی فاصلہ بھی اسی طرح قائم رکھا گیا۔تعمیراتی کاموں کے معیار کے لئے ملٹری انجینئرنگ سروسز ہینڈ بک سے رہنمائی لی گئی۔ (۱۲) کنٹونمنٹ کے شمالی جانب جو کہ شہر قدیم کے قدرِ قریب تھا، مقامی لوگوں کو آبادکاری کے لئے حوصلہ افزائی

کی گئی جو یہاں چھوٹی موٹی دوکانیں بنا کر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء فراہم کرتے تھے۔ یہاں گوروں کے ملازمین خریداری کے لئے آتے تھے۔ اسی طرح صاحب اور میم صاحب کی خریداری کے لئے علیحدہ مخصوص بازار تھا جہاں کئی دوکاندار بھی یورپین تھے۔ مغربی جانب شہر قدیم کے قدرے نزدیک ۱۸۵۴ء میں پہلا آرمی ہسپتال (CMH) تعمیر کیا گیا جہاں افواج کے لئے طبی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ کنٹونمنٹ کی مشرقی جانب جہاں کھلی زمینیں تھیں، ڈیری فارم، مویشی فارم، اصطبل وغیرہ بنائے گئے، اسی طرح کنٹونمنٹ کی جنوبی جانب پریڈ گراؤنڈ، نشانہ بازی اور ٹریننگ کیمپ کے لئے مخصوص کردی گئی۔ [۱۳] برطانوی عہد حکومت کی اولین آبادی کنٹونمنٹ ہی تھی جہاں مختلف سرگرمیوں کے لئے جگہوں کی تخصیص کر دی گئی، قائمۃ الزاویہ سڑکیں بنائی گئیں، فوجیوں کے رہنے اور کام کرنے کے علاقے اگرچہ ساتھ ساتھ تھے، مگر جگہ کی تخصیص کر دی گئی۔ شہر قدیم کے باسیوں کے لئے کنٹونمنٹ کی آبادی اور یہاں کی تعمیرات بالکل غیر مانوس اور نئی تھیں اور اس نئی جمالیات نے آنے والے دنوں میں لاہور کے فن تعمیر کے لئے راہیں متعین کیں اور یوں مغلوں کے بعد ایک نئی طرز کی تعمیرات سے مقامی لوگ متعارف ہوئے۔

لاہور میں ریلوے اسٹیشن کا سنگ بنیاد ۱۸۵۹ء میں رکھا گیا اور ۱۸۶۱ء میں پہلی ٹرین سروس کا آغاز ہوا۔ کنٹونمنٹ کی شمالی جانب اور شہر قدیم کی مشرقی جانب ریلوے اسٹیشن کے قیام نے اس علاقے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اور جب ۱۸۷۴ء میں یہاں ریلوے ورکشاپ کا قیام عمل میں لایا گیا تو یہاں کی پوری معاشی اور سماجی صورتحال تبدیل ہوگئی۔ روزگار کے بے شمار مواقع ملے۔ سیالکوٹ تک سے لوگ بابو ٹرین پر بیٹھ کر یہاں ملازمت کے لئے روزانہ آتے، ریلوے آفیسرز اور ملازمین کے لئے رہائش گاہیں تعمیر کی گئیں، ریلوے کے اعلیٰ افسران کی رہائش کے لئے میوگارڈن میں کئی کئی کنال پر مشتمل کوٹھیاں ریلوے کے انجینئرز نے تعمیر کیں۔ ریلوے اسٹیشن میں بھی فرسٹ کلاس اور تھرڈ کلاس مسافروں کے لئے علیحدہ علیحدہ داخلی راستے بنائے گئے، ٹرین میں ڈبے بھی علیحدہ علیحدہ رکھے گئے۔ گویا برطانوی عہد حکومت میں دو کلاسیں متعارف ہوئیں، ایک تو صاحب لوگ تھے اور دوسرے مقامی لوگ۔ سماجی سطح پر پہلی مرتبہ اس تفریق نے معاشرے کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حاکم تھے اور دوسرے محکوم۔ یہ

تقسیم عہد مغلیہ میں بھی تھی کہ شاہی خاندان کے افراد کی رہائش کے لئے علیحدہ سے قلعہ اور شیش محل وغیرہ تھا مگر وہاں خادم اور غلام جا سکتے تھے، اسی طرح شہر قدیم میں امرائے سلطنت کے لئے حویلیوں کی تعمیر عام طبقے کے شہریوں کے گھروں کے درمیان ہی کی جاتی تھی بلکہ حویلی اجڑنے کے بعد وہاں کسی خاص قوم کے افراد جا کر بس جاتے اور پھر جب کہیں نئی حویلی تعمیر کرنا ہوتی تو عام لوگوں کے گھروں کو گرا کر وہیں ایک حویلی تعمیر کر دی جاتی، یہ تعمیر و تخریب کا کام فصیل شہر کے اندر اور نواح میں ہوتا رہا۔ برطانوی عہد حکومت میں صورتحال کافی حد تک تبدیل ہوگئی، شہر فصیل سے باہر نکل کر آٹھ دس میل جنوبی جانب تک پھیل گیا۔ کنٹونمنٹ اور ریلوے کے ان مخصوص علاقوں میں ہر مقامی فرد نہیں جا سکتا تھا۔

آرمی اور ریلوے کے گورا صاحبان کے لئے جب کوٹھیاں اور بنگلے تعمیر کئے گئے تو مقامی اہلِ ثروت لوگوں کے دلوں میں بھی ایسی رہائش گاہوں کی تعمیر اور ان میں رہنے کا خیال پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا، شاید ایسے ہی کسی احساس کے زیرِ اثر ایک مقامی شخص دیوان کھیم چند کے ذہن میں ایک ماڈل ٹاؤن کو آباد کرنے کا خیال پیدا ہوا، بقول پرویز وندل، دیوان کھیم چند ان دنوں (۱۹۰۳ء) انگلینڈ میں قانون میں تعلیم کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا۔ جب دنیا بھر میں صنعتی انقلاب کے بعد گارڈن سٹی کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اسی تحریک کے زیرِ اثر دیوان کھیم چند کے ذہن میں ماڈل ٹاؤن کا خیال پیدا ہوا۔ دیوان کھیم چند نے پہلے شاہدرہ کے پاس جی ٹی روڈ پر واقع سیٹھ سخی شاہ سے ایک ہزار ایکڑ زمین کی خریداری کی بات شروع کی [۱۴] مگر بعد ازاں ایگزیکٹو انجینئر ڈبلیو۔ سی چوپڑا کے مشورہ دینے پر سیلاب کے خدشے کے پیشِ نظر کوٹ لکھپت کے پاس واقع جنگل کی زمین جو کہ ۱۹۶۳ ایکڑ تھی اور محکمہ جنگلات کی ملکیت تھی، وہاں ماڈل ٹاؤن کے قیام کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۱۹ء میں دیوان کھیم چند نے ماڈل ٹاؤن کی اسکیم کو عوام کے لئے شائع کیا، ابتداء میں خیال تھا کہ ۱۰۰۰ گھر اور ۵۰۰۰ کی آبادی کے لئے یہ ماڈل ٹاؤن بنایا جائے گا۔ پلاٹ کا سائز چار کنال، ڈھائی کنال اور ڈیڑھ کنال رکھا جائے گا مگر بعد ازاں لوگوں کے اصرار پر پلاٹ سائز بڑھا کر چھ کنال، چار کنال اور دو کنال کر دیا گیا۔ قصور روڈ کی مشرقی جانب اگر کنٹونمنٹ، ایک مستطیل نما رقبہ پر اسکیم تیار کی گئی تھی تو قصور روڈ کی مغربی جانب واقع ماڈل ٹاؤن ایک مربع

قطعہ اراضی پر مشتمل تھا جس کے مرکز میں ایک سو کنال پر واقع گول پارک تھا جس کے کناروں پر دوکانات، اسکول، دفاتر، نرسری، کلب، ہسپتال وغیرہ کے لئے جگہ مختص کی گئی اور پھر بیرونی احاطہ رہائشی اسکیم کے لئے مختص کر دیا گیا۔ آٹھ حصوں میں منقسم یہ رہائشی رقبہ ۹۰۰ پلاٹوں پر مشتمل تھا۔ (۱۵) جہاں تقریباً ۵ فیصد زمین صرف مرکزی پارک کے لئے مختص کی گئی تھی جبکہ اس کے علاوہ بھی چھوٹے چار پارک تھے۔ یہ ہاؤسنگ اسکیم اپنے اندر رہنے والوں کی ہر ضرورت کا سامان بہم رکھتی تھی۔

لندن کہ جہاں دریائے ٹیمز شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے، وہاں سے دیوان کھیم چند ماڈل کالونی کا جو تصور لے کر آیا تھا اور جس کے لئے وہ راوی کے پار شاہدرہ میں جی ٹی روڈ کے کنارے ایک ہزار کنال قطعہ اراضی خریدنا چاہتا تھا، ذرا ایک لمحے کے لئے تصور کیجئے کہ یہ ماڈل ٹاؤن جنوبی سمت واقع ہونے کے بجائے لاہور کی شمالی جانب واقع ہوتا تو شہر لاہور کی نواحی توسیع کی صورتحال ہی بالکل بدل جاتی، بالکل لندن کی طرح دریائے راوی شہر کے بیچوں بیچ بہتا، لندن کی طرح پہلی رنگ روڈ سرکلر روڈ ہوتی اور پھر دوسری رنگ روڈ بند روڈ پر بنائی جاتی اور تیسری رنگ روڈ کالا شاہ کاکو بائی پاس کی جگہ پر تعمیر کی جاتی جو راوی کے پار شاہدرہ ٹاؤن کا احاطہ کرتے ہوئے جنوبی جانب کنٹونمنٹ کے پرے سے گزرتے ہوئے شہر قدیم لاہور کو اپنے مرکزی حصے میں رکھتی تو یقیناً شہر لاہور چاروں جانب برابر فاصلے سے وسعت اختیار کرتا، صرف جنوبی جانب شہر کی توسیع نے بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے۔

برطانوی عہد میں اگر ریلوے کے اعلیٰ ملازمین کے لئے میوگارڈن کی رہائشی اسکیم بنائی گئی تھی تو اعلیٰ سرکاری افسروں کے لئے گورنمنٹ آفیسرز ریذیڈینس (GOR) بنائی گئی، سرکاری ملازمین کے لئے چوبرجی کوارٹر اور وحدت کالونی تشکیل دی گئی۔ جہاں آج بھی سرکاری ملازمین کسمپرسی کی حالت میں کھنڈر نما قدیمی گھروں میں رہائش پذیر ہیں۔

مجموعی طور پر اگر جائزہ لیا جائے تو مغلیہ عہد سے پہلے شہر قدیم کے لوہاری دروازے کے باہر اچھرہ تک آبادکاری ہوئی تھی اور پھر مغلیہ عہد میں بھی یہاں کئی محلّے آباد ہوئے جبکہ مغلیہ عہد میں دہلی دروازے کے باہر شالیمار باغ تک کے درمیانی رقبے میں مغلپورہ، بیگم پورہ، باغبانپورہ جیسی آبادیاں تھیں جہاں شہر کے روساء اور امراء رہائش پذیر رہے۔ برطانوی عہد میں

جنوبی جانب کنٹونمنٹ کی تعمیر کے بعد صاحب لوگوں نے جنوبی جانب رہائش اختیار کی جبکہ ریلوے ورکشاپ کی وجہ سے شہر کی مشرقی جانب جہاں کبھی روساء وامراء رہتے تھے وہاں مزدور اور نوکری پیشہ افراد آباد ہو گئے۔

قیامِ پاکستان (۱۹۴۷ء) تک شہر قدیم کے مشرق مغرب اور جنوبی جانب آبادیاں قائم ہو چکی تھیں، کنٹونمنٹ اور ماڈل ٹاؤن بھی آباد ہو چکے تھے۔ مگر یہاں صرف اعلیٰ طبقے کی اشرافیہ ہی رہائش پذیر تھی۔ کم وبیش تمام سرکاری ادارے اور دفاتر اپر مال روڈ سے لے کر لوئر ماڈل روڈ کی دونوں اطراف تعمیر ہو چکے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد شہر قدیم لاہور کے اندر سے ستر فیصد ہندو آبادی جو کاروبار سے منسلک تھی، چھوڑ کر ہندوستان چلی گئی اور تقریباً اتنے ہی افراد ہندوستان سے آ کر شہر قدیم کے اندر بس گئے۔ نئے لوگوں کے آنے کے بعد شہر قدیم کا کلچر، طرزِ رہن سہن اور تعمیرات سبھی متاثر ہوئیں، نئے آنے والوں کو قدیمی عمارتی اثاثوں سے کوئی غرض نہ تھی لہٰذا جونہی کاروبار بڑھا، تعمیرِ نو کا آغاز ہو گیا تو قدیمی حویلیوں وعمارتوں کو گرا کر ضرورت کے مطابق نئے مکانات بننے شروع ہو گئے، شہر قدیم کے اندرونی بازاروں نے پنجاب بھر کے لئے ایک ہول سیل مارکیٹ کی حیثیت اختیار کر لی، لہٰذا شاہ عالمی بازار، اکبری بازار اور اعظم مارکیٹ میں رہائشی مکانوں کو تجارتی عمارات میں تبدیل کر دیا گیا اور لوگوں نے ایک مرتبہ پھر شہر کے نواح میں رہائشی کالونیوں کی تلاش شروع کر دی۔

پاکستان بننے کے بعد ابتدائی سالوں میں لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ اور لاہور میونسپل کارپوریشن نے سنجیدگی سے شہر، عمارتیں اور سڑکیں بہتر بنانے کے منصوبہ پر عمل درآمد کرنے کے بارے میں سوچا، لہٰذا لوئر کلاس کے لئے شادباغ میں ایک ہاؤسنگ کالونی کا منصوبہ بنایا، اسی طرح مڈل کلاس کے لئے رہائشی سہولتوں کی خاطر سمن آباد میں گھروں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا اور اپر کلاس کے لئے گلبرگ میں قدرے بڑے پلاٹس پر مشتمل کالونی بنائی اور وہاں تعمیر کرنے کے لئے نقشہ جات کی منظوری دی۔ ان رہائشی کالونیوں میں لوگوں کی سماجی سرگرمیوں اور بچوں کے کھیلنے کے لئے خصوصی طور پر پارک کے لئے جگہ مختص کی گئی، اس کے علاوہ مسجد، دوکانات وغیرہ کے لئے بھی پلاٹ مختص کئے گئے مگر جلد ہی محسوس کیا گیا کہ شہریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر مہیا کی گئی سہولیات بہت ہی کم ہیں اور بڑے پیمانے پر شہر کے نواح میں

توسیع کے منصوبے کی ضرورت ہے، اس احساس کے ساتھ ہی دوسرے پانچ سالہ منصوبے (۶۵-۱۹۶۰) میں صدر پاکستان کی خصوصی ہدایت پر گریٹر لاہور کے لئے ماسٹر پلان کی تیاری کا کام شروع ہوا۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ اور لاہور میونسپل کارپوریشن دونوں کے پاس ہی نہ تو ٹیکنیکل عملہ اور نہ ہی آلات تھے کہ اتنے بڑے منصوبے پر عملی طور پر کام شروع کر سکیں لہٰذا کمشنر لاہور کی زیرِ صدارت و رہنمائی فروری ۱۹۶۱ء میں ماسٹر پلان کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے اراکین میں جائنٹ سیکرٹری و ایڈوائزر ٹاؤن پلاننگ، ہاؤسنگ کمیونیکیشن اینڈ ورکس ڈیپارٹمنٹ، چیئرمین لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ، چیئرمین لاہور میونسپل کارپوریشن، چیف انجینئر پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ، چیف انجینئر بلڈنگ اینڈ روڈز سنٹرل ریجن لاہور، ڈائریکٹر آف انڈسٹریز مغربی پاکستان، ٹاؤن پلانر لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ، ڈائریکٹر ٹاؤن پلاننگ لاہور ریجن، اور فوج کے نمائندے شامل تھے۔ مسٹر پی ڈبلیو جی پاوِل (P.W.G. Powell) جو کولمبو پلان کے لاہور میں ایڈوائزر تھے، ان کی خصوصی معاونت شامل رہی۔ اس کے علاوہ پانچ ذیلی کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئیں۔ ماسٹر پلان کمیٹی نے کل ۲۵ اجلاس کئے اور ان میں نئی آبادکاری اور توسیع کے مختلف معاملات، مسائل اور پالیسی کے بارے میں سیر حاصل بحث کی اور کام کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا۔

۱۔ پہلے سے موجود حالات و ذرائع کا جائزہ لینا۔

۲۔ آنے والے مسائل کی پیش بینی۔

۳۔ پلاننگ سٹینڈرڈز کی تشکیل۔

۴۔ مجوزہ ماسٹر پلان کی تیاری

اس وقت ۴۰-۱۹۳۹ء کا تیار کردہ برطانوی عہد کا لاہور کا سروے پلان میسر تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اس پر کوئی کام نہ ہوا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں ہوائی فوٹوگرافی کی مدد سے اس سروے پلان کو موجودہ حالات کے مطابق از سر نو تیار کیا گیا۔

ماسٹر پلان کمیٹی نے تمام ضروری معلومات اکٹھی کر کے مجوزہ ماسٹر پلان ۱۹۶۶ء تک مکمل کر کے حکومت کو پیش کر دیا تھا۔ مگر اس کی باقاعدہ منظوری کے لئے مزید چھ سال لگ گئے۔ دراصل ۱۹۶۵ء کی جنگ نے صورتحال تبدیل کر دی اور ماسٹر پلان پر نظرِ ثانی کے لئے اسے

آرمی کے حوالے کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ گورنر ورکنگ گروپ نے تجزیہ و تنقیدی جائزہ لینے کے بعد درج ذیل سفارشات مرتب کیں۔

۱۔ کنٹونمنٹ کی توسیع کے سبب اور عسکری نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے لاہور کی مزید توسیع فیروز پور روڈ کی مشرقی جانب اور لاہور کنٹونمنٹ کی جنوبی جانب نہ کی جائے۔

۲۔ ریلوے لائن اور فیروز پور روڈ کا درمیانی رقبہ جو کہ مستقبل میں صنعتوں کے فروغ کے لئے مختص کیا گیا ہے، اس کو پارک میں تبدیل کر دیا جائے۔

۳۔ لاہور کی توسیع کی آخری حد بجانب جنوب ٹاؤن شپ تک مقرر کر دی جائے۔

۴۔ جی ٹی روڈ کے ساتھ باغبانپورہ میں مختص کیا جانے والا صنعتی علاقہ کم کر کے عام ضروریاتِ زندگی کی اشیاء سے متعلق صنعتوں تک محدود کر دیا جائے۔

۵۔ راوی روڈ، ملتان روڈ، فیروز پور روڈ اور علامہ اقبال روڈ کو اہم تجارتی شاہراہوں کے طور پر منصوبہ میں شامل کر لیا جائے۔

گورنر ورکنگ گروپ کی مذکورہ بالا تجاویز ۷ جون ۱۹۷۲ء کو وزیراعلیٰ پنجاب کی زیرِ صدارت ہونے والے اجلاس میں ماسٹر پلان میں شامل کر لی گئیں۔ لاہور میونسپل کارپوریشن نے ۱۳ جولائی ۱۹۷۲ء کو ماسٹر پلان فار گریٹر لاہور منظور کر لیا۔ کمشنر لاہور نے میونسپل ایڈمنسٹریٹو آرڈیننس ۱۹۶۰ء کے سیکشن ۴۷ کے تحت ۲۴ جولائی ۱۹۷۲ء کو ماسٹر پلان کو منظور کر کے لاگو کر دیا۔ یوں یکم ستمبر ۱۹۷۲ء کو ماسٹر پلان لاگو کر دیا گیا۔ وزیراعلیٰ پنجاب نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو ٹاؤن ہال میں پریس بریفنگ میں اس ماسٹر پلان کے اہم نقاط پر روشنی ڈالی۔ ماسٹر پلان کی رپورٹ مئی ۱۹۷۳ء میں کتابی شکل میں شائع کر دی گئی۔ جس میں دو بڑے نقشوں میں موجود اور مجوزہ پلان کی تصویر کشی کی گئی تھی۔

ماسٹر پلان فار گریٹر لاہور کی اشاعت کے وقت واضح کر دیا گیا تھا کہ مستقبل میں شہر کی توسیع کے لئے یہ جنرل رہنمائی کے لئے ایک دستاویز ہے اور ہر پانچ سے سات سال کے بعد اس پر نظر ثانی کی جائے گی۔

گریٹر لاہور کے ماسٹر پلان میں درج ذیل اہم فیصلے کئے گئے۔

۱۔ لاہور کی توسیع فیروز پور روڈ اور ملتان روڈ کے درمیانی رقبے بجانب جنوب کی جائے گی۔

۲۔ تجویز دی گئی کہ رنگ روڈ تعمیر کی جائے گی۔ یہ رنگ روڈ لوئر مال سے چوبرجی، چوبرجی سے بہاولپور روڈ پر ہوتی ہوئی مزنگ، جیل روڈ سے شادمان چوک، ریس کورس روڈ سے ڈیوس روڈ اور شملہ پہاڑی، لنڈا بازار سے ہوتی ہوئی دہلی دروازے اور پھر بھاٹی دروازے تک تیار کی جائے گی اور تمام بڑی سڑکوں کو یہاں سے رسائی دی جائے گی۔

۳۔ مال روڈ اور پھر شالیمار لنک روڈ کو دورویہ سڑک بناتے ہوئے کشادہ کیا جائے گا۔

۴۔ انارکلی اور ریگل چوک میں گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے دو عدد کار پارکنگ تہہ خانے تعمیر کئے جائیں گے۔

۵۔ انارکلی اور بیڈن روڈ پر ٹریفک مکمل بند کر دی جائے گی اور صرف پیدل چلنے والے ہی داخل ہو سکیں گے۔ تاہم صبح یا شام تھوڑی دیر کے لئے گاڑیوں کو آنے کی اجازت ہو گی تاکہ دوکاندار اپنا سامان لا سکیں اور لے جا سکیں۔

۶۔ بادامی باغ بس ٹرمینل کے علاوہ نیو یونیورسٹی ڈویژنل سنٹر اور کوٹ لکھپت ڈویژنل سنٹر میں دو مزید بس ٹرمینل تعمیر کئے جائیں گے۔

۷۔ مسافروں کے شہر کی حدود میں سفر کے لئے منی ٹرین چلائی جائے گی۔ جو بادامی باغ ریلوے اسٹیشن سے بند روڈ پر چلتی ہوئی ایک جانب تو شالیمار گارڈن سے ہوتی ہوئی کنٹونمنٹ ریلوے اسٹیشن پر چلی جائے گی اور دوسری جانب بند روڈ سے ملتان روڈ کے متوازی چلتی ہوئی ٹھوکر نیاز بیگ سے پہلے کوٹ لکھپت ریلوے اسٹیشن تک مسافروں کو سفر کی سہولت فراہم کی جائے گی۔

۸۔ والٹن ائیر پورٹ کو مال روڈ کے آخر سینٹ جان روڈ پر منتقل کیا جائے گا۔

۹۔ سنٹرل بزنس ڈسٹرکٹ کو مجوزہ رنگ روڈ کے اندر محدود کر دیا جائے گا۔ تاہم شہر کے لئے چار ڈویژنل سنٹر، نیو یونیورسٹی، کوٹ لکھپت، امر سدھو اور باغبانپورہ میں بنائے جائیں گے۔ ہر سنٹر چار سے چھ لاکھ تک لوگوں کی ضروریات کو پورا کرے گا اور ہر سنٹر میں کم و بیش پانچ سو دوکانیں ہوں گی۔

۱۰۔ چار ڈویژنل سنٹر کے علاوہ ۲۳ ڈسٹرکٹ بنائے جائیں گے ہر ڈسٹرکٹ سنٹر میں ڈیڑھ سو

کے قریب دوکانیں ہوں گی جو ایک لاکھ کی آبادی کے لئے کافی ہوگا۔ ہر ڈسٹرکٹ سنٹر ۱۲۰ تا ۱۵۰ ایکڑ پر مشتمل ہوگا۔ جہاں لائبریری، کالج، سینما، ہسپتال، اسکول، مسجد وغیرہ تمام شہری ضروریات کی عمارتیں موجود ہوں گی۔

۱۱۔ ماسٹر پلان میں کل ۶۰ قصبے (Neighbourhood) تجویز کئے گئے، جو مستقبل میں تیار کئے جائیں گے۔ ہر قصبے میں چالیس تا پچاس دوکانیں ہوں گی اور پچیس ہزار کی آبادی پر مشتمل ہوگا۔ یہاں دوسکول، پولی کلینک، پارک، مسجد، مدرسہ اور لائبریری بنائی جائے گی۔ ہر قصبے کے لئے ۱۵۰ ایکڑ کا رقبہ تجویز کیا گیا۔

۱۲۔ ۶۵۰۰ ایکڑ پر مشتمل تین انڈسٹریل زون تجویز کئے گئے پہلا شالیمار سے پرے باغبانپورہ میں، دوسرا کوٹ لکھپت اور تیسرا ملتان روڈ پر بند روڈ کی توسیع کے ساتھ۔

۱۳۔ رہائشی پلاٹوں کے لئے سات پلاٹ سائز کا تعین فی کس آمدن کی بنیاد پر کیا گیا کہ اس کی قیمت ۲۵ سال تک لوٹائی جا سکے۔ یہ سائز ۲ کنال، ا کنال، ۱۵ مرلے، ۱۰ مرلے، ۷ مرلے، ۵ مرلے اور ساڑھے تین مرلے رکھے گئے۔

۱۴۔ ڈویژن، ڈسٹرکٹ اور قصبے کی سطح پر پارک بنائے جائیں گے اور یوں کل ۴ ڈویژنل پارک، ۲۳ ڈسٹرکٹ پارک اور ۶۱ قصبہ پارک ماسٹر پلان میں ظاہر کئے گئے۔ ان پارک کی دیکھ بھال کے لئے لاہور پارک کمیٹی کی تشکیل کی تجویز پیش کی گئی۔

۱۵۔ تفریح کے مقصد کے لئے ۵۰۰ سیٹ کا سینما ہر سنٹرل ایریا ڈویژن میں تعمیر کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک پوسٹ آفس، ایک ٹیلی گراف آفس، ایک ٹیلی فون ایکسچینج، ایک الیکٹرک سب اسٹیشن، ایک پولیس اسٹیشن، ایک فائر اسٹیشن اور ایک مسجد کی تعمیر کے لئے جگہ مختص کی جائے گی۔

۱۶۔ مجوزہ ماسٹر پلان پر عمل درآمد کے لئے تین عدد پانچ سالہ منصوبے بنائے گئے پہلا منصوبہ ۷۰۔۱۹۶۵ء، دوسرا ۷۵۔۱۹۷۱ء اور تیسرا ۸۰۔۱۹۷۶ء مگر مجوزہ منصوبہ کی منظوری کے انتظار میں ہی چھ سال صرف ہوگئے۔

گریٹر لاہور کے اس ماسٹر پلان میں کنٹونمنٹ بورڈ کو یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ موجودہ کنٹونمنٹ کی جنوبی جانب جہاں توسیع کا ارادہ رکھتے ہیں، اس کی پلاننگ کر کے پلاننگ

اتھارٹی کو بھجوائیں تا کہ اسے بھی گریٹر لاہور کے ماسٹر پلان کا حصہ بنایا جا سکے، چونکہ ڈیفنس سوسائٹی ماسٹر پلان کا حصہ نہ بن سکی یقیناً اسی وجہ سے وہاں رہائش کی بہتر سہولتیں فراہم کی گئیں اور اب یہ سوسائٹی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی بن چکی ہے اور اس نے مثالی رہائش گاہیں اور دیگر رہائشی سہولیات سڑکیں، کمیونٹی سنٹر، پارک، مسجد وغیرہ لاہور کے باسیوں کو فراہم کی ہیں۔

چونکہ اس وقت لاہور شہر کے انتظامی معاملات کے لئے لاہور میونسپل کارپوریشن، لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ، کنٹونمنٹ بورڈ اور ماڈل ٹاؤن کوآپریٹو سوسائٹی اپنی اپنی حدود میں آزادانہ طور پر کام کر رہے تھے۔ ماسٹر پلان بناتے ہوئے اس بات کی ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ ان تمام اداروں کے چیئر مین پر مشتمل کمشنر لاہور کی زیر سربراہی ایک پلاننگ اتھارٹی بنائی جائے جو کلی طور پر لاہور کی مستقبل کی ترقی و توسیع کے منصوبے کو مؤثر طریقے سے عملی جامہ پہنا سکے۔

اس وقت لاہور کی ترقی و توسیع پر اگر طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں کہیں کہیں گریٹر لاہور کے لئے تیار کئے گئے ماسٹر پلان کے اثرات نظر آتے ہیں۔ راوی کے پل سے نیچے کی جانب تعمیر کیا جانے والا سگیاں پل بھی اسی ماسٹر پلان کا حصہ تھا، کالا شاہ کاکو بائی پاس کی تجویز بھی ماسٹر پلان میں شامل تھی، بند روڈ کی ٹھوکر نیاز بیگ تک توسیع کا منصوبہ بھی ماسٹر پلان کا حصہ تھا۔ گلشن اقبال اور جوہر ٹاؤن پارک بھی مجوزہ ماسٹر پلان میں شامل تھا۔ ٹھوکر نیاز بیگ سے شوکت خانم ہسپتال کی طرف جانے والی حالیہ تعمیر کردہ روڈ بھی اسی ماسٹر پلان میں شامل تھی۔

آج اگر پاکستان ہارٹیکلچر اتھارٹی بنائی گئی ہے تو اس کا ابتدائی آئیڈیا ماسٹر پلان فار گریٹر لاہور میں دیا گیا تھا، لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی جو ۱۹۷۵ء میں قائم کی گئی، وہی پلاننگ اتھارٹی ہے جس کا ذکر ہمیں ماسٹر پلان میں ملتا ہے۔ لاہور کی جنوبی جانب توسیع کا مجوزہ منصوبہ بھی اسی ماسٹر پلان کا حصہ تھا مگر جوہر ٹاؤن، ٹاؤن شپ اور علامہ اقبال ٹاؤن تو حکومتی رہنمائی میں بن گئے مگر اس سے آگے کی تمام تر رہائشی اسکیموں کی توسیع جو پلان میں تجویز کی گئی تھی وہ اس انداز سے نہ ہو سکی۔ حکومتی اداروں نے یا پرائیویٹ سیکٹر سے لوگوں نے زمینیں خرید کر مختلف ہاؤسنگ سوسائٹیاں اور کوآپریٹو سوسائٹیز بنا لیں اور پھر خوب کاروبار چمکایا۔ لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا ادارہ کہ جسے یہ تمام ترقیاتی کام اپنی

نگرانی میں کروانے چاہئیں تھے محض اسٹیٹ ایجنٹ کی حیثیت تک محدود ہو کر رہ گیا۔ فائلوں اور پلاٹوں کے اس کاروبار میں توسیعِ لاہور کے خوفناک انجام کے بارے میں سوچنے کے لئے وقت ہی کب کسی کے پاس تھا۔ آج دو سو سے زائد پرائیویٹ ہاؤسنگ سوسائٹیز توسیع لاہور کے کاروبار میں ملوث ہیں، انہوں نے ترقیاتی اداروں کو بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔

اکیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ایک مرتبہ پھر لاہور کی توسیع کے لئے ماسٹر پلان تیار کیا گیا ہے اس کے لئے NESPAK کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جنہوں نے ۱۹۷۲ء کے منظور شدہ گریٹر لاہور والے ماسٹر پلان کی طرز پر تحقیقی مواد اکٹھا کیا ہے اور اس کی بنیاد پر پھیلتے ہوئے شہر میں بسنے والوں کو رہائش کی بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لئے ایک منصوبہ بندی کی ہے پانی کی فراہمی اور سیور کی نکاسی کے لئے شہر کے چاروں اطراف ان مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں سیوریج پلانٹ لگائے جا سکتے ہیں۔ جاپان نے ۲۰۰۶ء میں لاہور کے سیوریج سسٹم کی بحالی کے لئے ۸۷ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کے فنڈز مہیا کئے تھے اس کے علاوہ ۵۱ مشینیں اور کئی ٹرک بھی مہیا کئے گئے ہیں یہ منصوبہ واسا نے جاپان کے ادارے جائیکا کے ساتھ مل کر شروع کیا ہے۔

لاہور میں انڈر گراؤنڈ ریلوے کا منصوبہ بھی منظور کیا گیا ہے جس کا باضابطہ افتتاح ستمبر ۲۰۰۷ء میں صدرِ پاکستان کریں گے۔ یہ منصوبہ ۲۰۱۲ء تک چار مرحلوں میں تکمیل پائے گا۔ صاف پینے کے پانی کے لئے کریم پارک، دھرم پورہ، چونگی امر سدھو، مغل پورہ اور رحمانپورہ میں ۶ بلین کی لاگت سے فلٹریشن پلانٹ لگائے گئے ہیں۔ یہ رقم وفاقی حکومت نے ورلڈ بینک سے قرضہ کی صورت میں لی ہے۔ ہر پلانٹ ایک گھنٹے میں دو ہزار گیلن پانی فلٹر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسی طرح شہر کی سڑکوں کو ۲۰۱۵ء تک کشادہ اور دو رویہ بنانے کی جامع منصوبہ بندی کر کے کام شروع کر دیا گیا۔ لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ کثیر منزلہ عمارتوں کی استحکام اور استقامت کو یقینی بنائے اور تعمیراتی قوانین وضوابط پر عمل درآمد کرواتے ہوئے صرف ان عمارتوں کی تعمیر کی اجازت

دے کہ جن کی منظوری ہو چکی ہے۔ اسی طرح ہر کثیر منزلہ عمارت کی تعمیر سے پہلے پارکنگ کی سہولت مہیا کرنے کو یقینی بنایا جائے۔ گذشتہ پانچ سالوں میں ٦ لاکھ سترہ ہزار گاڑیاں سڑکوں پر آئی ہیں یہی وجہ ہے کہ سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب آ گیا ہے۔ فیروز پور روڈ پر حکومت پنجاب پائلٹ پراجیکٹ شروع کر رہی ہے جہاں پر کمپیوٹرائزڈ سگنل نیٹ ورک قائم کیا جائے گا، بسوں اور بڑی گاڑیوں کے لئے علیحدہ لین مختص کی جائے گی سروس روڈ کو مزید کشادہ کیا جائے گا، تجاوزات کے خاتمے اور پارکنگ کے لئے اقدامات کئے جائیں گے، ڈرائیوروں کو ٹریفک قوانین سے آگاہی کا بندوبست کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا کے علاوہ بے شمار دیگر حکومتی دعوے ہیں جو بے تحاشا بڑھ جانے والے شہر لاہور کے بے قابو ہو جانے والے عفریت کو قابو کرنے کے بارے میں ہر روز کئے جا رہے ہیں مگر اس کے لئے جس جامع اور ٹھوس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے وہ کہیں عملی طور پر نظر نہیں آتی۔ عہد مغلیہ کے باغات کے شہر لاہور نے اس عہد کے حکمرانوں اور عوام کے سامنے بے شمار چیلنج کھڑے کر دیئے ہیں، اس نبرد آزمائی میں کون غالب آتا ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ کنہیالال ہندی ''تاریخ لاہور''، مجلس ترقی ادب لاہور، صفحہ ۵۱

۲۔ ایضاً۔ صفحہ ۵۲

۳۔ ایضاً۔ صفحہ ۵۴

۴۔ محمد باقر، ''Lahore - Past & Present'' دہلی، صفحہ ۳۱۷۔۳۱۰

۵۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ''لاہور۔۔۔ سکھوں کے عہد میں'' پرنٹ لائن پبلشرز لاہور ۲۰۰۰ء، صفحہ ۸۷ تا ۹۵

٦۔ کنہیالال ہندی ''تاریخِ لاہور''، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۹٦ء، صفحہ ۱۲۳

۷۔ کنہیالال ہندی ''تاریخِ لاہور''، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۹۴ء، صفحہ ۷۹

۸۔ ایضاً۔ صفحہ ۸۲

۹۔ ایضاً۔صفحہ۸۲

۱۰۔ ایضاً۔صفحہ۸۰

۱۱۔ پرویز وندل، ساجدہ وندل ”Raj, Lahore & Bhai Ram Singh“ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور۲۰۰۶ء، صفحہ۶۳

۱۲۔ ایضاً۔صفحہ۶۶

۱۳۔ ایضاً۔صفحہ۶۸

۱۴۔ پرویز وندل، ساجدہ وندل ”Raj, Lahore & Bhai Ram Singh“ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور۲۰۰۶ء، صفحہ۸۳

۱۵۔ ایضاً۔صفحہ۸۸

بدلتے معاشرتی تناظر میں گھر کی ہیئت

ڈاکٹر غافر شہزاد

گھر تعمیر کرنا مہذب معاشرے میں فرد کی ایک منضبط سرگرمی ہے۔ گھر کے طرزِ تعمیر میں نہ صرف مکینوں کا رہن سہن، تہذیب وثقافت اور موسموں کی نوعیت کا پتہ ملتا ہے بلکہ انسان کے جمالیاتی ذوق کی عکاسی بھی جھلکتی ہے۔ تعمیراتی عمل میں جہاں انسان تخلیقی اور جمالیاتی سطح پر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے وہاں روزمرہ کی بنیادی ضرورتوں اور موسمیاتی آسائشوں کے حصول کیلئے بھی سرگرم عمل نظر آتا ہے اس لحاظ سے گھر کی تعمیر میں ضروریاتی اور جمالیاتی ہر دو سطحوں پر ایک توازن قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک گھر اپنے مکینوں کو دو بنیادی سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

۱۔ دن کے وقت سرانجام دی جانے والی سرگرمیوں کیلئے نقطہ آغاز۔

۲۔ رات کے اندھیرے میں جائے پناہ۔

چار دیواروں اور ایک چھت کے نیچے رہنے والوں کیلئے تحفظ کا احساس، پرسکون اور متوازن زندگی گزارنے کیلئے ایک انتہائی لازم شے ہے۔ اسی وجہ سے تو گھر کو پناہ گاہ، جنت، گوشہ سکون، کنج راحت وغیرہ قرار دیا گیا ہے۔ کوئی فلاسفر گھر کیلئے (Asylum) کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کوئی گھر کو چھوٹا قلعہ (Fortress) قرار دیتا ہے۔

انسانوں نے جب سے مل جل کر رہنا شروع کیا ہے ان کی بنیادی ضرورتوں میں گھر کی تعمیر اولین ترجیح رہی ہے۔ مقصد وہی تھا کہ شدید موسمی حالات سے، وحشی جانوروں سے اور بیرونی حملہ آوروں سے تحفظ حاصل کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں انسانوں نے اپنی

مقدور بھر ذہانت اور تجربہ کے بل پر محدود ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے گھر کی تعمیراتی ضرورت کو ہمیشہ احسن طریق سے پورا کیا ہے تاکہ آرام و آسائش' پرائیویسی' آزادی' استراحت اور افراد خانہ' رشتہ داروں و دیگر افراد کے ساتھ سماجی سطح پر بہتر تعلقات استوار رکھے جاسکیں۔اس لحاظ سے گھر کو ہم رہنے والوں کے طرز زندگی' ان کی مہارت و ذہانت' ان کی تکنیکی ترقی اور تعمیراتی صلاحیتوں کا مظہر قرار دے سکتے ہیں۔آج کے جدید تر ترقی یافتہ دور میں نئے گھروں کی تعمیر کو ہم ماہرین فن تعمیرات کی امیدوں' خواہشوں اور خیالی دنیا کی تخلیق کا اظہار بھی کہہ سکتے ہیں۔گھروں کی تعمیر میں آج زندگی کے مختلف طبقہ ہائے فکر سے منسلک لوگوں کے خوابوں کا عکس بھی جھلکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ گھروں کی تعمیر دیگر غیر رہائشی عمارتوں کے موازنے میں زیادہ ذہانت اور شفاف سطح پر لوگوں کی خواہشات' خواب' سماجی ضرورتوں اور نت بدلتے طرز زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

آج گھر کا تصور چاردیواروں اور ایک چھت سے کہیں زیادہ ہے آج کا گھر ایک خاندان کی سماجی و نجی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز و منبع ہے افراد خانہ کی روزمرہ کی مخصوص سرگرمیوں کیلئے جگہ مہیا کرتا ہے اور ان سرگرمیوں کو احسن طریق سے سرانجام دینے کیلئے ہر لازم سہولت فراہم کرتا ہے۔خوشگوار اور پرسکون ماحول' آرام و آسائش' تفریح' خاندان کے افراد کا باہمی میل جول و رابطہ' تعلق اور سماجی سطح پر اپنے گردوپیش کے ساتھ خاندان کے تعارف کا سبب بنتا ہے۔

گھر کی تعمیر کا معاملہ ایک دن کا قصہ نہیں ہے بلکہ صدیوں کے تسلسل پر محیط سفر ہے۔اول اول انسان نے جنگلی درندوں اور شدید موسموں سے تحفظ کیلئے قدرتی غاروں میں پناہ لی اور وہیں اس کے ذہن میں گھر بنانے کا خیال پیدا ہوا اور پھر تعمیر کا ایک سلسلہ چل نکلا۔

قدیم لاہور کی آبادی کے زمانے کے تعین کیلئے ٹھوس شواہد موجود نہیں ہیں اور جو شواہد ملتے ہیں ان کے مطابق شہر کی قدیم آبادی ایک ہزار سال پہلے موجود تھی اور اس کا آغاز ایک اندازے کے مطابق اس سے بھی پانچ سات سو سال قبل ضرور ہوا ہوگا۔محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۹۵۹ء میں قلعہ لاہور کے اندر ۶۳ فٹ کی گہرائی تک کھدائی کی۔ان شواہد کے مطابق ۳۵ فٹ کی گہرائی تک پرانے عمارتی سامان تعمیر کے آثار ملتے ہیں۔ابتدائی چار فٹ کی کھدائی تک سکھوں اور انگریزوں کے ادوار میں ہونے والی تباہی و بربادی' جبکہ ۱۴ فٹ کی گہرائی تک مغلیہ

عہد میں تعمیر ہونے والی عمارات کے ملبہ کے آثار موجود ہیں البتہ ۳۵ فٹ کی گہرائی پر مغل دور سے پہلے کے لاہور کے ملبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۶۳ فٹ کی گہرائی پر بنجر زمین ملتی ہے۔ PEPAC نے اپنی جو تحقیق "Walled City of Lahore" نامی کتاب میں شائع کی اس کے مطابق لاہور کی ابتدائی آبادی اندرون شہر کے مرکزی حصہ لنگاہ منڈی کو قرار دیا گیا ہے جہاں گمٹی بازار ہے اور یہ حصہ قلعے کی جنوبی جانب ہے۔ یہ شہر کا بلند ترین علاقہ ہے اور اگر قدیم شہروں کی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو پورے وثوق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شہر کے اسی حصہ میں اول اول لاہور کے قدیمی باشندوں نے رہائش اختیار کی ہوگی۔

شہر کے گرد فصیل کب بنی، اس بارے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ اکبر بادشاہ (۱۵۹۸-۱۵۸۴) نے جب لاہور کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا تو اس نے پہلی مرتبہ کچی فصیل کو پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا۔ اس سے قبل گارے کی دیوار کی موجودگی کی تصدیق ہوتی ہے۔

جہاں تک فصیل سے باہر لاہور کی آبادی کی بات ہے تو اس سلسلے میں کنہیا لال ہندی اپنی کتاب ''تاریخ لاہور'' مطبوعہ ۱۸۸۴ء میں رقم طراز ہے:

> ''واضح ہو کہ بیرونی آبادی لاہور کی شاہ ہمایوں کے عہد سے شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ بہ سمت جنوب و جنوب مشرق و مشرق شہر آباد ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اصل شہر سے دو چند شہر آباد ہوگیا۔''

بیرونی آبادکاری کے بارے میں ایچ آر گولڈنگ نے اپنی کتاب ''اولڈ لاہور'' مطبوعہ ۱۹۲۴ء میں تحریر کیا ہے:

> ''شہر کے نواح میں کئی انفرادی بستیاں آباد تھیں جو شہر کے دروازوں کے ساتھ سجے بازاروں سے جڑی ہوئی تھیں۔ درمیانی راستوں اور رقبوں پر مزارات، مساجد اور باغات تھے۔''

جب ایک مرتبہ پختہ فصیل بن گئی اور داخلے کیلئے تیرہ دروازے تعمیر کر دیئے گئے تو افقی انداز میں شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کا پھیلاؤ ممکن نہ رہا لہذا ایک منزلہ مکان دو منزلہ، دو منزلہ مکانات تین منزلہ حتی کہ پانچ منزلوں تک مکانوں کی تعمیر ہوئی۔ مختلف ادوار میں مختلف حملہ آور شہر کو لوٹتے رہے۔ عمارات کو گراتے رہے اور یوں ملبہ پر نئی عمارات تعمیر ہوتی رہیں

اوران عمارات کے سطحی نقشے میں وقت اور رہنے والوں کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو صدیوں سے چلتا آ رہا ہے اور آج بھی جاری ہے۔

نقوش کے لاہور نمبر میں منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں:

''لودھی بادشاہوں کی حکومت کے زمانے میں نادر خان نامی ایک امیر نے جب اپنی حویلی محلہ رڑہ میں اس قبر سے متصل تعمیر کرائی تو اس کے گرد ایک حجرہ خشتی تیار کرا کر اس (مزار سید صوفؒ) کو اپنی حویلی کے وسیع احاطے کے اندر لے لیا وہ حویلی شاہجہان کے زمانے تک موجود تھی نواب وزیر خان نے اس کے وارثوں سے وہ حویلی خریدی اور یہاں مسجد تعمیر کرائی اور مزار کو نئے سرے سے تعمیر کرا کر موجودہ شکل دے دی۔'' (صفحہ ۱۷۵)۔

اس کتاب میں ایک دوسری جگہ دیکھئے:۔

''سکھوں کے عہد میں وزیر خان چوک میں اکثر لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کر لئے جس سے مسجد کی نمائش اور زیب و زینت میں فرق آ گیا اس لئے ۱۸۵۰ء میں چوک کے اندرونی مکانات سرکاری حکم سے گرا دیئے گئے اور چوک کو پھر وسیع میدان بنا دیا گیا۔'' (صفحہ ۱۷۶)۔

ایک اور جگہ پر نقوش لاہور نمبر میں دیکھئے:

''مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جب راجہ سوچیت سنگھ ڈوگرہ نے قلعہ کے نزدیک اپنی حویلی بنانے کا ارادہ کیا تو اس باغ اور مقبرہ کے سوا اس کو کوئی جگہ نہ ملی۔ مقبرہ پر تو نظر عنائیت رہی البتہ احاطہ مزار کے دوسرے مکانات اور باغ منہدم کرا کر ایک عالیشان حویلی تعمیر کر دی گئی۔'' (صفحہ ۳۲۷)

شہر پناہ کے اندر مکان گرتے رہے، حویلیاں بنتی رہیں پھر یہ حویلیاں مکانات میں بدلتی رہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس دوران فصیل سے باہر نواح میں بھی آبادیاں بڑھتی رہیں۔

ان آبادکاریوں کے کئی محرکات تھے۔ پہلا محرک تو وہ اولیائے کرام تھے جو تبلیغ اسلام کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے اورانہوں نے شہر سے باہر قیام کیا۔ان بزرگوں میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت پیر مکی، حضرت میاں میر، حضرت شاہ چراغ، شاہ ابوالمعالی، حضرت موج دریا، شاہ علی رنگریز، مادھولال حسین، حضرت ایشاںؒ حضرت میاں وڈا اور بے شمار دیگر علماء اکرام اور بزرگ لاہور کے نواح میں قیام پذیر ہوئے تو آہستہ آہستہ ان کے قرب و جوار میں آبادیاں بسنے لگیں۔

شہر کے نواح میں دوسری آبادکاری کا محرک لاہور کے حکمران تھے جو کسی بھی شخص سے خوش ہوکر شہر سے باہر زمین دے دیتے تھے جیسے رنجیت سنگھ نے مہر محکم دین سے خوش ہوکر نواں کوٹ کی زمین و جاگیر اسے عطا کردی۔

قدیمی شہر کی فصیل کے تیرہ دروازوں کے باہر بے شمار تکیئے تھے جہاں شہر کے مکین صبح سے شام تک وقت گزاری کیلئے مختلف طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے، اکثر تکیوں میں اکھاڑے تھے جہاں پہلوان کشتیوں کے مقابلے کرتے، علمی و ادبی محفلیں ہوتیں، قصہ گو نت نئے قصوں کے ساتھ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز رکھتے گویا یہ تکیئے شہر کے باسیوں کیلئے کمیونٹی سنٹر کا کردار ادا کرتے تھے۔

جہانگیر کے عہد میں شیخ محمد طاہر قادری نقشبندی شہر سرہند سے لاہور آئے اور موضع مزنگ کے قریب جگہ جو قبرستان میانی صاحب کے نام سے جانی جاتی ہے، رہائش اختیار کی۔ آپ نے مدرسہ قائم کیا۔آپ کی وفات کے بعد بھی یہ مدرسہ چلتا رہا۔ غارت گروں نے جب اس کو لوٹا تو ہزاروں قرآن و کتابیں ساتھ لے گئے بعدازاں ان کتابوں کو جنس ناکارہ سمجھ کر آگ لگادی اور محلے کو جلادیا۔مزار و مدرسہ آج بھی موجود ہے مگر بعد ویرانی محلے کے لوگوں نے اس جگہ کو قبرستان بنادیا۔

قدیمی شہر کے نواح میں لوگ زراعت کے پیشے سے وابستہ تھے۔اناج بوتے، جانور پالتے اور یوں زندگی کا سلسلہ چلتا رہتا۔اندرون شہر میں زراعت کیلئے زمین میسر نہ تھی صرف اشیاء کی خرید وفروخت کا سلسلہ باقی رہ جاتا تھا لہذا گھروں کے ساتھ دوکانات کی تعمیر ایک قدرتی عمل تھا۔سکھوں اور انگریزوں کے عہد سے قبل تجارت کے پیشے سے اتنے زیادہ لوگ

منسلک نہیں تھے ان ادوار میں تو سوائے تجارت کے اور کوئی ذریعہ روزگار بچا ہی نہ تھا۔

انہی پیشوں میں ایک پیشہ پرانی عمارتوں کی اینٹیں فروخت کرنے کا بھی تھا جس کے ساتھ زیادہ تر کشمیری وابستہ تھے سکھوں اور انگریزوں کے عہد میں نئی عمارات کی تعمیر کیلئے پرانی اینٹ بکثرت استعمال ہوئی۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے بعد جب مکانات اور کھنڈر کے وارث موجود نہ رہتے تو ان کھنڈرات کی بنیادوں سے برآمد ہونے والی اینٹیں نکال کر بیچنے کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یوں بھی کھدائی کے دوران کئی لوگوں کو دفینے ہاتھ لگتے تھے اس وجہ سے بھی کئی کئی فٹ گہری بنیادیں کھود کر اینٹیں برآمد کی جاتیں اور پھر دوسرے حصوں میں تعمیر نو کے لئے ان اینٹوں کو فروخت کر دیا جاتا۔

محمد سلطان ٹھیکیدار کے بارے میں کنہیا لال ہندی نے تاریخ لاہور میں لکھا ہے:

> ''عمارات بھی اس نے بہت کیں مگر پرانی مسجدیں اور عمارتیں عہد شاہان سلف کی اس نے بہت گرائیں اور یہ کام اس نے صرف اینٹ کی طمع سے کیا۔'' (صفحہ ۳۹۰)

آج اندرون لاہور میں جو گھر ایستادہ ہیں تو یہ دراصل اسی تعمیر در تعمیر کے سلسلے کا تسلسل ہے۔ وقت اور بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی تناظر نے جہاں ان کی ظاہری شکل و شباہت کو تبدیل کیا ہے وہاں ان کے اندرونی خدوخال بھی بدل چکے ہیں۔

فصیلوں کے اندر نمو پانے والے شہروں کے ارتقائی سفر کو اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو کئی باتیں ایسی سامنے آتی ہیں جو ان فصیلوں کے اندر تعمیر ہونے والی عمارتوں اور لوگوں کے طرز رہن سہن کو جدید آبادیوں سے مختلف' منفرد اور ممتاز بناتی ہیں۔ ان شہروں کی تشکیل نامیاتی انداز میں ہوتی ہے اور چونکہ افقی انداز میں پھیلاؤ ممکن نہیں ہوتا لہذا تعمیر و تجاوزات کا سلسلہ عمودی سمت میں ہوتا ہے چند مرلوں پر محیط ان گھروں کی اکثریت ایک دوسرے میں پیوست ہوتی ہے۔

اندرون لاہور کے ان باہم پیوست گھروں تک لانے والی تنگ' بل کھاتی ہوئی اور بعض اوقات اچانک ہی ختم ہو جانے والی گلیاں اپنی ہئیت' انداز اور منظر نامہ کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہیں۔

فصیل کے اندر بسے قدیمی شہر میں داخل ہونے کیلئے کل تیرہ دروازے ہیں اور ان دروازوں سے کشادہ گلیاں شہر کے وسط کی طرف بڑھتی ہیں اور زیادہ تر رنگ محل کے وسطی علاقے میں آکر ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ اکبر کے زمانے میں شہر کو چھتیس گزروں میں تقسیم کیا گیا تھا ان میں سے نو گزر قدیمی شہر کے اندر تھیں اور بقیہ ستائیس فصیل کے نواح میں واقع تھیں۔ یہ گزرہی دراصل شہر کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتی تھیں اور ان سے قدرے درمیانی گلیاں ان گزروں کو محلوں میں تقسیم کرتی تھیں اور پھر یہ محلے کوچوں اور گلیوں میں تقسیم ہو کر اپنی الگ شناخت بناتے تھے۔ بل کھاتی ہوئی یہ گلیاں کہیں تو ہموار ہو جاتی ہیں کہیں ڈھلوان دار' کہیں تنگ' کہیں کشادہ' اور یوں پیدل چلنے والوں کو جالی دار نمونے جیسی یکسانیت دیکھنے کے بجائے دلچسپ منظر نامہ نظر آتا ہے۔ شہر میں کہیں یہ گلیاں اتفاقاً قائمۃ الزاویہ ہوں تو ہوں وگرنہ اس کے لئے کہیں اہتمام نظر نہیں آتا۔ دراصل گلیوں کی یہ نامیاتی تشکیل بھی تعمیر وتخریب کے تسلسل کا ہی حاصل ہے۔ ہر لحظہ بدلتا ہوا منظر نامہ پاپیادہ لوگوں کو وقت اور فاصلے کے احساس سے ماورا رکھتا ہے اور یوں اندرون شہر چلتے ہوئے' روزمرہ سرگرمیاں سرانجام دیتے ہوئے' بعض اوقات چلنے والے میلوں کا سفر کر جاتے ہیں اور ان کو تھکاوٹ اور اعصابی تناؤ کا احساس تک نہیں ہوتا۔ نامیاتی انداز سے تشکیل پانے والی انہی بل کھاتی تنگ اور غیر ہموار گلیوں میں اندرون شہر کی روزمرہ زندگی کی متحرک سرگرمیوں سے شہر کو زندگی ملتی ہے۔

شہر میں پاکستان بننے سے پہلے تک ہندو سکھ اور مسلمان تین مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی معاشرتی' مذہبی اور نجی زندگی کے بے شمار تہوار' رسومات اور تقریبات کا سلسلہ سارا سال چلتا تھا ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں بھی پر جوش شرکت کرتے تھے مگر ایسا بہت کم ہوتا کہ کوئی مذہبی ٹولہ کسی مسئلے کو بنیاد بنا کر کوئی بدمزگی پیدا کرتا۔ عیدیں' میلے' شب برات' بسنت' ہولی' دسہرہ کے تمام تہوار جوش وجذبے سے منائے جاتے۔ بسنتی چولے پہنے ہندو لڑکیاں چھتوں پر بسنتی رنگوں کی بہار لے آتیں۔ ہولی کے تہوار میں گھر گلیاں اور لوگ منقش ہو جاتے۔ گرمیوں میں بارش لانے کیلئے مختلف ٹونے ٹوٹکے آزمائے جاتے۔ اندرون لاہور کی سماجی زندگی کی رنگارنگی کا یہ عالم

تھا کہ یہ بات مشہور ہوگئی ''ست دن تے اٹھ میلے......کم کراں میں کیہڑے ویلے''۔

تھڑا کلچر کے حوالے سے اندرون شہر کی مجلسی زندگی کے بارے میں یونس ادیب اپنی کتاب ''میرا شہر لاہور'' کے صفحہ ۲۱۶ پر لکھتے ہیں:

''گھروں کی بیٹھکیں صرف مہمانوں اور تقریبات کیلئے مخصوص تھیں اور اوپن یونیورسٹی اگر تھی تو اندرون شہر کی دکانوں کے تھڑے اور حمام تھے۔ اندرون شہر میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی پہلی درس گاہ تھڑا تھی شامیں سردیوں کی ہوں یا گرمیوں کی، گلی اور محلے کے بچے اپنی شامیں تھڑوں پر گزارتے۔ گلی محلے کے تھڑے معلومات اور خبروں کے تبادلے کا اہم ترین مرکز تھے یہاں ہر قسم کی بات چیت ہوتی اندرون شہر کی ٹھہری ٹھہری سی مجلسی زندگی میں تھڑوں کا کردار بڑا تیز رفتار تھا طلاقوں، شادیوں، چوریوں، تانک جھانک، اتار چڑھاؤ جھگڑے اور مسئلے مسائل تھڑوں پر ہی زیر بحث آتے تھڑا مجلس کا دائرہ پورے شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ دن کے وقت ان تھڑوں پر چوپٹ تاش اور شطرنج کھیلی جاتی۔ تھڑوں پر بیٹھنے والے گالیوں میں ماسٹر ہوتے تھے لاہوریئے اپنی گالی کے انداز اور اسلوب میں بڑے یکتا تھے گالیوں میں قافیہ ردیف اور باقاعدہ ردھم ہوتا۔''

کنوؤں کے حوالے سے یونس ادیب لکھتے ہیں:

''لاہور میں بعض کنویں اپنے ٹھنڈے پانی کی وجہ سے بہت مشہور تھے ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے کنویں الگ الگ تھے۔ بعض گلیاں چھتی ہوئی ہوتیں تھیں اور گرمیوں کی دوپہر میں عورتیں گھروں سے نکل کر ان گلیوں میں پیڑھی بچھا کر بیٹھ جاتیں کیونکہ یہ گلیاں بند تھیں اور ان میں کسی غیر مرد کا گزرنا ناممکن تھا۔ (صفحہ ۱۱۲)۔

اندرون لاہور کی تنگ بل کھاتی گلیوں اور دروازوں سے اندر داخل ہوتی کشادہ سڑکوں کے دونوں اطراف بسنے والوں کے مکانات ایستادہ ہیں۔ ان مکانات کی تعمیر کے

انداز اور گھروں کے اندر کمروں کی تقسیم بھی اپنا الگ تشخص بناتی ہے۔ شہر کے یہ حصے تجارتی مرکز بن چکے ہیں ان کی زیریں منزلیں دوکانات کیلئے مخصوص ہو چکی ہیں ان دوکانات میں سے کسی ایک کونے سے زینہ بالائی منزلوں کی طرف جاتا ہے۔ پرانے گھروں میں یہ زینہ ڈیوڑھی سے اوپر جاتا ہے اور اس ڈیوڑھی سے زیریں منزل کے کمروں کو راستہ بھی ملتا تھا۔ قدرے بڑے گھروں کی زیریں منزل کے مرکزی حصے میں صحن کا ہونا لازم تھا جہاں چاروں طرف بچھے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ یہ صحن ان کمروں تک روشنی اور ہوا کا ذریعہ ہوتا تھا۔ زیادہ تر گھروں میں زیریں منزلیں صرف بیٹھکوں کیلئے مختص تھیں جہاں صرف خاندان کے مرد بیٹھتے تھے اور خواتین بالائی منزلوں پر رہائش پذیر ہوتی تھیں اپنی ہیئت کے اعتبار سے گھروں کے قطعات اراضی مربع یا مستطیل شکل کے نہ تھے بلکہ جیسے جیسے جگہ ملتی جاتی یا قطعات تقسیم ہوتے جاتے، گھروں کی تعمیر ہوتی رہتی یہاں تک کہ پرانے گھروں میں کمروں کی اندرونی جگہوں کو مربع یا مستطیل بنانے کیلئے بسا اوقات دیواروں کی موٹائی کا سہارا لیا جاتا۔ ہر گھر کا پلاٹ تین طرف سے ہمسایہ مکانوں میں پیوست ہوتا اور صرف چوتھی سمت جو گلی کی طرف کھلتی تھی، وہاں سے ہی روشنی اور ہوا کا حصول ممکن تھا۔ دوسری صورت مرکزی صحن کی تھی جو محض بڑے رقبوں پر مشتمل گھروں کیلئے ممکن تھا۔ گھروں کی تعمیر تمام کے تمام قطعہ اراضی پر کی جاتی اور کسی طرف کوئی خالی جگہ نہ چھوڑی جاتی۔

جوں جوں شہر تجارتی مرکز بنتا گیا تو دوکانات کی ضرورت بڑھتی گئی حتیٰ کہ اکثر گھروں کی زیریں منزلیں صرف دوکانات کیلئے مختص ہو گئیں اور سیڑھی کسی ایک کونے سے بالائی منزلوں تک پہنچنے کا وسیلہ بننے لگی۔ سیڑھی کا زیریں منزل سے کوئی واسطہ نہ رہا اور بعض اوقات صرف ایک آدھ کمرہ تک رسائی سیڑھی والی ڈیوڑھی سے ملتی ہے۔ رہائشی مقاصد کیلئے بالائی منزل ہی مخصوص ہو کر رہ گئی۔ ان گھروں کے کمروں کے استعمال کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی تھی اور کھانا پکانے، سونے، مل بیٹھنے کیلئے کمروں کے استعمال کو مختص نہیں کیا گیا تھا۔ یہ استعمال کی تخصیص تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ البتہ ان گھروں کی پہلی منزل کے بعد مرکزی صحن یا مگھ کا آغاز ہوتا جہاں سے روشنی اور ہوا کمروں میں داخل ہوتی۔ بغیر کسی تناسب کے جڑے ہوئے ان کمروں پر مشتمل یہ گھر اپنے بیرونی منظر نامہ میں ضرور کچھ نہ کچھ جیومیٹری، ردھم، توازن

لئے ہوتے اس لحاظ سے افقی اور عمودی سطحوں میں حسن تضاد پایا جاتا ہے اور یوں عموماً جھروکوں اور بالکونیوں کا تناسب اور حسن گھر کی بیرونی زیبائش کا ضامن بنتا ہے۔ اگر چہ کمروں کے استعمال کی کوئی تخصیص نظر نہیں آتی پھر بھی ہم ان مختلف کمروں کو اپنی سہولت کیلئے نام دے سکتے ہیں۔ وہ داخلی دروازہ جہاں سے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور سیڑھیوں سے بالائی منزلوں تک رسائی ملتی ہے اس کو ڈیوڑھی کہہ سکتے ہیں یہ محض رسائی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ گھروں میں اس حصے کی موجودگی لازم ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس سے گھر کا بیرونی دنیا سے رابطہ بنتا ہے جہاں گھر اور گلی کی حد بندی ہوتی ہے اندرون لاہور کی گلیاں رہنے والوں کی ذاتی ملکیت ہی تصور کی جاتی ہیں اور وہ اپنی مرضی سے ان کو استعمال کرتے ہیں۔ گھر کے اس حصہ میں آمد و رفت کی یلغار رہتی ہے یہیں سے ٹریفک تقسیم ہوتی ہے۔

گھر کے مرکزی حصہ میں واقع کھلا صحن یا پھر مگھ ہوا اور روشنی کا ذریعہ ہے۔ یہیں گھر کے تمام کمروں کے دروازے کھلتے ہیں عام طور پر کمروں پر کمرہ بنائے جاتے ہیں بعض اوقات زیریں منزل کے دو کمروں کو ملا کر بالائی منزل پر قدرے بڑا کمرہ بنالیا جاتا ہے وگرنہ کم و بیش سبھی گھروں میں تمام بالائی منزلیں نقشے کے اعتبار سے ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ جوں جوں خاندان کے افراد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کمروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جو حتمی طور پر پوری منزل کے اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

اس کے بعد گھر میں سرانجام پانے والی سرگرمیوں کے اعتبار سے گھر کی چھت اہم ترین حصہ ہوتی ہے جہاں کھلی چھت کے علاوہ ہمیں برساتی کمرہ بھی نظر آتا ہے جو تین اطراف سے عموماً بند ہوتا ہے اور چوتھی طرف سے کھلا ہوتا ہے یہ برساتی جہاں برسات کے دنوں میں سامان اسٹور کرنے اور سونے کیلئے استعمال ہوتی ہے وہاں گھریلو زندگی میں اس کا استعمال اپنے اندر بہت جہات لئے ہوئے ہے۔ چھتوں کی منڈیریں عموماً چار پانچ فٹ اونچی ہوتی ہیں اور عموماً گلی کی طرف منڈیر کے ساتھ شاہ نشین بنایا جاتا ہے۔ شاہ نشین در اصل چھت کی سطح سے دو تین فٹ بلند اور تین چار فٹ چوڑا ایک پلیٹ فارم ہوتا ہے جہاں سردیوں کی دو پہریں اور گرمیوں کی شامیں افراد خانہ گزارتے ہیں۔ گلی کی طرف اس لئے

رکھتے ہیں کہ اس سے نیچے گلی کا منظر دور تک نظر آتا ہے اور یوں متحرک زندگی سے ربط قائم رہتا ہے۔ چھت سے اونچا اس لئے رکھتے ہیں تا کہ جگہ کے استعمال کی تخصیص ہو سکے۔

تپتی گرمیوں کی راتوں میں چھت پر سونا' سردیوں کی دوپہروں میں دھوپ کی حدت سے لطف اندوز ہونا چھتوں پر ہی ممکن ہے اس کے علاوہ کبوتر بازی اور پتنگ بازی' اندرون شہر کی زندگی کے دو اہم ترین اشغال چھت پر ہی سرانجام پاتے ہیں۔ چھت کے علاوہ جھروکہ یا بالکونی ایک ایسا لازمی حصہ ہوتا ہے جہاں خواتین اپنے ہمسائیوں سے تبادلہ خیال کرسکتی ہیں۔ سماجی زندگی کو بھرپور بنانے کیلئے دن کا کچھ وقت ضرور ان بالکونیوں پر تبادلہ خیالات کیلئے گزرتا ہے۔ یہ بالکونی نہ صرف گھروں کے بیرونی منظر نامہ کے جمالیاتی حسن میں اضافہ کا سبب بنتی ہے بلکہ محلے کی دیگر خواتین کے درمیان سماجی تعلقات کی استواری' دکھ سکھ میں شرکت اور روزمرہ کی چٹ پٹی خبروں کے تبادلہ میں بھی معاونت کرتی ہے۔

سکھوں کے دور حکومت تک اندرون لاہور کے مکانات کی تعمیر نو کی طرف لوگوں کی زیادہ تر توجہ رہی اگر چہ اس دوران بیرون لاہور آبادیوں کی ضخامت بڑھ چکی تھی اور شہر سے باہر بھی خاصی آبادی موجود تھی مگر بیرون لاہور تعمیر و ترقی کا اصل آغاز ۱۸۴۹ء میں ہوا جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کرلیا اور شہر کا تمام انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ باضابطہ طریقے کے ساتھ مغربی طرز رہن سہن اور معاشرت کے اثرات کا آغاز ہوا۔ انگریزی عہد میں شہر سے باہر چھاؤنی بنائی گئی اور پھر شہر کو اس چھاؤنی سے ملانے کیلئے پہلے ٹھنڈی سڑک اور بعد ازاں دیگر سڑکوں کی تعمیر ہوئی۔ مال روڈ کے قرب و جوار میں تعلیمی اداروں' کورٹ' کالج' اور سرکاری دفاتر کیلئے عمارات بنائی گئیں۔ پنجاب یونیورسٹی' لاہور میوزیم' ٹولنٹن مارکیٹ' تار گھر' جنرل پوسٹ آفس بلڈنگ' پوسٹ ماسٹر جنرل آفس بلڈنگ' چیف کورٹس' اسمبلی ہال' گورنمنٹ ہاؤس' لارینس ہال' ایچی سن کالج جیسی اہم' بڑی اور منفرد عمارات کی تعمیر نے پہلی مرتبہ لوگوں کو فصیل سے باہر نکل کر بیرون لاہور کی بستی میں رہنے کی ترغیب دی۔

انگریزی دور اقتدار میں دوکاندار' تاجر اور بابوؤں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ یہ لوگ خوشحال تھے اور بہتر معیار زندگی خریدنے کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اندرون لاہور کی گندی

بدبودار گلیوں، ہوا اور روشنی سے محروم مکانوں میں رہنے کیلئے تیار نہ تھے لہذا جدید تقاضوں سے ہم آہنگ رہائشی کالونیوں کی فراہمی کی اشد ضرورت پیدا ہوئی اور یوں ایک نئی قسم کی گلیوں، گھر اور رہائشی سہولتوں کی فراہمی کا آغاز ہوا۔ انگریزی دور میں مسلمانوں کیلئے اسلامیہ پارک، فاروق گنج، گڑھی شاہو اور محمد نگر جیسی بستیاں بسائی گئیں جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کیلئے گوالمنڈی، کرشن نگر، رام نگر اور سنت نگر جیسی بستیاں بسائی گئیں۔

پانی، نکاسی فضلات اور بجلی کی سپلائی کیلئے ضروری تھا کہ نئی آبادیوں کی گلیاں سیدھی، کھلی اور باہم قائمتہ الزاویہ رکھی جائیں۔ لہذا بل کھاتی ہوئی تنگ گلیوں کے مقابلے میں کشادہ، پختہ اور بڑی سڑکوں کی تعمیر لازمی ضرورت بن گئی۔ گرمیوں کی شدت سے بچنے کیلئے گھروں کی چھتوں کو اونچا رکھنا اور گھروں کے باہر برآمدہ بنانے کے اثرات انگریزی دور کے گورا صاحب کے بنگلو سے مستعار لئے گئے۔ کشادہ اور سیدھی سڑکیں بن جانے کی وجہ سے تانگہ و گاڑی وغیرہ کی رسائی گھر کے دروازوں تک ممکن ہوگئی البتہ ابھی گاڑی گھر کی دہلیز تک پہنچی تھی، گھر کے اندر داخل نہ ہوئی تھی۔

بہتر ہوا اور روشنی کیلئے پلاٹ کا سائز بڑا اور مربع شکل کا بنایا گیا اور گلیوں کی یوں تقسیم کی گئی کہ کم وبیش ہر پلاٹ کم از کم دو اطراف سے سڑک پر واقع ہوتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ کھڑکیاں کھولی جاسکیں۔ پلاٹ سائز بڑا ہونے کی وجہ سے اب مرکزی صحن نے باقاعدہ اپنی شکل اختیار کر لی تھی۔ اندرون شہر کی چھوٹی حویلیوں کے نقشہ کو یہاں ماڈل بنا کر گھروں کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ لکڑی کے علاوہ لوہے کی بنی ہوئی خوبصورت بالکونیاں اور ان کی ریلنگ بے تحاشا استعمال کی گئی۔ گھر کی تعمیر اب بھی تمام رقبے پر کی گئی اور گھر آپس میں جڑے ہوئے ہی تھے۔ ڈیوڑھی اب بھی تھی اور اس میں زینہ بھی تھا مگر اب یہاں ٹائلٹ اور غسلخانہ بھی نظر آتا ہے کیونکہ شہر میں فلش سسٹم متعارف ہو چکا تھا۔ بڑے پلاٹ ہونے کے سبب نہ صرف گھر کے اندرون ایک سے زائد سیڑھیاں بالائی منزل تک جاتی نظر آتی ہیں بلکہ کارنر پلاٹ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات گھر کی دو ڈیوڑھیاں بھی مل جاتی ہیں۔ ان گھروں میں جہاں مکھ نے اب باقاعدہ مرکزی صحن کی شکل اختیار کر لی تھی، ہمیں برآمدہ بھی نظر آتا ہے۔ تین اطراف دیواروں کی چنائی تھی مگر چوتھی سمت جو صحن کی طرف تھی، وہ کھلی تھی۔ چھتیں اونچی

نے لاہور شہر کے نواح میں اس کی توسیع اور تعمیرات کے بارے میں ایک ماسٹر پلان تیار کیا۔ اس کی جنوب مغربی جانب جوہر ٹاؤن، واپڈا ٹاؤن، اقبال ٹاؤن، پی آئی اے کالونی، نیسپاک کالونی، گورنمنٹ کوآپریٹو ہاؤسنگ کالونی، انجینئرز سوسائٹی، آرکیٹکٹس سوسائٹی و دیگر رہائشی کالونیاں اسی ماسٹر پلان کے تحت بنائی گئیں یہ ماسٹر پلان اگرچہ ۱۹۶۶ء میں تیار ہوگیا تھا مگر پارلیمنٹ سے اس کی باقاعدہ منظوری ۱۹۷۲ء میں وزیراعلیٰ معراج خالد کے دور میں ہوئی مگر ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۲ء کے آٹھ سالوں میں مستقبل کے اس توسیعی منصوبہ کو مدنظر رکھتے ہوئے بااثر اور دولت مند طبقوں نے یہ زمین خرید لی اور پھر حکومتی اداروں کو ایکڑوں کے حساب خریدی زمین کینالوں کے حساب سے فروخت کر کے خوب دولت کمائی، یہی وجہ ہے کہ آج نہ تو یہ کالونیاں اندرونی طور پر اچھی رہائشی سہولتیں فراہم کرتی ہیں اور نہ ہی ان کالونیوں کی سڑکیں ان کو باہمی ملاتی ہیں۔

ایسی ہی صورتحال سے شہر قدیم لاہور کو اس وقت دوچار ہونا پڑا جب شاہ عالم مارکیٹ اور اعظم مارکیٹ اور اکبری منڈی کو ہول سیل کے کاروبار کے لیے منتخب کیا گیا۔ پنجاب بھر سے اجناس، کپڑا اور دیگر اشیاء تیار ہو کر اندرون لاہور کی مارکیٹ میں پہلے لائی جاتی ہیں اور پھر پنجاب بھر سے دکاندار یہاں سے اپنی اپنی اشیاء ضرورت کے تحت خرید کر لے جاتے ہیں اور پھر فروخت کرتے ہیں۔ اس عمل نے شہرِ قدیم پر ایک جانب تو کمرشل ازم کے اثرات مرتب کیے اور قدیمی تاریخی عمارات کو دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں تجارتی عمارات میں تبدیل کر دیا ہے اور دوسری جانب ٹرانسپورٹیشن کے لیے ٹرکوں اور بسوں کے اڈے اور فارورڈنگ ایجنسیوں کی بھرمار نے ٹریفک کو بڑھاوا دیا۔ اس سارے عمل کا اثر اندرون لاہور کی رہائشی آبادیوں پر بھی پڑا ہے۔ اپنے رہائشی مکانات یا ان کا کچھ حصہ کرائے پر اٹھا کر یا بیچ کر یہ مقامی لوگ بیرون لاہور کی نئی ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں منتقل ہو گئے اور یوں ایک نئی نسل تجارت کے لیے فصیلوں کے اندر بسے شہر میں آن بسی جو دن کے وقت اپنی دکانیں سجاتے ہیں، ان کی گاڑیاں باہر سرکلر روڈ پر سارا دن کھڑی رہتی ہیں اور شام کو یہ لوگ نواحی آبادیوں میں اپنے گھروں میں سونے کے لیے چلے جاتے ہیں۔

اس تمام صورتحال نے اندرون لاہور کی عمارات اور کلچر کی شکل مسخ کر دی ہے، وہ عمارتیں جو اپنے عہد کی پہچان تھیں، آج جدید انداز کے تجارتی اور تشہیری بورڈ کے پیچھے چھپ گئی ہیں۔

منصوبہ بحالی اندرون شہر لاہور

ڈاکٹر غافر شہزاد

پس منظر

پاکستان کی حدود میں قدیمی شہروں میں جس شہر نے اپنے وجود میں آنے کے بعد سے آج تک وقت اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق خود کو تبدیل کیا ہے اور اسکی فضاؤں میں سانس لینے اور بسنے والوں کی رہائشی، ثقافتی، مذہبی اور سماجی ضروریات کو پورا کیا ہے، اس کا نام بلاشبہ شہر لاہور ہے اگر اس کی قدیمی فصیل کے اندر صدیوں پرانی معاشرت اور عہد قدیم کی عمارات کے آثار اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسری جانب اس کے نواح میں میلوں تک پھیلی ہوئی نئی عمارات، سڑکوں کا جال اور ہاؤسنگ کالونیاں عہد جدید کے بھی تقاضوں کو بہ احسن طریق سرانجام دے رہی ہیں، اس لحاظ سے شہر لاہور کو آزادی سے پہلے اور بعد میں آباد ہونے والے کئی اور شہروں پر فوقیت اور اعزاز حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کو ہر عہد حکومت میں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اگر غیر ملکی سیاحوں نے اسے باغات کا شہر قرار دیا ہے تو اس کے بعد دانشوروں اور مفکرین نے اسے صوفیاء اور اولیاء کا مسکن بھی قرار دیا ہے، برطانوی عہد کے طرز تعلیم کو فروغ دینے کے لیے یہاں سینکڑوں کالج اور یونیورسٹیاں وجود میں آئیں تو اسے کالجوں کا شہر بھی قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور حکومت میں لاہور شہر کی معاشرتی زندگی اور اس کے باسیوں کو بہتر عمارات اور شہری سہولیات فراہم کرنے کے لیے منصوبے بنائے جاتے رہے ہیں۔

لاہور کو گریٹر لاہور بنائے جانے کے لیے اولین پانچ سالہ منصوبہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے عہد حکومت میں تیار کیا گیا۔ مگر گورنر کی زیر سرپرستی کام کرنے والے ورکنگ گروپ

عہد کی جمالیات کا اظہار ہے۔ تخلیقی فن کاروں نے اپنے اپنے انداز میں آج کی معاشرت کے آئینہ دار گھر کے حوالے سے اپنے اپنے انداز میں اظہار کیا ہے۔ شعراء نے لفظوں کی زبان میں سیمنٹ وخشت کے ان مرکبات کی سانسیں اور نبضیں محسوس کی ہیں اور معاشرتی زندگی کے رویوں کے اظہار کیلئے گھر کو استعارہ اور علامت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس سلسلے میں چند اشعار سنیئے۔

لوگ بنواتے رہے نیچے دکاں' اوپر مکاں
گھر محلے اس طرح بازار بن جاتے رہے (انجم خیالی)

چھت کی کڑیاں جانچ لے، دیوار و در کو دیکھ لے
مجھ کو اپنانے سے پہلے میرے گھر کو دیکھ لے (تنویر سپراء)

کوئی دریچہ ہوا کے رخ پر نہیں بنایا
مرے بزرگوں نے سوچ کے گھر نہیں بنایا (اعجاز کنور راجہ)

مرے خدا مجھ اتنا سا معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے (افتخار عارف)

کچھ مصرف دریچہ و در سوچنا تو ہے
کس کام کا ہے اب یہ کھنڈر سوچنا تو ہے (شہزاد قمر)

ہمارا گھر بھی گیا اور بھی گھرانے گئے
چھتوں کے ساتھ ہی چڑیوں کے آشیانے گئے (محسن شیخ)

یہ سوچ کر در و دیوار بھی گرا ڈالے
جو تو نہیں ہے تو پھر گھر کی کیا ضرورت ہے (غافر شہزاد)

مطابق کمرے مہیا کئے جاتے ہیں۔ ان کمروں کی پیمائش اور رقبہ رہنے والوں کی انفرادی ضرورت اور ترجیحات کا مرہون منت ہے۔

گھر میں آنے والے کو سب سے پہلے جس سے واسطہ پڑتا ہے وہ گھر کا بند گیٹ اور گیٹ پر لگی گھنٹی ہے۔ اطلاع اور اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ گیٹ کے بعد کار پورچ اور پھر عمارت، جس کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ گھر کہتے ہیں۔ اس گھر کی ڈیوڑھی، جس کو انٹرینس لابی کہا جاتا ہے جہاں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو سکتے ہیں، ٹی وی لاؤنج میں جا سکتے ہیں یا پھر سیڑھی ہونے کی صورت میں بالائی منزل تک رسائی مل سکتی ہے۔ آج بھی گھر کا یہ حصہ انتہائی اہم ہے جو ہر طرح کی آمد و رفت کو کنٹرول کرتا ہے۔

جدید گھر میں کچن ٹی وی لاؤنج سے لازماً متصل ہوتا ہے۔ باتھ روم ہر بیڈ روم سے ملحقہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ فلش سسٹم اور چینی ٹائیل کے اعلیٰ معیار نے باتھ روم کو بیڈ روم کا لازمی حصہ بنا دیا ہے۔ آج باتھ روم کی تعمیر و تکمیل پر سب سے زیادہ فی مربع فٹ خرچہ اٹھتا ہے۔

ٹی وی لاونج میں الماری، ڈائننگ روم میں الماری، کچن میں الماریاں، بیڈ روم میں الماریاں، گویا ان تمام جدید سہولیات نے جہاں گھر کی اندرونی تزئین و آرائش پر اثر ڈالا ہے وہاں رہنے کے انداز بھی بدل گئے ہیں۔ گھروں کی اندرونی جمالیات یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ جدید گھر کا مختلف اور منفرد تصور وجود میں آیا ہے۔ ان تمام تبدیلیوں سے گزر کر گھر زیادہ آرام دہ، فعال اور اس کی رہائشی استعداد میں اضافہ ہو گیا ہے، گویا جگہ کا امکانی استعمال بڑھ گیا ہے۔ آج کا جدید گھر اندرون لاہور کے قدیمی گھروں سے زیادہ روشن، کھلا، ہوادار اور محفوظ ہے۔ نئے طرز معاشرت میں پنپنے والے پرائیویسی کے تصور کے مطابق ہے۔ گھریلو سرگرمیوں کو بہتر انداز میں منضبط کر دیا گیا ہے۔ گھروں کی زیریں اور بالائی منزلیں برابر کی سطح پر قابل استعمال ہیں۔ اندرون لاہور کی تنگ، چھوٹی اور تکلیف دہ سیڑھی آج بہت آرام دہ، کھلی اور تزئین و آرائش کے اہم عنصر کے طور پر گھروں میں بنائی جاتی ہے۔

اندرون لاہور کی تنگ گلیوں، تاریک مکانات اور بند کوچوں، کٹڑوں سے آج کے جدید گھر تک انسان کا سفر دراصل تہذیب و معاشرت، روایات، رسم و رواج اور طرز رہن سہن کا ایک طویل سفر ہے جو زمان و مکان کی جدید حسیات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ اپنے

عوض سوزوکی ایف ایکس متعارف کرائی گئی۔ اس ساری صورت حال میں چھوٹے بڑے گھروں میں جو جدید طرز پر بنائے جارہے تھے' کارپورچ مہیا کرنا لازمی قرار پایا۔

مشترکہ خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا اور انفرادی گھرانوں نے اپنے اپنے گھروں کی تعمیر شروع کردی۔ اندرون لاہور کی تھڑوں کی مجلس' تہواروں' میلوں اور عرسوں کی روایات کا سلسلہ ان نئی آبادیوں میں ممکن نہ تھا اور نہ ہی ان کو ڈیزائن کرتے ہوئے ایسی کوئی ترجیحات شامل کی گئیں۔ گھروں سے باہر جہاں کھیلنے' پڑھنے' نماز ادا کرنے' علاج معالجے اور دوکانات کیلئے جگہوں کی تخصیص کردی گئی وہاں گھر کے اندر کی تمام سرگرمیوں کیلئے بھی کمرے مخصوص ہوگئے اور یوں ڈرائنگ روم' بیڈ روم' باتھ روم' سٹڈی روم' کارپورچ' کچن' ڈائننگ روم گویا گھر کے اندر ہونے والی ہر سرگرمی کیلئے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ آٹھویں دہائی میں جب ٹیلی ویژن عمومی سطح پر میسر آیا تو اس کے لئے ان جدید گھروں میں ٹی وی لاؤنج نے گھر میں بنیادی حیثیت حاصل کرلی' جہاں خاندان کے تمام افراد مل بیٹھتے ہیں اور باہمی تبادلہ خیالات کرتے ہیں اور ٹی وی دیکھتے ہیں۔

ان رہائشی آبادیوں میں چھوٹی سڑکیں بیس تا تیس فٹ چوڑی رکھی گئی ہیں جبکہ درمیانی سڑکیں چالیس تا ساٹھ فٹ ہیں اور بڑی سڑکیں اسی سے ایک سوبیس فٹ تک کشادہ ہیں۔ ان کو باہمی قائمۃ الزاویہ بنایا گیا ہے ان کالونیوں میں ٹیلی فون' بجلی' پانی' نکاسی فضلات اور سڑکیں غرض تمام ترقیاتی کام پہلے مکمل کئے گئے ہیں جبکہ گھروں کی تعمیر کا کام بعد میں شروع ہوا ہے۔ ان کالونیوں میں سڑکوں کا جال ترجیحاتی بنیادوں پر پھیلایا گیا ہے۔ بڑے پلاٹ' بڑی سڑکیں' درمیانے پلاٹ درمیانی سڑکیں اور چھوٹے پلاٹ چھوٹی سڑکیں۔ گویا ان ترجیحی بنیادوں کی مختلف بلاکوں میں بھی تقلید کی گئی ہے۔ آٹھ سو سے بارہ سو تک کے گھروں کا ایک بلاک اپنے رہنے والوں کیلئے مخصوص مسجد' ہسپتال' دوکانات' پارک' سکول' غرض ضرورت کی ہر سرگرمی کیلئے جگہ رکھتا ہے۔ بڑی کالونیاں جو کئی بلاکوں پر مشتمل ہیں' ان میں ایک بڑا پارک' بڑا شاپنگ سنٹر' ایک بڑی جامع مسجد' ایک بڑا اسکول یا کالج' ایک بڑا ہسپتال جو تمام رہائشیوں کو طبی سہولتیں فراہم کرتا ہے' مہیا کیا گیا ہے۔ جدید گھر کا بنیادی اصول ''ضرورت'' ہے۔ ہر گھر میں اس کے مکینوں کے طرز زندگی' معاشرت اور رہن سہن کے

معاشرتی نظام اور قدیمی طرز رہن سہن پر اثرات مرتب کئے۔ آنے والے اپنے ساتھ نئی زبان، نئے رسم و رواج اور نئی روایات لے کر آئے۔

آٹھویں دہائی میں تعلیم اور ملازمت کے حصول کیلئے پنجاب کے کئی شہروں سے لوگوں نے لاہور کا رخ کیا۔ اس دوران مشرق وسطیٰ سے بھی ریال اور درہم کی شکل میں زرمبادلہ یہاں منتقل ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب صنعتی کارخانوں کو قومیایا تو صاحب ثروت لوگوں نے اپنا پیسہ صنعت سے نکال کر زمین کی خرید و فروخت میں لگایا اور یوں اس دور میں زمین کا کاروبار بام عروج پر پہنچا۔

روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی کیلئے گھر مہیا کرنے کیلئے لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کو ۱۹۷۵ء میں لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں تبدیل کر دیا گیا اور یوں لاہور کے جنوب مغربی جانب جہاں لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے گریٹر لاہور (Greater Lahore) کا منصوبہ بنایا وہاں نجی سطح پر بھی بے شمار رہائشی کالونیاں بنائی گئیں۔ یہ آزادانہ کوآپریٹو ادارے تھے جن کے ترقیاتی کام کی تکمیل کی نگرانی لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ذمہ تھی۔ ان رہائشی کالونیوں میں پی سی ایس آئی آر، ویلنشیا، پی آئی اے، اعوان ٹاؤن، ٹیک سوسائٹی، واپڈا ٹاؤن، کینال ویو، کینال برگ، جوڈیشل کالونی، اور ویسٹ وڈ کالونی وغیرہ شامل تھیں۔ لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے زیر انتظام مصطفیٰ ٹاؤن، فیصل ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن، تاج پورہ، جوہر ٹاؤن اور حال ہی میں جوبلی ٹاؤن کے نام سے رہائشی کالونی متعارف کرائی گئی۔

اندرون لاہور مقیم لوگ جب نئی کالونیوں میں منتقل ہونے لگے جہاں غیر لاہوری بھی آباد ہو رہے تھے تو ہمسائیگی و تعلق داری کی جو صورت اندرون لاہور میں تھی یہاں ممکن نہ تھی۔ اس سے جہاں سماجی سطح پر تعلقات کی نئی شکل نے جنم لیا وہاں فاصلے بڑھ جانے کی بدولت پبلک یا ذاتی ٹرانسپورٹ کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ گھر ملنے کیلئے آنے والوں سے نئے سماجی نظام کے تحت میل ملاقات کے پیش نظر ڈرائنگ روم لازم ہو گیا اور ڈائننگ روم جدید طرز زندگی کو اپنانے کیلئے گھر میں بنانا ناگزیر ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے فاصلوں کے پیش نظر ذاتی گاڑی ضرورت بن گئی کیونکہ میلوں پر پھیلی کالونیوں کے اندر پبلک ٹرانسپورٹ گھر گھر تک نہیں جا سکتی تھی اور یہ نویں دہائی کا آغاز تھا جبکہ صرف تریسٹھ ہزار روپے کے

کمرہ نہیں بنایا گیا اس مقصد کیلئے ماسٹر بیڈ روم ہی استعمال کیا جاتا رہا۔ سیڑھی کو عموماً گھر کے سامنے والے حصے میں ہی تعمیر کیا گیا جہاں سے بالائی منزلوں کو رسائی ملتی ہے۔ سیڑھی کی تعمیر نے گھر کے روکار کی خوبصورتی میں خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ گھر کے باہر سے ہی سیڑھی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بالائی منزل پر سونے کیلئے کمرے بنائے گئے اور کھلی چھت بھی لازماً چھوڑی گئی جو ٹیرس کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہاں بھی تمام منزلوں کا سطحی نقشہ یکساں ہی رہتا ہے کمروں پر کمرے تعمیر کئے گئے اور صرف کمرے کا استعمال بدل گیا۔ یہی سیڑھی بالائی منزل کی چھت تک جاتی ہے جہاں برساتی بنائی گئی جو اسٹور کا کام دیتی ہے۔ عمارتی سامان اور پلان کی تبدیلی کی وجہ سے گھروں کا بیرونی منظر یکسر بدل گیا اب زیادہ تر سیمنٹ سے پلستر شدہ یا سفیدی لگے مکان نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ کھڑے ہیں۔ بالکونی یا جھروکے کی تعمیر یہاں تقریباً ختم ہوگئی۔ تزئین و آرائش کی جگہ سادگی نے لے لی۔ بڑی سڑکوں پر بڑے پلاٹ اور چھوٹی سڑکوں پر چھوٹے پلاٹ بنائے گئے۔ گھروں کے درمیان پارک بنائے گئے جہاں بچے کرکٹ کھیلتے ہیں دیگر سماجی سرگرمیوں کیلئے ان پارکوں کا استعمال بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے پہلی مرتبہ واضح انداز میں رہائشی اور غیر رہائشی پلاٹوں کیلئے تعمیری ضابطہ بنایا۔ عمارت کی اونچائی اور زیادہ سے زیادہ تعمیراتی رقبے کی حد مقرر کی گئی اور باغ کیلئے چھوڑے جانے والے رقبے کا تعین کیا گیا۔ باورچی خانہ اور غسلخانے کا وقوع بتایا گیا۔ اس کا مقصد اچھا ماحول اور بہتر زندگی کا تصور تھا۔

بستی کے لوگوں نے سمن آباد ریزی ڈنٹس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن بنائی اس انجمن کے منشور میں لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ سے سمن آباد کیلئے بہتر مراعات حاصل کرنا' جائز شکایات پیش کر کے اپنے مطالبات منوانا' مسجد کیلئے باقاعدہ زمین حاصل کرنا' چندہ فراہم کرنا اور ترقیاتی کاموں کی تکمیل کرنا اور پارکوں کا بہتر انتظام و انصرام تھا۔

ایم اے قدیر نے اپنی کتاب ''اربن ڈویلپمنٹ ان تھرڈ ورلڈ'' مطبوعہ ۱۹۸۳ء میں تحریر کیا ہے کہ ''۱۹۴۷ء کی ہجرت میں اندرون لاہور سے چالیس فیصد ہندو اور سکھ ہندوستان چلے گئے اور اسی تناسب سے وہاں سے مسلمان یہاں آ گئے''۔ لوگوں کی اس آمدورفت نے

بنائے گئے بے تحاشا شجرکاری کی گئی۔ زیرزمین نکاسی فضلات کا نظام بچھایا گیا۔ خالص پانی مہیا کرنے کیلئے ٹیوب ویل اور پانی کی ٹینکی تعمیر کی گئی۔ کھیلوں اور دیگر سرگرمیوں کیلئے ۸۳ کینال پر محیط رقبہ مختص کیا گیا۔ ۱۲۰ فٹ چوڑی سڑک جو ایک لحاظ سے ملتان روڈ اور فیروز پور روڈ کو ملاتی تھی، کے دونوں اطراف چھوٹی سڑکیں بنائی گئیں۔

جہاں تک یہاں تعمیر کئے جانے والے گھروں کا تعلق ہے تو لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے اٹھارہ مختلف اقسام کے نقشے تیار کئے اور ان کے مطابق ۱۸۴ گھروں کی تعمیر مکمل کی۔ تمام بنیادی سہولتیں فراہم کیں۔ یہ پلان پرانے گھروں کے پلان سے مختلف بلکہ متضاد انداز لئے ہوئے ہیں اور آج کے جدید گھر اور اندرون لاہور کے قدیم گھروں کے درمیان ان کی حیثیت ایک پل کی سی ہے۔ گھروں کے اس پلان میں تمام کمروں کی کھڑکیاں اندر صحن کی طرف کھلنے کے بجائے عمارت کے اطراف چھوڑے گئے رقبے میں کھلتی ہیں۔ یہاں مرکزی صحن کا کوئی تصور موجود نہیں ہے گھر کی عمارت پورے قطعہ اراضی پر تعمیر نہیں کی گئی بلکہ چاروں اطراف کھلی جگہ چھوڑ کر پلاٹ کے درمیان میں عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

گھر کا دروازہ براہ راست سڑک پر یا گلی میں نہیں کھلتا بلکہ چاردیواری تعمیر کی گئی جس میں داخل ہونے کیلئے گیٹ بنایا گیا اس گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک برآمدہ بنایا گیا جو عمارت کا حصہ ہے اور جہاں گھر میں داخل ہونے کا دروازہ کھلتا ہے گھر کا پلان عموماً ایک راہداری اور اس کے گرد بنائے گئے کمرں پر مشتمل ہے۔ اسی راہداری کے ایک کونے میں سیڑھی بنائی گئی ہے جو بالائی منزلوں تک رسائی دیتی ہے۔

پلاٹ کا سائز یہاں بھی قریباً مربع ہی رکھا گیا ہے گلیوں کے نئے منظرنامے نے نئی جمالیات کو جنم دیا ہے جو پرانی طرز سے مختلف اور منفرد ہے۔ گھر کے پچھلے حصے میں گیراج بنایا گیا۔ چاردیواری کی اونچائی زیادہ نہیں رکھی گئی اور متنوع اقسام کے ڈیزائن بنائے گئے۔ باورچی خانے کیلئے بھی گھر کے عقبی حصہ میں جگہ مختص کی گئی اور اس کو گھر سے الگ کر کے بنایا گیا۔ کمرے سے ملحقہ غسل خانے کا تصور ابھی یہاں نظر نہیں آتا اور اس کو گھر کے پیچھے ایک کونے میں تعمیر کیا گیا اور پھر پائپ سے مین سیور (Main Sewer) کے ساتھ ملا دیا گیا۔

بیڈروم میں الماری کی موجودہ شکل یہاں نظر نہیں آتی۔ افراد خانہ کیلئے مل بیٹھنے کا کوئی

لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے ۱۹۵۶ء میں ''لاہور ٹوڈے اینڈ ٹو مارو'' (Lahore-Today & Tomorrow) شائع کی جس میں کئی نئی ہاؤسنگ اسکیمیں جیسے سمن آباد' شاد باغ وغیرہ متعارف کرائی گئیں۔ سڑکیں تعمیر کی گئیں پانی کیلئے ٹیوب ویل اور ٹینکی بنائی گئی' سیور لائن اور بجلی کے کھمبے لگائے گئے۔ رہائشی اور غیر رہائشی رقبوں کو علیحدہ علیحدہ بنایا گیا۔ اب جو قوانین وضوابط لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے ان پلاٹوں پر گھروں کی تعمیر کیلئے بنائے وہ پہلے سے مختلف' بہتر اور جامع تھے۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ میں آگ لگ گئی اور باہم جڑے ہوئے سینکڑوں گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ مستقبل میں اس خدشے کے پیش نظر برطانوی حکومت نے پارلیمنٹ میں Detached Housing کا قانون پاس کروایا۔ جس کے نتیجے میں ہر گھر کے ارد گرد خالی جگہ چھوڑنا لازم قرار پایا۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے اس قانون کو قابل توجہ جانا۔ ایسے حالات میں لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے اندرون لاہور کے نواح میں ۸۲.۰۷ ایکڑ کے قطعہ اراضی پر مشتمل سمن آباد کے نام سے درمیانے سفید پوش طبقے کیلئے رہائشی کالونی بنائی۔ یہ رقبہ میاں میر کے برساتی نالے اور مزنگ کے درمیان واقع تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے عروج نے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں فیکٹری مزدوروں کیلئے بہتر رہائشی سہولتیں مہیا نہ کرنے کے سبب بین الاقوامی سطح پر گارڈن سٹی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں گارڈن سٹی ایسوسی ایشن بنائی گئی یہی وہ زمانہ ہے جب کھیم چند برطانیہ سے انہی خیالات کے اثرات لے کر لاہور آیا اور اس نے لاہور کے گرد و نواح میں ماڈل ٹاؤن کی شکل میں ایک رہائشی منصوبے کا آغاز کیا۔ رہائشی کالونیوں میں سر سبز وشاداب پارکوں' کشادہ سڑکوں اور درختوں کی اہمیت مسلمہ حیثیت اختیار کر گئی۔ اب جب لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے سفید پوش طبقے کیلئے رہائشی کالونیاں بنانے کا منصوبہ بنایا تو ان تمام باتوں کو مدنظر رکھنا لازم ہو گیا۔

سمن آباد کے رہائشی منصوبہ میں دس مرلے سے ایک کینال تک کے ۲۸۹ پلاٹ بنائے گئے۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے اٹھارہ مختلف اقسام کے ۱۸۴ گھر تعمیر کئے اور ان کو Lease purchase system کے تحت فروخت کیا۔ تمام سڑکیں پختہ بنائی گئیں درمیانی حصے میں بڑی کشادہ سڑک (Main Boulevard) بنائی گئی جس کے دونوں سروں پر گول پارک

ہونے کی وجہ سے ہمیں درمیانی اضافی منزل بھی نظر آ جاتی ہے جو زیادہ تر اسٹور کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ انگریزی دور کی ابتدائی نصف صدی میں تعمیر کی جانے والی رہائشی عمارتیں اندرون لاہور کے گھروں سے یکسر مختلف نہ تھیں بلکہ اسی کی بہتر شکل تھیں۔

ایچ آر گولڈنگ نے ''اولڈ لاہور'' میں لکھا ہے:

> ''میونسپل کمیٹی کا جو آئین لاہور کیلئے منظور کیا گیا وہ (نوٹیفکیشن نمبر ۴۰۴۷) مورخہ ۲ اپریل ۱۸۶۲ء کو شائع ہوا۔ اور سالانہ انتخاب کیلئے ۱۳ ممبران کا فیصلہ کیا گیا اس میں سات ہندو، پانچ مسلمان اور ایک سکھ شامل تھے۔ اس الیکشن کے تحت پہلی کمیٹی جو منتخب ہوئی اس نے کیم مئی ۱۸۶۲ء کو کام شروع کر دیا۔ پہلے سال ۱۴۸ اجلاس ہوئے اور ممبران کی شمولیت تسلی بخش رہی۔ کمیٹی نے صفائی اور بہتر ماحول کی ضرورت کو محسوس کیا اور یوں شہر کے گرد پانی مہیا کرنے کیلئے کام شروع ہوا۔ خندق کو مٹی سے بھر کر باغ بنایا گیا۔ پانی کی نکاسی کیلئے لوہاری سے چھوٹے راوی تک نالا بنایا گیا۔ دہلی اور لوہاری دروازے گرا کر تعمیر نو کی گئی تاکہ ان کو کشادہ کیا جا سکے۔''

سید محمد لطیف نے اپنی کتاب ''ہسٹری آف پنجاب'' میں لکھا ہے کہ گھر مہیا کرنا اور رہنے کی بہتر سہولتیں فراہم کرنا میونسپل کمیٹی کے منشور کا بنیادی نقطہ تھا۔ ۱۹۳۶ء میں میونسپل کمیٹی کو لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ (LIT) بنا دیا گیا تو یہ نئی قسم کے گھروں کی تعمیر کا نقطۂ آغاز تھا۔

کنہیا لال ہندی نے انگریزی دور میں تعمیر ہونے والے گھروں کے بارے میں لکھا ہے:

> ''یہ عمارات مقامی ٹھیکیداروں اور کاریگروں نے بنائیں جو کہ روایتی انداز تعمیر میں بہت ماہر تھے لیکن اب انہوں نے انگریزی انداز تعمیر میں تعمیراتی کام سیکھ لیا تھا۔''

بیسویں صدی کے آغاز میں جن آبادیوں کی تعمیر ہوئی وہاں ترقیاتی کام پہلے کئے گئے، گلیوں اور پلاٹوں کی حد بندی میونسپل کارپوریشن کی زیر نگرانی ہوئی اور پھر گھر کی تعمیر عمل میں لائی گئی اور یہ بات ان آبادیوں کو اندرون شہر کی آبادی سے مختلف کرتی ہے۔

وہ لوگ جنہیں لاہور کی قدیم تہذیب، کلچر اور شناخت سے جذباتی وابستگی ہے وہ جب بھی اس حالت زار کی جانب دیکھتے ہیں تو سوائے حسرت وافسوس کے کچھ نہیں کر پاتے، ایسی صورتحال میں ورلڈ بینک کے تعاون سے لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے PEPAC کی فنی مشاورت میں ۱۹۸۸ء میں اندرون لاہور کی عمارات اور سہولیات کو بہتر بنانے کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ اس سے قبل ۱۹۶۶ء میں بھی ورلڈ بینک نے اس شہر قدیم کو ایک ٹورسٹ سٹی بنانے کے لیے سروے وغیرہ کروائے اور ابتدائی تحقیقاتی رپورٹ بھی مرتب کروائی گئی مگر بوجوہ اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ لہٰذا ۱۹۸۸ء میں ایک مرتبہ پھر اندرون لاہور کی عمارات اور اس میں بسنے والے لوگوں کو بنیادی سہولیات کی فراہمی کے لیے ایک چار سالہ منصوبہ بنایا گیا۔

ورلڈ بینک نے اس چار سالہ منصوبے سے حاصل ہونے والے تجربات کو ایک رپورٹ کی شکل میں طبع بھی کروایا اس کا ایڈیٹر Donald Hankey تھا اور اس کا نام "Conservation of Walled City" تھا۔ ۱۹۸۸ء کے اس منصوبہ کے تحت دہلی دروازہ، اور حمام وزیر خان کی تزئین و آرائش کی بحالی اور ان کے از سر نو استعمال کے بارے میں بھی کام ہوا۔ اس رپورٹ نے مستقبل کی رہنمائی کے لیے چند اہم نتائج بھی مرتب کیے مثلاً:

۱۔ پراجیکٹ کے شروع سے آخر تک، ماہرین آثار قدیمہ اور مورخین کو ساتھ شامل رکھنا چاہیے۔
۲۔ تاریخی عمارات پر کیے جانے والے کام کا ریکارڈ اور ڈاکومینٹیشن مقامی دفتر میں عوام الناس کے لیے رکھنی چاہئیں تاکہ عوامی شمولیت کے مواقع یقینی بنائے جاسکیں۔
۳۔ کسی بھی عمارت تک رسائی، اس کے مستقبل کے استعمال اور عمارت کی تاریخی حیثیت کے بارے میں فیصلہ پراجیکٹ کے آغاز میں ہی کر لینا چاہیے اگر غیر ضروری اخراجات اور اضافی وقت سے بچنا مقصود ہو تو اس کی مناسب منصوبہ بندی بروقت ہو جانی چاہیے۔
۴۔ وفاقی حکومت کے ادارہ آثار قدیمہ کے ساتھ باضابطہ معاہدہ کسی بھی پراجیکٹ پر کنزرویشن کا کام شروع کرنے سے پہلے کرنا ضروری ہے۔
۵۔ مقامی سیاسی سماجی معاشی اور مالیاتی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک آیا ضابطہ تیار کرنا چاہیے جو پرائیویٹ ملکیت کی تاریخی عمارات کی تزئین و آرائش اور بحالی کے کام کو یقینی بنا سکے۔ اکثر تاریخی عمارات نجی ملکیت میں ہیں، شہر کو تاریخی مزاج دینے کے لیے ان کی بھی تزئین و آرائش ضروری ہے۔

۶۔ دو منصوبوں پر عمل درآمد کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ منصوبے کی عمل داری اور تعمیر کے لیے سمجھدار لیڈر شپ کی ضرورت ہے۔

اس رپورٹ میں کسی بھی سوسائٹی اور اس کے کلچر کو ایک نئے انداز سے دیکھا گیا تھا، کلچر کو محض محفوظ کر لینے کا نام کنزرویشن نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں عمارات کو میوزیم بنا کر رکھ دینا چاہیے۔ عمارات اگر زیر استعمال ہیں تو ان کی عمر اور استقامت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ اگر ان کا تبدیل ہوتا ہوا استعمال مناسب انداز سے کیا جائے تو اس کے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ لہٰذا عمارات کے ازسرنو استعمال (Re-Adaptation) کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کنزرویشن دراصل اس عمل کا نام ہے کہ جس کی وجہ سے بوسیدگی کا عمل رک جاتا ہے مگر آج اس کے معنی بہت وسیع تر ہو گئے ہیں۔ عصر حاضر میں کنزرویشن کے عمل کو قدر (Value) کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اور کسی بھی عمارت کو جب ان قدروں (Values) کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے ہیں تو اس تناظر میں عمارت کی کئی حیثیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں اور ہر حیثیت کی اپنی الگ قدر ہے، جس کا دورانِ بحالی خیال رکھنا بہت ضروری ہے یہ قدریں کلچرل بھی ہو سکتی ہیں، فنکشنل اور ہسٹاریکل بھی ہو سکتی ہیں اور جذباتی وابستگی بھی ہو سکتی ہے۔ کسی عمارت کے ساتھ جو اس کی اہمیت و قدر کا تعین کرتی ہے، ان قدروں کو جانچنے پرکھنے اور ان کو ماپنے کے لیے بہت اعلیٰ درجے کی آگہی اور شعور کی ضرورت پڑتی ہے۔

کوئی بھی پالیسی عوامی شمولیت کے بغیر غیر موثر اور ناقابل عمل رہتی ہے۔ ایک جانب عوامی شعور کی بیداری کی ضرورت پڑتی ہے تو دوسری جانب منصوبے کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے تعلیمی اور تحقیقی اور ثقافتی سطح پر بہت کچھ معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی عمارت یا جگہ کی بحالی کے لیے یا اس کے ازسرنو استعمال کے بارے میں فیصلہ کرنے اور عمارت کو اس نئی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کے لیے کس درجہ تک ضرورت ہے، اس کا فیصلہ عمارت کی حالات دیکھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔

سر برنارڈ فیلڈن (۱۹۸۹ء) نے کنزرویشن (Conservation) اور رینیول (Renewal) کے درمیان کسی بھی عمارت کی بحالی کے لیے حدود کے اندر رہتے ہوئے سات طرح کی گنجائشیں پیدا کی ہیں اور کسی بھی عمارت کی بحالی کے لیے کوئی ایک یا ایک سے زائد انداز کے

استعمال کی گنجائش واجازت موجود رہتی ہے۔اس کے سات انداز ہیں۔

۱۔ بوسیدگی کو روکنے کے لیے موثر انداز کی دیکھ بھال اور باقاعدہ مرمت کرنا۔

۲۔ کسی بھی عمارت کو اس کی موجود حالت میں قائم اور بحال رکھنے کے لیے اقدامات۔

۳۔ مستقل استادگی اور استقامت کے لیے ٹھوس بنیادوں پر عملی حفاظتی اقدامات۔

۴۔ اصل کی حالت میں دوبارہ عمارت کو بحال کر دینا اصل سامانِ تعمیر کے ساتھ۔

۵۔ عمارت کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ازسرِ نو استعمال میں لانا۔

۶۔ کسی گم شدہ حصے کو دوبارہ اس کی حالتِ اصل میں تعمیر کر دینا۔

۷۔ تعمیر نو یعنی کسی حادثے کی صورت میں تباہ شدہ حصے کو دوبارہ ویسے ہی تعمیر کر دینا۔

کنزرویشن کے عصری شعور نے اس عمل کو معاشی، سیاسی، سماجی اور سائنسی فوائد کے ساتھ جوڑ کر حکومتوں اور اداروں کی توجہ اور دلچسپی کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے وگرنہ اس سے قبل کنزرویشن کے عمل کو محض بے فائدہ، پیسے کا ضیاع یا بے وجہ اصراف ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔اس نئے اندازِ فکر نے عالمی مالیاتی اور ثقافتی اداروں کے لیے پیسے خرچ کرنے کا ایک نیا جواز پیدا کر دیا ہے۔ ماہرین معاشیات نے کئی حسابات کے بعد اس بات کو ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے کہ وقت کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نئی عمارت کی تعمیر بہت کثیر سرمائے کا تقاضا کرتی ہے جبکہ پہلے سے موجود عمارات کے ازسرنو استعمال سے بدلتی ہوئی ضروریات کو بہت کم قیمت پر پورا کیا جا سکتا ہے۔اس لیے کہ پہلے سے موجود عمارات میں ضرورت کے مطابق انفراسٹرکچر سہولیات موجود ہوتی ہیں جبکہ نئی جگہ پر ان سہولیات کی فراہمی بہت زیادہ اخراجات کا سبب بنتی ہے۔ کنزرویشن اور عمارات کا ازسرنو استعمال کم ترقی یافتہ اور غریب ممالک کے لیے اس لحاظ سے بہت مفید اور کارآمد ہے مگر اس کے لیے عوامی سطح پر شعور اور آگہی کے لیے مسلسل کاوشوں کی ضرورت ہے تاکہ غریب لوگ یہ جان سکیں کہ ان کے زیرِ استعمال قدیمی عمارات تاریخی اور ثقافتی سطح پر کس قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ ولیم مورس (William Morris) کے خیال میں پرانی عمارتیں اور کلچرل اثاثے صرف ہمارے آباء اجداد کے گزرے وقتوں کی نشانی نہیں ہوتے بلکہ یہ ہمارے آنے والی نسل کی امانت بھی ہوتے ہیں اور ہم صرف ایک وقف کے محافظ کے طور پر اپنا کردار ادا کرتے ہوئے انہیں محفوظ حالت میں اگلی نسل تک منتقل کرتے ہیں۔

اس ساری صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈونالڈ ہینکے (Donald Hankey) نے جدید تر عصری شعور کے مطابق کنزرویشن پالیسی کے لیے چند قوانین بھی وضع کیے ہیں جن کو مدنظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

۱۔ قدیمی عمارات کے تحفظ و بحالی کے لیے لازمی ہے کہ عمارات کا اصل استعمال یا ان کے نئے استعمال کو مدنظر رکھتے ہوئے کام کروایا جائے۔ نئے استعمال کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے عمارت کی تاریخی وثقافتی حیثیت کا خصوصی خیال رکھا جائے۔

۲۔ نئے استعمال کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے یہ خاص خیال رکھا جائے کہ اس عمل سے عمارات کا اصل تشخص اور اس کے عناصر متاثر نہیں ہوں گے۔ اس کے اردگرد نئی عمارات کی ڈیزائن کی منظوری دیتے وقت قدیمی عمارات کے حسن اور تاثر کو کم تر نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ کسی بھی تاریخی وثقافتی ورثے کے قریب غیر متاثر کن عمارت کی تعمیر کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ لاہور میں ایسی عمارت سے ملحقہ جدید اور غیر معیاری عمارات کی تعمیر نے خاص طور پر جمالیات کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔

۴۔ کنزرویشن پالیسی کو مرتب کرتے ہوئے تاریخی وثقافتی اثاثوں کی تاریخی، کلچرل، آرٹسٹک اور سائنٹیفک قدروں کو خصوصاً مدنظر رکھنا چاہیے۔ رجسٹریشن کے موقع پر ایسی عمارات کے جملہ خصائص کو درج کرنا چاہیے تاکہ عمارت کی قدر کا تعین کرنے میں آسانی ہو اور مدد ملے۔

۵۔ کنزرویشن کی ضروریات کا کام کی نوعیت، قیمت اور مقدار کے تناظر میں تعین کرنا ضروری ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ کتنی رقم میسر ہے اور کون سے کام پہلی ترجیح میں ہونے چاہئیں اور ان کے لیے کتنا وقت، مہارت، تنظیم اور رقم درکار ہوگی۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کی جانی چاہیے۔

۶۔ شہری منصوبہ بندی کے دوران ترقیاتی منصوبہ جات اور ان کے انتظام کے دوران کنزرویشن پالیسی کو ماسٹر پلان کا لازمی حصہ بنایا جانا چاہیے تاکہ بیوروکریسی اور شہری منصوبہ بندی کے ماہرین کے مدنظر یہ بات رہے۔

ورلڈ بینک کی اس رپورٹ میں یہ دلچسپ بات بھی بیان کی گئی کہ اس وقت اندرون

لاہور کے انتظامی و دیگر انتظامات بہ یک وقت کئی اداروں کے پاس ہیں۔ ذمہ داری کوئی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں مگر اس سے وابستہ مفادات کے حصول کے لیے ہر ادارہ سرگرم عمل اور تن دہی سے مصروف ہے۔ ان اداروں میں لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن، فیڈرل آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ، پنجاب آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ، محکمہ اوقاف پنجاب، محکمہ متروکہ وقف املاک پاکستان وغیرہ کلی یا جزوی طور پر اندرون لاہور اور اس سے متعلقہ معاملات کو مختلف سطحوں پر کنٹرول کیے ہوئے ہیں، کئی ذمہ داریوں میں یہ ادارے ایک دوسرے سے متصادم بھی ہو جاتے ہیں جبکہ کلی طور پر کوئی ادارہ اندرون لاہور اور اس سے وابستہ تاریخی و ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے کے لیے عملی اور ٹھوس اقدامات کرنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتا۔ اندرون لاہور کی بحالی کے لیے PEPAC نے ۱۹۸۸ء میں ایک جامع کنزرویشن پالیسی مرتب کی تھی مگر ان پر کسی بھی حکومتی عہد میں عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اس کنزرویشن پالیسی کے اہم نکات درج ذیل تھے:

۱۔ اندرون لاہور میں لوگوں، جگہوں اور عمارات کو محفوظ کیا جائے۔
۲۔ اندرون رہائش پذیر لوگوں کی سماجی اور معاشی زندگی کی بہتری کے لیے اقدامات کیے جائیں۔
۳۔ اندرون لاہور کے ماحولیاتی اثاثے (Environmental Assets) تلاش اور محفوظ کیے جائیں۔
۴۔ شہر میں تاریخی عمارات اور وقوع پذیر ہونے والے تاریخی واقعات اور لوگوں کے بارے میں معلوم کیا جائے۔
۵۔ کنزرویشن پلان بناتے وقت ترجیحات کا تعین کیا جانا ضروری ہے۔

اس کنزرویشن پلان کے تحت عوامی شمولیت کے ساتھ ترقیاتی کام، مقامی اور سیاسی نمائندگی، رہائش پذیر مکینوں کے لیے موجود رہائشی سہولتیں تاکہ مستقبل کی منصوبہ بندی کے بارے میں فیصلہ ہو سکے۔ اس رپورٹ میں دکانداروں اور تاجروں کی انجمنیں اور ان کے متوقع کردار پر بھی بحث کی گئی۔ عوام الناس میں شعور اور آگاہی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے تعلیم کے فروغ کی اہمیت اجاگر کی گئی۔ زمین کے امکانی استعمال کے بارے میں مناسب منصوبہ بندی کر کے لوگوں کے لیے روزگار، ان کی آمدن میں اضافہ اور مہارت کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ کنزرویشن پلان میں عمارتوں کے نقشہ جات، تعمیر نو کے لیے عمارات کو گرانا، مالیاتی

سہولیات، مالکان اور ٹھیکیداران کے لیے فنی و تکنیکی رہنمائی کی سہولت اور قدیمی عمارات کی استقامت اور مضبوطی کے لیے فنی مشاورت کی فراہمی جیسی تجاویز پیش کی گئیں۔ اندرون لاہور اور نواحی علاقے میں ٹرانسپورٹ کی فراہمی، بہتری اور انتظامات کا لائحہ عمل مرتب کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ جدید تر شہری طرزِ زندگی کے لیے لازمی سہولیات کی فراہمی کے بارے میں بات کی گئی۔ ایک جانب اگر عوامی سطح پر تاریخی جگہوں کو محفوظ کرنے کا ذکر ہوا تو دوسری جانب تاریخی عمارات کی انفرادی و نجی سطح پر بحالی کے بارے میں تفصیلی جائزہ لیا گیا۔

اس تمام صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے PEPAC نے ڈرافٹ ماسٹر پلان ۱۹۸۸ء میں لاہور ترقیاتی ادارہ کو پیش کیا جس نے اس کی باقاعدہ منظوری ۱۹۹۰ء میں جاری کی۔ اس پلان میں اہم مسئلہ جس کی جانب توجہ دلائی گئی وہ تجاوزات کے ہٹانے سے متعلق تھا۔ اس میں بے شمار سیاسی اور معاشی رکاوٹیں پیش تھیں۔ اس تمام کام کے لیے ایک انتظامی ادارہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی تشکیل کے لیے تجویز دی گئی۔ ایک جامع کنزرویشن پلان کی عدم موجودگی میں بحالی عمارات کے بارے میں ایک مسلسل الجھن، غربت، تحفظ صحت کے خطرات اور تاریخی عمارات کے بچ جانے والے کھنڈرات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

۱۹۸۸ء کے تیار کردہ پلان میں عملی طور پر ۶ منصوبوں پر کام کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جو درج ذیل ہیں:

۱۔ فصیل کی شناخت اور نشاندہی۔

۲۔ شاہی حمام کی بحالی۔

۳۔ چوک وزیر خان کی بحالی۔

۴۔ دہلی گیٹ اور کشمیری بازار کی بحالی۔

۵۔ حویلی دھیان سنگھ کی بحالی۔

۶۔ گردوارہ باؤلی صاحب کے صحن کی بحالی۔

ایک دوسری تحقیق کے دوران طویل المدتی منصوبے کے بارے میں فیصلہ کیا گیا اور اس کے لیے لوہاری، دہلی، یکی اور مستی دروازوں کے باہر چار جگہوں پر عملی اقدامات کے لیے تجاویز دی گئیں۔ ان مقاصد کے لیے ورلڈ بینک سے ترقیاتی ادارہ لاہور نے قرضہ کا بندوبست کیا۔ اور پہلے سے شامل PEPAC اور غیر ملکی فرم GHK Ltd سے فنی اور تیکنیکی معاونت حاصل

کرنے کا معاہدہ کیا۔ اس منصوبہ کی رو سے ان ماہرین سے کنٹریکٹ ڈاکومنٹس کی تیاری، عمارات، شہر کے دروازے، سکول اور گلیوں میں عمارات کی بحالی اور ان کے نئے استعمال کی بابت معاونت حاصل کی گئی۔ اس کام کو دہلی گیٹ پراجیکٹ کا نام دیا گیا۔ اس کا نقطہ آغاز دہلی گیٹ تھا اور یہ مسجد وزیر خان تک جاتا تھا اس کے تفصیلی نقشہ جات تیار کیے گئے۔ کام کی تفصیلات میں بجلی کی تاروں، گیس کے پائپ پانی اور سیوریج کے پائپ کو زیر زمین لے جانا، ٹیلی فون تاروں کو زیر زمین لے جانا، ٹریفک کی تنظیم اور گلیوں کے فرش کی پختگی وغیرہ شامل تھا۔ دہلی گیٹ عمارت کو اسکول کے از سر نو استعمال کے لیے تیار کیا گیا۔ جبکہ شاہی حمام کی تاریخی عمارت کو سٹور، رہائشی مکان، اسکول، کلینک اور کونسلر کے دفتر کے طور پر استعمال کرنے کی تجویز دی گئی۔ ان کاموں کے لیے آرکیٹکٹس، ماہرین آثار قدیمہ، مورخین اور بحالی کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی تیار کی گئی۔

منصوبہ کی بہتری اور اچھے نتائج کے لیے چند تجاویز بھی مرتب کی گئیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ عوامی شمولیت اور سمجھ بوجھ کی موجودگی میں انفرادی شعور و آگہی میں اضافہ ہوگا اور یہ مستقل بنیادوں پر کنزرویشن پالیسی کو کامیاب بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

۲۔ کنزرویشن کے مسلسل عمل کو جاری رکھنے کے لیے پرائیویٹ سطح پر مستقل فنڈز کی فراہمی کے لیے کوئی طریقہ کار وضع کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ آبادی کا دباؤ کم کرنے کے لیے لوگوں کی زندگیاں بہتر بنانے اور انہیں دوسری جگہوں پر منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ شہری سہولیات پانی، بجلی، گیس اور نکاسی کے بہتر انتظامات کے بعد معیار زندگی اور صحت بہتر ہو جائے گی۔ وگرنہ محض کنزرویشن عمومی سطح پر ہی بہتری لائے گی۔

۵۔ موجودہ شدید صنعتی اور تجارتی سرگرمیاں بے شمار مسائل کو جنم دے رہی ہیں، جزوی طور پر ان کو دوسری جگہ منتقل کرنے سے بہتری ہو سکتی ہے۔

۶۔ PEPAC کے مجوزہ کنزرویشن پلان کی شہر قدیم کے لیے بہت اہمیت ہے اور اس پر مستقل اور مسلسل نظر ثانی کرتے رہنے اور اس کو شہری منصوبہ بندی کے لازمی حصہ کے طور پر شامل کرنے سے بہتر مقاصد حاصل ہو سکیں گے۔

۷۔ تاریخی عمارات کا قابل قبول از سر نو استعمال بہت توجہ اور ذہانت اور مہارت کا متقاضی ہے۔

ترقیاتی ادارہ لاہور ورلڈ بینک اور PEPAC کے لیے ۱۹۸۸ء کے اس منصوبے نے تحقیق اور سمجھ بوجھ کے کئی نئے دروازے کھولے، زمینی حقائق کچھ نئے تناظر میں ان کے سامنے آئے۔ بحالی اور عمارتوں کے ازسرِنو استعمال کے بارے میں صدیوں قدیمی اندازِ فکر میں تبدیلی آئی، عمارت محض تاریخی عمارت نہ رہی اور اس کی حیثیت انفرادی سطح تک محدود نہ رہی۔ پہلی مرتبہ تاریخی عمارت کو اس کے گردوپیش کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کے بارے میں پیش قدمی ہوئی، محض عمارات کی بحالی کو کافی نہ سمجھا گیا اور اس کے ساتھ اس عمارت کے مکینوں کی ذہنی وشعوری آگاہی اور معاشی ومعاشرتی ترقی کو ساتھ جوڑ کر دیکھا گیا۔ کنزرویشن کے کام کو صرف ماہرین آثارِ قدیمہ تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ اس کے لیے ماہرین فن تعمیر، مہندسین، ماہرین شہری منصوبہ بندی، مورخین اور بیوروکریٹ کو شامل کرنا لازمی سمجھا جانے لگا۔ اس تجربے نے محض بحالی کے کام کو انتہائی پیچیدہ اور اس کو کئی جہات پر مشتمل قرار دیا۔ بعدازاں ترقیاتی ادارہ لاہور تو جدید شہر کی ہاؤسنگ کالونیوں کی جانب متوجہ ہو گیا PEPAC پر بھی زوال آ گیا، ورلڈ بینک کی توجہ بھی کم ہوئی۔ یہاں تک کہ John W. Wall ورلڈ بینک کا کنٹری منیجر وڈائریکٹر بن کر ۲۰۰۶ء میں پاکستان آ گیا جسے اندرون لاہور کے تاریخی وثقافتی ورثے سے بے حد پیار تھا جو اس کی سانسوں میں رچا بسا تھا۔

ادارہ بحالی اندرون شہر

جنرل پرویز مشرف نے پنجاب لوکل گورنمنٹ آرڈیننس ۲۰۰۱ء کے تحت مقامی حکومتوں کا ایک نیا ضابطہ متعارف کروایا۔ اس کے نتیجے کے طور پر پنجاب میں ۱۴۴ تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن اور ۵ عدد سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور، راولپنڈی، گوجرانوالہ، فیصل آباد اور ملتان میں معرضِ وجود میں آئیں اور یوں مقامی سطح پر عوامی سہولیات کی فراہمی کے لیے ایک نیا قانونی اور انتظامی ڈھانچہ وجود میں آ گیا۔ جس کے مطابق ضلعی اور شہری حکومتیں، ضلع کونسل، تحصیل اور ٹاؤن میونسپل ایڈمنسٹریشن، تحصیل اور ٹاؤن کونسل، یونین ایڈمنسٹریشن، یونین کونسل، دیہی اور محلّہ کونسل اور سٹیزن کمیونٹی بورڈ (CBO) کی تشکیل ہوئی۔

لوکل گورنمنٹ آرڈیننس ۲۰۰۱ء تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن کو شہری سہولیات جیسے بجلی، پانی، گیس، ٹیلی فون وغیرہ کی فراہمی میں ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور حکومت پنجاب کا کردار محض

نگرانی کا رہ جاتا ہے۔ چونکہ نئی تحصیل ایڈمنسٹریشن کے پاس فنی وتکنیکی ماہرین کی کمی تھی اور ان کو مزید ٹریننگ کی ضرورت تھی، ایسی صورتحال میں مددگار کے طور پر ورلڈ بینک نے اپنی خدمات پیش کیں اور ان سہولیات کی فراہمی، عملے کی ٹریننگ اور تعلیم کے لیے قرضہ فراہم کیا۔ قرضہ کی واپسی کے لیے ۲۰ سال اور مزید ۸ سال کی توسیع کا عرصہ متعین کیا گیا اور اس کو Fixed Spread Loan کہا گیا۔ ورلڈ بینک کے اس پراجیکٹ کے دو اہم حصے بنائے گئے۔

(I) استعداد کار گرانٹ اور ترقیاتی گرانٹ کے تحت تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن کو بہتر کام کرنے اور عوام کو بہتر شہری سہولیات فراہم کرنے کے لیے مالی امداد دی گئی۔ اس امداد کے تحت نقشہ جات کی تیاری زمینی استعمال کے نقشہ جات، کمپیوٹرائزڈ سسٹم وغیرہ کی سہولیات فراہم کی جانا مقصود تھا جبکہ ترقیاتی گرانٹ کے تحت تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن کی سطح پر پانی، بجلی، گیس نکاسی آب وغیرہ کے لیے امداد مہیا کی گئی۔

(II) دوسرے حصے کے تحت پنجاب لوکل گورنمنٹ، پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ بشمول اربن یونٹ کو ثقافتی ورثے کے تحفظ کے لیے امداد فراہم کیے جانے کا فیصلہ ہوا۔ پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ نے ثقافتی ورثے کے تحفظ کے معاملات کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کرنا تھیں۔ ثقافتی ورثے کے تحفظ کے لیے کوئی انتظامی ڈھانچہ بنانا تھا۔ اس کے مستقبل کے تحفظ کے لیے قانونی ضابطہ تشکیل دینا تھا اور شہر اندرون میں پائیلٹ پراجیکٹ میں کچھ حصے کے ثقافتی ورثے کی بحالی کا منصوبہ سرانجام دینا تھا۔

۲۰۰۶ء میں اس تمام منصوبے کی لاگت ۵۹ ملین امریکی ڈالر کا تخمینہ لگایا گیا۔ جس میں ۴۵.۵ ملین ترقیاتی گرانٹ پنجاب کی تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن کے لیے تھی اور صرف ۶ ملین امریکی ڈالر پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ کے لیے ان کے ذمہ جملہ کاموں کی مد میں مختص کیے گئے۔ جو کہ تمام کہ تمام ورلڈ بینک نے ہی فراہم کرنا تھے۔ جبکہ تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن میں جملہ لاگت کا ۸۵ فیصد بینک کے اور ۱۵ فیصد حکومت پنجاب کے ذمہ قرار پایا۔ ۵۹ ملین کے بینک قرضہ میں ۵۰ ملین امریکی ڈالر بینک کے ذمہ تھے جبکہ ۹ ملین امریکی ڈالر حکومت پنجاب کے ذمہ قرار پائے۔

پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ نے پنجاب بھر میں شہری سہولیات کے تمام معاملات پر رہنمائی اور تکنیکی مشاورت کے لیے اربن یونٹ (U.U) کا ادارہ تشکیل دیا۔ حکومتی اداروں میں

یہ گہرا احساس موجود تھا کہ پنجاب میں ثقافتی ورثے کے اندر ایک معاشی ترقی اور غربت میں کمی کی اہلیت اور استعداد موجود ہے اگر کلچرل ٹورزم کو فروغ دیا جائے۔ لہٰذا اربن یونٹ کو اندرون شہر لاہور کے ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے کلچرل ٹورزم کو فروغ دینے کے لیے ذمہ داری سونپی گئی۔ اور اندرون لاہور میں ایک پائیلٹ پراجیکٹ کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس سے قبل اٹلی کے ایک بینک اور ٹرسٹ کی مالی امداد سے ورلڈ بینک نے اندرون لاہور میں شاہی گزرگاہ کی تجویز پیش کی تھی جس کو پائیلٹ پراجیکٹ کے طور پر ورلڈ بینک نے سرانجام دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ مغل بادشاہوں کی گزرگاہ تھی کہ جب وہ دہلی سے لاہور آتے تو دہلی دروازے سے داخل ہو کر شاہی حمام میں قیام کرتے اور پھر مسجد وزیر خان میں نماز کی ادائیگی کے بعد شاہی قلعے چلے جاتے۔ یہ پراجیکٹ ٹورزم نقطہ نظر سے بہت اہم سمجھا گیا۔ دانشوروں نے اس پراجیکٹ سے بہت سی امیدیں وابستہ کرلیں۔ اس سے نہ صرف عمارتی ثقافتی ورثے کا تحفظ اور بحالی کی توقع تھی بلکہ رہائش پذیر لوگوں کی معاشی، سماجی اور ذہنی حالت پر بھی اچھے اثرات پڑنے کا یقین تھا۔ مزید خیال تھا کہ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے، دن بدن مرتے ہوئے کرافٹ کی نشاۃ ثانیہ ہوگی اور یوں اندرون شہر لاہور اور اس کے مکینوں کی زندگیوں میں ایک مثبت تبدیلی آئے گی جو ایک مردہ ثقافتی ورثے میں جان ڈال دے گی۔ لوگوں میں اپنے ثقافتی ورثے کے تحفظ کا شعور پیدا ہوگا اور اس کی حفاظت کو وہ اپنی ذمہ داری سمجھیں گے اور اپنے ماضی کے ان ثقافتی اثاثوں کے ساتھ ان کا اپنائیت کا تعلق پیدا ہوگا۔ ایسی صورتحال میں ہر شخص جو اس پراجیکٹ سے وابستہ تھا، بہت امیدیں باندھ کر بیٹھ گیا۔ مگر زمینی حقائق مختلف طرح کی مشکلات، مسائل اور چیلنجوں کو اپنے دامن میں لیے ماہرین کے منتظر تھے۔

۸ مئی ۲۰۰۶ء کو ورلڈ بینک نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو شہری سہولیات کی بہتری کے پراجیکٹ کے لیے ۵۰ ملین امریکی ڈالر کا قرضہ فراہم کر دیا۔ اور یہ فیصلہ بھی ہوا کہ پانی کی فراہمی کے لیے ۴۰ فیصد، سڑکوں کی تعمیر کے لیے ۲۵ فیصد، کوڑا کرکٹ کے لیے ۲۰ فیصد اور صفائی وصحت کے اقدامات کے لیے ۱۵ فیصد کے حساب سے رقم خرچ کی جائے گی اس قرضے کو Specifie inverstment loan کا نام دیا گیا۔ اس منصوبے پر خرچ ہونے والا ۹ ملین امریکی ڈالر حکومت پنجاب نے جبکہ ۵۰ ملین امریکی ڈالر انٹرنیشنل بینک برائے تعمیرات وترقی نے فراہم کرنا تھا۔ ان منصوبہ جات کو جولائی ۲۰۰۶ء میں شروع ہو کر دسمبر ۲۰۱۰ء میں اختتام پذیر

ہونا تھا۔اس قرضے کا ایک بڑا حصہ تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن (TMAS) کے ذریعے پنجاب کی مختلف تحصیلوں میں شہری سہولیات کی فراہمی پر خرچ ہونا تھا جو کہ کل قرضہ میں ۴۸.۷ ملین امریکی ڈالر تھا جبکہ بقیہ ۱۰.۳ ملین امریکی ڈالر تین صوبائی محکموں لوکل گورنمنٹ اینڈ رورل ڈویلپمنٹ، پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ اور پنجاب میونسپل ڈویلپمنٹ فنڈ کمپنی (PMDFC) کی استعداد کار بہتر بنانے، ثقافتی ورثے کی بحالی اور ملازمین کی ٹریننگ میں استعمال ہونا تھا۔ ورلڈ بینک کے ساتھ حکومت پنجاب کے طے کردہ طریقہ کار کے مطابق ثقافتی ورثے کی بحالی کا کام پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ کے شعبہ اربن یونٹ (Urban Unit) نے پنجاب میونسپل سروسز امپرومنٹ پراجیکٹ کے فنی تعاون سے سرانجام پانا تھا اور اربن یونٹ کے ذمہ لگایا گیا کہ وہ اندرون شہر لاہور کے سماجی، سیاسی، ثقافتی، معاشی اور قدیمی عمارات کی تزئین و آرائش و بحالی پر کام کرنا شروع کر دیں۔ اس جانب بھی اشارہ کیا گیا کہ اندرون شہر لاہور کے ثقافتی ورثہ کی تنظیم کے لیے صوبائی اور وفاقی سطح پر کئی ادارے کام کر رہے ہیں اس وقت پنجاب میں ۲۴۴ تاریخی عمارات صوبائی محکمہ آثار قدیمہ کے زیر انتظام ہیں جبکہ ۱۴۷ عمارات کی وفاقی محکمہ آثار قدیمہ دیکھ بھال کرتا ہے، پنجاب میں تاریخی مزارات کا انتظامی کنٹرول محکمہ اوقاف پنجاب کے پاس ہے جبکہ ان کی بحالی و مرمت کا کام پنجاب کا محکمہ آثار قدیمہ سرانجام دیتا ہے۔ اسی طرح دہلی گیٹ کی بحالی کے بعد جب ورلڈ بینک کے پراجیکٹ مکمل ہونے پر اسکول کے طور پر استعمال شروع ہوا تو عمارت کا کنٹرول تعلیم کے محکمہ کے پاس چلا گیا، اقلیتوں کی تاریخی عمارات کی دیکھ بھال ہندو اوقاف (ETPB) کا محکمہ کرتا ہے جو وفاقی سطح پر قائم ہے۔ اسی طرح شہری سہولیات کی فراہمی کے لیے لاہور میٹرو پولیٹن کارپوریشن، واپڈا، سوئی ناردرن گیس، پی ٹی سی ایل (PTCL) جیسے محکمے موجود ہیں، ایسی صورتحال میں قانونی ضابطہ تشکیل دیا جانا بھی بہت ضروری ہے۔

ثقافتی ورثے کی بحالی اور تحفظ کے لیے شہر قدیم لاہور میں شاہی گزرگاہ کے پراجیکٹ کو پائیلٹ پراجیکٹ کے طور پر شامل کرنے کا فیصلہ بھی ہوا۔ دانشوروں اور ماہرین کا خیال تھا کہ اس پراجیکٹ سے شہر قدیم میں بسنے والے لوگوں کو براہ راست فائدہ ہوگا۔ ان میں شعور و آگہی کے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، اور ان کے لیے معاشی اور سماجی سطح پر بہتر زندگی کے مواقع فراہم کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے اور جب تک ایسی باضابطہ مہم شروع

نہ کی جائے گی یہ کام نہ ہوسکیں گے۔

پراجیکٹ کے مجموعی تخمینہ میں ثقافتی ورثے کی بحالی کے کام کے لیے ۶ملین امریکی ڈالر رکھے گئے جو کہ مجموعی مجوزہ لاگت کا ۲.۱۰فیصد حصہ بنتا تھااور یہ تمام رقم قرضہ کی شکل میں ورلڈ بینک نے فراہم کرنا تھی۔ حکومت پنجاب کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔

پراجیکٹ کا پہلا PC-1

پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ کے اربن یونٹ کے پراجیکٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر ناصر جاوید نے ۱۵ستمبر ۲۰۰۶ءکو اندرون شہر لاہور کے ثقافتی ورثے جسے شاہی گزرگاہ کا نام دیا گیا، کا پہلا PC-1 تیار کیا جسے ممبر پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ عبدالرؤف خان نے چیک کیا اور سیکرٹری پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ سہیل احمد نے منظور کیا، اس PC-1 کی منظوری پروونشل ڈویلپمنٹ ورکنگ پارٹی (PDWP) نے اپنی میٹنگ منعقدہ ۱۹ستمبر ۲۰۰۶ء میں جاری کی۔

مذکورہ PC-1 میں شاہی گزرگاہ کی بحالی کے منصوبہ کا نام ''سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ آف والڈسٹی لاہور'' (Sustainable Development of Walled City Lahore) رکھا گیا۔ پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے ایک Project Implementation Unit کی تشکیل تجویز کی گئی جبکہ سالانہ آپریشن کے لیے ''لاہور والڈسٹی مینجمنٹ اتھارٹی'' کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اس PC-1 میں بینک کے قرضہ ۶ملین امریکی ڈالر کے علاوہ حکومت پنجاب سے بھی ۲ملین امریکی ڈالر مہیا کرنے کی منظوری دی گئی جبکہ ورلڈ بینک کے مطابق حکومت پنجاب کا اس میں کوئی مالی حصہ نہیں رکھا گیا تھا۔

PC-1 کے مطابق پراجیکٹ کے تین اہم حصے بنائے گئے۔

۱۔ پہلے حصے میں ایک باضابطہ محکمانہ فریم ورک تیار کرنے کا فیصلہ ہوا اور اس کی مشاورت کے لیے فنڈز بھی رکھے گئے، چونکہ اس وقت شہر اندرون لاہور میں کئی ادارے انتظامی معاملات کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ کوئی ایک ادارہ یا اتھارٹی بنائی جائے جو ان تمام معاملات کو ایک پلیٹ فارم سے منظم کرے۔

۲۔ پراجیکٹ پر عمل درآمد کے لیے ایک پراجیکٹ مینجمنٹ یونٹ (PMU) کی تشکیل کا فیصلہ بھی ہوا جو تمام منصوبہ کی تیاری، سوچ، عمل درآمد اور دیگر متعلقہ معاملات کو زیادہ موثر

طریقے سے دیکھ سکے گی۔ بعدازاں منصوبہ کی تکمیل کے بعد اس یونٹ کو اتھارٹی میں بدل دیا جائے گا۔ اس اتھارٹی کی منظوری پنجاب اسمبلی کے ایکٹ کے طور پر حاصل کی جائے گی۔ جب اتھارٹی بن جائے گی تو پی ایم یو(PMU) کا ڈائریکٹر جنرل اتھارٹی کا چیف ایگزیکٹو بن جائے گا اور پی ایم یو(PMU) کی ضرورت کے مطابق تشکیل نو کر دی جائے گی۔

۳۔ تیسرا اور سب سے اہم حصہ شاہی گزرگاہ پر واقع ثقافتی ورثے کی تزئین و آرائش اور بحالی تھا یہ شاہی گزرگاہ دہلی دروازے سے شروع ہو کر قلعہ لاہور تک جاتی ہے جس پر مسجد وزیر خان، سنہری مسجد اور بیگم شاہی مسجد جیسی اہم تاریخی عمارات موجود ہیں اور یہ قیاس بھی کیا گیا کہ یہ وہی راستہ ہے جو مغلوں کے عہد میں دہلی سے آنے والے مغل بادشاہ استعمال کرتے تھے۔

پراجیکٹ میں پائیلٹ پراجیکٹ کے تمام ثقافتی ورثے کی بحالی اور شہری سہولیات کی فراہمی کا کام شامل تھا۔ پائیلٹ پراجیکٹ کی تکمیل کے بعد بقایا اندرون شہر لاہور میں اسی طرز پر بحالی کا کام اتھارٹی کے ذریعے مکمل کروانے کی منظوری دی گئی۔

PC-1 میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جب ترقیاتی کام کا کوئی حصہ بھی مکمل طور پر ڈرائنگ و تخمینہ جات کے ساتھ تیار ہوگا تو اس کو منظوری کے لیے ایک کمیٹی میں پیش کیا جائے گا جس کے سرپرست چیئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ ہوں گے جو اس کے عمل درآمد سے پہلے اس کی منظوری عطا کریں گے۔

مذکورہ بالا تینوں حصوں کے لیے PC-1 میں اخراجات کا تخمینہ بھی لگایا گیا جو یوں تھا۔ پہلے حصے کے لیے ۶۰ ملین روپے، دوسرے حصے کے لیے ۱۹۱ ملین روپے اور تیسرے حصے کے لیے ۳۰۰ ملین روپے کی رقم مختص کی گئی اور یوں PC-1 میں اس پراجیکٹ کے لیے مجموعی طور پر ۵۵۱ ملین پاکستانی روپے کی باضابطہ منظوری دی گئی۔ مجموعی طور پر اس میں ورلڈ بینک نے ۳۶۰ ملین روپے (۶ ملین امریکی ڈالر) جبکہ ۱۹۱ ملین روپے حکومت پنجاب نے اپنے ذمہ لیے۔

پراجیکٹ مینجمنٹ یونٹ نے پراجیکٹ سٹیرنگ کمیٹی (Steering Committee) کے زیرسایہ چیئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ میں کام کرنا تھا۔ پراجیکٹ سٹیرنگ کمیٹی میں مختلف حکومتی اداروں، ماہرین اور مقامی لوگوں پر مشتمل ایک ٹیم شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پراجیکٹ

مینجمنٹ یونٹ کا سربراہ ڈائریکٹر جنرل اسکیل ۲۲ (سروس یا ریٹائر) بنایا گیا اس کا عرصہ تعیناتی چار سال متعین کیا گیا اور اس کو تنخواہ و دیگر سہولیات کے علاوہ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے پراجیکٹ الاؤنس دیا جائے گا۔ اس کا فیصلہ بھی ہوا کہ ڈائریکٹر جنرل کے نیچے تین ڈائریکٹر کام کریں گے جن کا اسکیل ۱۹ یا ۲۰ ہوگا اور تنخواہ کے علاوہ دیگر سہولیات اور ایک لاکھ روپے پراجیکٹ الاؤنس دیا جائے گا۔ ان تین ڈائریکٹر کو ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن، ڈائریکٹر کلچرل ہیریٹیج، ڈائریکٹر انفراسٹرکچر کے نام دیئے گئے اور علاوہ ازیں کلچرل ہیریٹیج اسپیشلسٹ، انفراسٹرکچر اسپشلسٹ، کمیونٹی، اسپیشلسٹ انسٹی ٹیوشنل ڈویلپمنٹ اسپیشلسٹ، سوشل موبلائزیشن ایکسپرٹ کی تعیناتی کی منظوری بھی دی گئی۔ اور دفتری معاملات کو چلانے کے لیے دیگر اسٹاف بھی شامل کیا گیا۔ پراجیکٹ کو سوشل سیکٹر پراجیکٹ کے طور پر پلاننگ کمیشن کے طے کردہ ضابطہ اور رہنمائی کے مطابق تیار کیا گیا۔ PC-1 میں عوامی شعور و آگہی کے لیے ورکشاپ اور سیمنار کے اہتمام کی منظوری بھی دی۔ پراجیکٹ کا بجٹ چار سالوں پر پھیلا دیا گیا۔

PC-1 پر پہلی نظر ثانی ۲۳ جون ۲۰۰۷ء کو کی گئی اس سے قبل لارنس روڈ پر پی ایم یو کا دفتر کرائے کی عمارت میں قائم کیا گیا۔ PC-1 کی نظر ثانی پر پراجیکٹ کا بجٹ ۵۵۱ ملین سے بڑھ کر ۶۰۹ ملین ہو گیا۔ اخراجات میں اضافہ کی وجہ اسٹاف اور دفتر کے سامان کی خرید میں اضافہ تھا۔ PC-1 کی نظر ثانی کے بعد اس کا پہلا حصہ (۶۰ ملین روپے) اور تیسرا حصہ (۳۰۰ ملین روپے) تو یونہی رہے البتہ دفتری مد میں اخراجات کا تخمینہ ۱۹۱ ملین روپے سے بڑھ کر ۲۴۹ ملین روپے ہو گیا۔ PC-1 کی تیاری ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن نے دی جبکہ اس کی منظوری ڈائریکٹر جنرل PMU نے عطا کی۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کی شمولیت

ستمبر ۲۰۰۶ء سے جولائی ۲۰۰۷ء تقریباً گیارہ ماہ کے عرصہ میں پراجیکٹ مینجمنٹ یونٹ (PMU) نے پائیلٹ پراجیکٹ کے لیے اندرون شہر لاہور میں انفراسٹرکچر سہولیات کو زیر زمین لے جانے کے لیے واپڈا، سوئی ناردرن گیس، پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کارپوریشن لمیٹڈ، واسا سے کنسلٹنٹس کے ذریعے PC-1 کی تیاری کے لیے کہا اور اس حوالے سے کافی کام مکمل بھی ہو گیا مگر اس پروگرام پر عمل درآمد سے قبل ہی آغا خان ٹرسٹ فار کلچر (AKTC)

سے ایک پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ ایگریمنٹ پر گورنمنٹ آف پنجاب کے مذکورہ پراجیکٹ کے سلسلے میں دستخط ہو گئے جس کا مقصد یہ تھا کہ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر شہر اندرون لاہور کے ثقافتی ورثے کی بحالی وتزئین و آرائش کے لیے فنی مشاورت اور رہنمائی مہیا کرے گا۔

۲ جولائی ۲۰۰۷ء کی اس پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ نے پراجیکٹ کی سمت تبدیل کر کے رکھ دی۔ اس سے قبل تک خیال یہ تھا کہ شہری سہولیات مہیا کرنے والے ادارے واپڈا یا لیسکو، واسا، سوئی ناردرن گیس، پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن شہر اندرون میں اپنی شہری سہولیات زیر زمین لے جائیں گے جبکہ شاہی گزرگاہ کے مکانات اور تاریخی عمارات کے ثقافتی ورثے کی بحالی کا کام بعد ازاں کر دیا جائے گا۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے اندرون شہر لاہور کے ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا وہ بالکل مختلف تھا ان کا خیال یہ تھا کہ ہمیں مجموعی طور پر ایک پراجیکٹ کی سطح پر تمام کاموں کو دیکھتے ہوئے پراجیکٹ ڈایزئن کرنا چاہیے۔ اس کام کا ایک ہی ٹینڈر ہو اور ایک ہی ٹھیکیدار جو انفراسٹرکچر سروسز پانی، بجلی، گیس، ٹیلیفون، واٹر سپلائی اور سیوریج کے کاموں کے ساتھ ساتھ عمارتوں کے بیرونی منظر نامے کی تزئین و آرائش اور بحالی کا کام کرے تا کہ یوں نہ ہو کہ ایک کام ہونے کے بعد دوسری ایجنسی آ جائے اور وہ پہلے سے ہوئے کام کو بھی خراب کرے جیسے سڑک بننے کے بعد اگر سیوریج یا واٹر سپلائی والے آ جاتے ہیں تو سڑک توڑ دیتے ہیں۔ انفراسٹرکچر سروسز اور بیرونی آرائش اور بحالی کا کام بہ یک وقت سرانجام دیا جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مقامی لوگوں کی عملی شمولیت اور ان کے اندر ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے اور شعور و آگہی جگانے کے لیے کوششوں کو بھی ضروری سمجھا۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے اپنے کام کرنے کے طریقہ کار کو وضع کرتے ہوئے درج ذیل اقدامات کو ضروری سمجھا۔

۱۔ سب سے پہلے مذکورہ شاہی گزرگاہ میں موجود عمارات اور سروسز کا فزیکل اور سماجی و معاشی بنیادی سروے کیا جائے گا تا کہ منصوبے کو عملی صورت دینے کے لیے طریقہ کار وضع کیا جا سکے۔

۲۔ ایک سٹریجک پلان دیگر متعلقہ اداروں کے ساتھ مل کر بنایا جائے گا تا کہ مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر ان کی سماجی و معاشی اور عمارتی صورتحال کو بہتر بنایا جا سکے۔

۳۔ مقامی طور پر چند گلیاں ایسی منتخب کی جائیں گی جہاں تفصیل کے ساتھ تجزیہ و جائزہ لینے کے بعد عملی ڈیزائن بنا کر ایک نمونے کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

۴۔ شاہی گزرگاہ کے علاقے میں باؤلی باغ، سنہری مسجد، مسجد و چوک وزیر خان اور شاہی حمام کی اصل داخلہ گاہ کو تفصیل کے ساتھ مطالعہ و ڈیزائن کیا جائے گا۔

۵۔ اس طریقہ کار سے ایک طرف اگر کام کرنے والوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے گا تو ساتھ ایک تربیتی مرکز بھی بنایا جائے گا تا کہ ایسے تمام گم ہوتے ہوئے فنون کی نشاۃ ثانیہ ہو سکے۔

۶۔ پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ کے ایسے منصوبوں کو نشان زد کیا جائے گا جہاں دیگر ایجنسیوں سے مالی معاونت حاصل کی جا سکے۔

۷۔ لاہور نیشنل میوزیم کی فنی معاونت کی جائے گی۔

ان تمام نکات نے جہاں آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کو اندرون شہر لاہور کے بارے میں ایک نئے انداز سے دیکھنے اور سوچنے پر مجبور کیا وہاں ایسے تمام مواقعوں کی نشان دہی بھی کی کہ جن سے اس پراجیکٹ کو عالمی سطح پر پذیرائی اور مالی معاونت بھی مل سکے۔ پراجیکٹ کے کئی پوشیدہ گوشے بے نقاب ہوئے اور نئی راہیں ملیں۔ ظاہر ہے ایسی صورتحال نے اصل PC-1 میں طے کردہ کام کی حدود کو بہت وسیع کر دیا۔ شہر اندرون لاہور میں بڑے پیمانے پر تبدیلیوں کی ضرورت پیدا ہو گئی۔ اس بات پر بھی اتفاق ظاہر کیا گیا کہ ٹکڑوں میں شہر اندرون لاہور کے ثقافتی ورثے اور مذکورہ شہری سہولیات کی بحالی کے منصوبے کو اس وقت تک نہیں سوچا جا سکتا، جب تک تمام اندرون شہر جو کہ فصیل کے اندر ہے، اس کی شہری سہولیات کو مجموعی طور پر زیر غور لاتے ہوئے ایک ماسٹر پلان نہیں بنایا جائے گا تب تک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے منصوبہ پر عمل کرنا بے سود اور ناکامیاب ہو گا۔ کیونکہ کسی ایک شہری سہولت مثلاً سیوریج کا اثر دوسری شہری سہولت یعنی پانی پر ضرور پڑتا ہے لہٰذا مجموعی اور کلی سطح پر بھی پراجیکٹ کی منصوبہ بندی ضروری ہے۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے اصل PC-1 میں لیے گئے شاہی گزرگاہ کے رقبے و علاقے پر بھی نظر ثانی ضروری سمجھی ان کا خیال تھا کہ ہمیں پائیلٹ پراجیکٹ کی حدود کو وضع کرتے ہوئے انفراسٹرکچر سروسز جو پہلے سے موجود ہیں ان کے بہاؤ اور نکاسی کے رخ کو دیکھنا بھی ضروری

ہے۔ خصوصاً سیوریج اور بارشی پانی کی نکاسی کی ڈھلوان اور رخ کو مدنظر رکھتے ہوئے پائیلٹ پراجیکٹ کی حدود کا تعین کرنا چاہیے وگرنہ منصوبہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے بہت مشکلات ہوں گی اس اندازِ فکر نے پہلے سے طے کردہ شاہی گزرگاہ کی حدود کے تعین میں کچھ تبدیلی کردی۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے انفراسٹرکچر سروسز کو زیر زمین لے جانے کے لیے دیگر لوازمات پر بھی روشنی ڈالی مثلاً اگر الیکٹریکل کیبل کو زیر زمین لے جانا ہے تو اس سسٹم کے لازمی حصے یعنی ٹرانسفارمرز کے لیے بھی چند جگہوں پر زمین کے قطعات خریدنے ہوں گے تاکہ گلیوں اور سڑکوں پر ایستادہ ٹرانسفارمران قطعات اراضی کے اندر لگائے جاسکیں۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے ورلڈ بینک کے ساتھ باہمی مشاورت پر پی ایم یو (PMU) کو یہ بھی تجویز دی کہ شاہی گزرگاہ کے علاوہ اندرون لاہور کے اندر موجود دیگر عمارات جو کہ ثقافتی ورثے کی حیثیت رکھتی ہیں ان کی نشاندہی کر کے ان کو بھی پراجیکٹ کا حصہ بنانا چاہیے۔ اس کے لیے پی ایم یو نے پنجاب محکمہ آثارِ قدیمہ کے ساتھ مل کر ایسی کم از کم دس عمارات کی نشاندہی کا پروگرام بنایا جو کہ ثقافتی ورثے میں انتہائی اہمیت کی حامل ہوں۔ ان میں آٹھ پرائیویٹ عمارات کی تزئین و آرائش کی بحالی اور دو قدیمی عمارات خرید کر ان کی تزئین و آرائش کی بحالی کے کام پر بھی اتفاق کیا گیا۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے اندرون شہر لاہور میں سیاحوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کی خاطر جملہ سہولیات کی فراہمی بارے بھی جامعہ نقطہ نظر پیش کیا اور اس کے لیے پبلک ٹائلٹ، معلوماتی مراکز، ٹورسٹ گائیڈ کی ٹریننگ، معلوماتی کتابچے و پمفلٹ، مقامات طعام ورہائش، ٹرانسپورٹ وغیرہ کی فراہمی کے لیے باضابطہ تحقیق و مطالعہ کے بعد پالیسی مرتب کرنے پر بھی زور دیا۔ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے عوامی ضروریات و دلچسپی کی دیگر جگہیں جیسے پارک، باغات، طہارت گاہیں، سٹریٹ لائٹس وغیرہ کی ضرورت کو بھی اجاگر کیا۔ اس کے علاوہ عام مقامی لوگوں میں ثقافتی ورثے اور اس کو محفوظ رکھنے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے لوگوں میں تعلیم، صحت، آبادی منصوبہ بندی اور آگاہی کے بارے میں پروگرام مرتب کرنے کی تجویز بھی دی۔ ان کے نزدیک ایک اہم مسئلہ شہر اندرون لاہور میں کوڑا کرکٹ کو اکٹھا کرنا اور پھر باہر مناسب جگہ لے جا کر پھینکنا، صحت و تندرستی کے لیے انتہائی ضروری تھا۔ اور اس کے لیے ایک جامع منصوبہ کی ضرورت کو لازمی سمجھا گیا۔

علاوہ ازیں مقامی سطح پر قدیمی اور روایتی طور پر موجود کھیل کبڈی، کشتی، پتنگ بازی، روایتی فنون کے فروغ کو ضروری سمجھتے ہوئے پراجیکٹ میں شامل کرنے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ اندرون شہر روایتی میلے ٹھیلے، نمائشیں اور تہواروں کے لیے بھی مشہور رہا ہے۔ ان کو بہتر انداز سے منانے کا انتظام کرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ حضوری باغ میں شام کو بیٹھ کر مشاعرہ کرنا، جگت بازی، گلوکاری، بانسری بجانا، مقامی کلچر کا حصہ رہا ہے اس کو از سرِ نو شروع کرنا اور اس کی سرپرستی کرنا لازمی سمجھا گیا۔ مقامی کلچر و ثقافت کے بارے میں کتابیں، رسالے ڈاکومنٹری وغیرہ کی اشاعت بھی اس کے فروغ میں معاون ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کا اہتمام بھی کیا جانا چاہیے۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے ساتھ پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ کے بعد مذکورہ بالا چیزوں کو جب پراجیکٹ کا حصہ بنانے کا فیصلہ ہوا تو PC-1 میں درج کردہ پراجیکٹ کے تیسرے حصے میں بے شمار تبدیلیاں آ گئیں۔ PC-1 کی اس دوسری نظر ثانی میں پہلے دونوں حصے تو لاگت کے اعتبار سے وہی رہے مگر تیسرے حصے میں لاگت ۳۰۰ ملین روپے سے بڑھ کر ۵۵۳ ملین روپے تک چلی گئی۔ اور یوں پراجیکٹ کی مجموعی لاگت ۶۰۹ ملین سے بڑھ کر ۸۶۲ ملین روپے تک چلی گئی۔ یوں ۵۵۱ ملین لاگت کا تخمینہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو ۸۶۲ ملین روپے تک چلا گیا۔ مذکورہ بالا اجزاء کو PC-1 کا حصہ بنانے کے لیے اضافی رقم کی ضرورت تھی۔

PC-1 کی تیسری نظر ثانی

PC-1 کی پہلی اور خصوصاً دوسری نظر ثانی میں کام کی نوعیت تبدیل ہونے پر بے شمار تبدیلیاں آئیں۔ خصوصاً آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے ساتھ پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ ہونے کے بعد منصوبہ کی نوعیت اور سمت تبدیل ہو گئی تھیں، پی ایم یو (PMU) کے ذمہ بہت سارا کام آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے فنی مشاورت اور معاونت کے معاہدے کے باعث اپنے ذمہ لے لیا تھا ایسی صورتحال میں پی ایم یو کا کام محض دفتری نوعیت کا اور دیگر سرکاری اداروں کے ساتھ باہمی تعاون کی حد تک رہ گیا، یوں بھی ڈائریکٹر جنرل سمیت تینوں ڈائریکٹر صاحبان کا تعلق ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ سے تھا، فنی لحاظ سے وہ بالکل نابلد اور ناتجربہ کار تھے ویسے بھی ان کے پیش نظر تنخواہوں کے ساتھ اضافی سہولیات اور پراجیکٹ الاؤنس بھی تھا، اور یوں بھی آغا خان ٹرسٹ فار کلچر اپنی فنی مشاورت اور معاونت میں کسی طرح کی رخنہ اندازی قبول کرنے کے لیے

تیار نہیں تھا۔ صوبائی حکومت کو جتنی بھی پریزینٹیشن (Presentation) دی جاتیں اس کو آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے ماہرین ہی تیار کرتے اور عمومی طور پر اس کی پیش کش بھی انہی کے ذمہ تھی، ایسی صورتحال میں پی ایم یو محض ایک سرکاری دفتر بن کر رہ گیا۔

PC-1 کی تیسری نظر ثانی ۲۳ فروری ۲۰۰۸ء کو کی گئی جو کہ دوسری نظر ثانی کے ساڑھے تین ماہ بعد کی گئی۔ تیسری نظر ثانی میں مجموعی لاگت ۸۶۲ ملین روپے ہی رہی اور کوئی اضافی اخراجات کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ دفتری استعمال کے لیے ملٹی میڈیا، مووی کیمرہ، ڈیجیٹل کیمرہ، انٹرکام سسٹم، یو پی ایس (UPS)، جنریٹر، کمپیوٹر نیٹ ورکنگ جیسی اشیاء خریدنے کے لیے تبدیل کی گئی۔ ان اضافی اخراجات کی رقم مجوزہ ثقافتی عمارات کی خرید کے لیے مختص رقم میں کمی کر کے پوری کر لی گئی۔ PC-1 کی اس تیسری نظر ثانی بھی اس کے پہلے ڈائریکٹر جنرل محمد ہمایوں فرشوری نے ہی دی۔ پراجیکٹ کے آغاز سے لے کر ابھی تک محمد ہمایوں فرشوری ہی پراجیکٹ کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔

PC-1 کی چوتھی نظر ثانی

جنوری ۲۰۰۹ء آ گیا تھا اور ابھی تک پراجیکٹ کے خدوخال واضح ہونا شروع نہیں ہوئے تھے۔ ستمبر ۲۰۰۶ء سے جنوری ۲۰۰۹ء تک PC-1 کی چوتھی بار نظر ثانی کی گئی۔ ستمبر ۲۰۰۶ء سے پی ایم یو فعال ادارہ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۷ء کو پنجاب ہسٹارک ایریاز آرڈیننس ۲۰۰۷ء دسمبر ۱۴، ۲۰۰۷ء کو منظور ہو چکا تھا اور یوں ۲۴ دسمبر ۲۰۰۷ء کو حکومت پنجاب نے پنجاب ہسٹارک ایریاز اتھارٹی (Punjab Historic Area Authority) کا قیام عمل میں لایا۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ پی ایم یو کا قیام جس PC-1 کی بنیاد پر عمل میں لایا گیا تھا اس کی بنیاد اگست ۲۰۰۵ء میں تیار کی گئی۔ Mr. Raffaele Gorjic کی رپورٹ تھی۔

بعد ازاں جب آغا خان ٹرسٹ فار کلچر اور ورلڈ بینک کے ماہرین نے شاہی گزرگاہ کے پراجیکٹ پر بحث کی اور اس کے سبھی معاملات کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ محض شاہی گزرگاہ کے مختص کردہ علاقے میں کام شروع کر دینے سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ اس کے لیے پورے اندرون شہر لاہور کا ایک ماسٹر پلان تیار کرتے ہوئے شاہی گزرگاہ کے پراجیکٹ کو مکمل کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر منصوبہ بُری طرح ناکام ہو جائے گا۔ یہ منظور شدہ PC-1 میں ایک

بہت بڑی تبدیلی تھی۔ منصوبے کی اس نئی شکل کو چیف منسٹر پنجاب کے تشکیل کردہ فوکس گروپ کہ جس کے چیئر مین چیف سیکرٹری پنجاب تھے، کے سامنے منظوری کے لیے اس کے منعقد کردہ اجلاس مورخہ ۲۳ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو منظوری کے لیے پیش کر دیا گیا۔

PC-1 کی چوتھی نظر ثانی صرف پہلے اور دوسرے حصے میں کی گئی جبکہ تیسرے حصے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اور نہ ہی PC-1 کی مجموعی لاگت مبلغ ۸۶۲ ملین روپے میں تبدیلی آئی اور رقم کم ہو کر ۸۳۸ ملین روپے رہ گئی۔ اس لیے کہ پی ایم یو کی ملازمین کی تعداد اور ان کی تنخواہوں میں تبدیلی آئی تھی۔ نئی پوسٹیں شامل کی گئیں اور ان پوسٹوں کے ٹرم آف ریفرینس (TOR) کو PC-1 کا حصہ بنا دیا گیا۔ PC-1 کی اس چوتھی نظر ثانی کی منظوری اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل اوریا مقبول جان نے دی۔ PC-1 کا چوتھا نظر ثانی شدہ ڈرافٹ ۲۸ جنوری ۲۰۰۹ء کی پی ڈی ڈبلیو پی (PDWP) کی میٹنگ میں منظور کر لیا گیا۔

PC-1 کی چار دفعہ نظر ثانی کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہر بار PC-1 کی نظر ثانی کے پیچھے یا تو پی ایم یو (PMU) کے دفتر سے متعلق سہولیات، فرنیچر یا ملازمین کی تعداد یا ان کی تنخواہوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے یا پھر پائیلٹ پراجیکٹ کی ڈیزائن اور آئیڈیا میں تبدیلی سے اس کے کام کی حدود میں تبدیلی ہوتی رہی ہے، اس تبدیلی میں اگرچہ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر اور ورلڈ بینک کے ماہرین شامل رہے ہیں مگر PC-1 کی تفصیلات کے مطابق یہ واضح ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ ماہرین اندرون شہر لاہور کے ثقافتی ورثے کی بحالی کے لیے ان زمینی حقائق تک پہنچ نہیں پائے جن کا انہیں سامنا ہونے والا تھا، تجاوزات ہٹانے کے لیے ایک Resettlement Expert کو مشیر رکھنے کی منظوری کے ساتھ ایک Resettlement Officer کی اسامی بھی PC-1 کی چوتھی نظر ثانی میں شامل کر لی گئی اور ایک ماہر قانون بھی رکھ لیا گیا مگر جو مسائل حقیقی طور پر پیش آنے والے تھے ان کا کسی کو بھی ادراک نہیں تھا اور اگر کسی کو ادراک تھا بھی تو اس کے پیش نظر کوئی جامع لائحہ عمل نہیں تھا کہ جس پر عمل پیرا ہو کر شاہی گزرگاہ کے علاقے کو تجاوزات سے پاک کر لیا جائے۔

ابتدائی سٹرٹیجک فریم ورک

جولائی ۲۰۰۷ء کو پنجاب گورنمنٹ اور آغا خان ٹرسٹ فار کلچر (AKTC) اور ورلڈ بینک

کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا اور یوں پنجاب گورنمنٹ اور آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے درمیان پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کی رو سے اندرون شہر لاہور کے پائیلٹ پراجیکٹ کا فریم ورک جزوی طور پر تبدیل ہو گیا مگر پراجیکٹ کے لیے جو لائحہ عمل PC-1 میں طے کیا گیا تھا وہ کلی طور پر تبدیل ہو گیا تھا۔ اب انفراسٹرکچر سروسز کے ساتھ تاریخی و ثقافتی عمارات کی تزئین و آرائش و بحالی کا کام ایک ہی وقت میں کیا جانا تھا۔ انفراسٹرکچر سروسز کے لیے ایجنسیز نے جو اپنے اپنے PC-1 کنسلٹنٹس سے تیار کروائے تھے وہ سب مسترد کر دیئے گئے۔ اربن یونٹ نے جو Socio-Economic Survey تیار کروایا تھا اس کو ناقابل اعتبار سمجھا گیا اور نئے سرے سے اس کو کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

اس پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ کے تحت آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے ایک تفصیلی ابتدائی سٹرٹیجک فریم ورک بنانا تھا تاکہ نئے اندازِ فکر کے مطابق پراجیکٹ کی تیاری ڈیزائن اور اس کو عملی طور پر کرنے کے لیے ایک واضح جامع لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے فروری ۲۰۰۸ء میں یہ سٹرٹیجک فریم ورک تیار کر دیا گیا۔

یہ سٹرٹیجک فریم ورک شہر قدیم لاہور کے متعلق ایک جامع ڈاکومنٹ تھا۔ اس میں نہ صرف لاہور کی موجودہ صورتحال اور اس کا تاریخی تناظر میں جائزہ لیا گیا تھا بلکہ ان تمام ممکنہ خطرات اور خدشات پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی جو پیش آنے والے تھے اور جن کا سامنا کیے بغیر اندرون شہر لاہور کی اور اس کے رہائشیوں کی حالت نہ بدلنے والی تھی، یہ ایک حقیقت پسندانہ تصویر تھی، جسے ایک پیشہ ورانہ دیانتداری کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا یہ ایک شاعر کا ایسا خواب تھا جس کی تعبیر ممکن نہ تھی، مگر حقیقت پسندی سے جائزہ لینے والوں کا یہ یقین تھا کہ ایسا عملی طور پر ہو سکتا ہے اگر کرنے کا عزم کر لیا جائے تو کوئی ایسی رکاوٹ نہیں جسے راستے سے ہٹایا نہ جا سکتا ہو، بڑی گہری بصیرت اور عمیق تاریخی شعور کے ساتھ اس اسٹرٹیجک فریم ورک کو تیار کیا گیا تھا اور کوئی پہلو تشنہ نہ چھوڑا گیا۔ شہر قدیم لاہور پر یہ ایک تاریخی ڈاکومنٹ ہے جس کی تیاری کے لیے بہت محنت اور ذہانت استعمال کی گئی مگر اس کے معیار تک پہنچ کر اس پر عمل درآمد کرانے کے لیے جو ذہانت اور توانائی درکار تھی، PMU اور حکومت پنجاب کے افسران اس سے عاری تھے۔

اندرون شہر لاہور کے ثقافتی ورثے کی بحالی اور رہائش پذیر لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور روایتی ثقافتی سرگرمیوں کو فعال کرنے کے لیے جو لائحہ عمل اسٹریٹیجک فریم ورک میں تجویز کیا گیا تھا اس کے درج ذیل پانچ اہم پہلو تھے جو توجہ کے طالب تھے۔

۱۔ اندرون شہر لاہور کے ثقافتی ورثے کو مزید خراب ہونے سے بچانے کے لیے لازم ہے کہ کچھ ایسے اقدامات کیے جائیں کہ شہر پر بیرونی دباؤ کم ہو سکے، زمینی استعمال کی نئی اشکال دریافت کی جائیں، گاڑیوں کی آمدورفت میں کمی لائی جائے اور مقامی لوگوں کے لیے کشادہ عوامی پارک بحال کیے جائیں اور معیار زندگی کو بہتر بنایا جائے۔

۲۔ ہول سیل تجارتی سرگرمیوں کو نواحی علاقوں میں منتقل کر دیا جائے اور پرچون فروشی کی اعلیٰ معیاری دوکانداری کو فروغ دیا جائے تاکہ اندرون شہر لاہور کے انفراسٹرکچر سروسز پر پریشر کم ہو سکے۔

۳۔ شہر کی روایتی رونق واپس لانے کے لیے ضروری ہے کہ سیاحتی دلچسپی کی دوکانات کو ترجیح دی جائے۔ ثقافتی اور عمارتی اثاثوں کو محفوظ رکھنے کے لیے لائحہ عمل طے کیا جائے اور اس کے لیے پرائیویٹ سطح پر ٹورازم میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۴۔ اندرون شہر لاہور کے مقامی باشندوں کو اس میں فروغ پانے والے کاروبار کی منفعت میں حصہ ملنا چاہیے تاکہ وہ ملکیتی احساس کے ساتھ ان اثاثون کی حفاظت کو دلی طور پر قبول کریں۔ عوامی شمولیت سے ان کا معیار زندگی اور معاشی حالت دونوں افزوں ہوں گے۔

۵۔ عوامی شمولیت کے ساتھ ماحولیاتی معیارات بہتر کرنے سے اور اندرون شہر لاہور کی انفراسٹرکچر سروسز کا گریٹر لاہور سے ربط قائم کرنے پر یہ منصوبہ زیادہ عملی طور پر کامیابی سے ہمکنار ہو گا۔

اس رپورٹ کیمطابق جملہ مقاصد کے حصول اور ان کو قائم و جاری رکھنے کے لیے مجوزہ والڈسٹی اتھارٹی پر بہت بوجھ اور بے شمار توقعات وابستہ کی جا رہی تھیں۔ پراجیکٹ علیحدگی میں ٹکڑوں میں تقسیم کر کے عملی طور پر کامیابی کا حصول ناممکنات میں ہے لہٰذا مجوزہ اسٹریٹیجک فریم ورک ایسے تمام سوالات کے جوابات کماحقہ تلاش کرنے کی ایک کوشش کا نام ہے۔ ایسی واضح سمت اور جامع پالیسی کے ہوتے ہوئے اگر پراجیکٹ مکمل نہیں ہو پایا تو اس کے پیچھے

اسٹریٹجک پلان کا نہیں بلکہ اس پر عمل درآمد کرنے والوں کا ہی قصور ہوسکتا ہے۔ یہ بہت عمومی سطح کی کشادہ سوچ تھی عملی طور پر ان مقاصد کے حصول کے لیے تفصیلی نقشہ جات، تخمینہ جات اور تعمیرات کے لیے ماہرین اور مخلص لوگوں کی ضرورت تھی۔

اسٹریٹجک فریم ورک کے دوسرے حصے میں اندرون شہر لاہور کی موجودہ شہری سہولیات اور تعمیرات کی صورتحال کا ایک جائزہ پیش کیا گیا۔ اس کو تحریر کرتے وقت اندرون شہر پر کیے جانے والے سبھی تحقیقی و تاریخی کاموں کو پیش نظر رکھا گیا۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ میٹروپولیٹن لاہور کا کل رقبہ ۲۳۰۰ مربع کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی ستر لاکھ کے قریب ہے اس کے کل رقبے کا تھوڑا سا حصہ اس کی اکثریت آبادی کے زیر استعمال ہے جو معاشی اعتبار سے خوشحالی کی لکیر سے نیچے ہے اس رپورٹ میں نقشہ جات کی مدد سے لاہور کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ تاریخی تناظر میں شہر لاہور کی معاشی، سیاسی، تجارتی اور سماجی صورتحال کی پیش کش کی گئی۔ موجودہ پلاننگ فریم ورک کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا اور ماحولیات کے حوالے سے بھی بات کی گئی۔ انفراسٹرکچر سروسز کی موجودہ صورتحال کا ایک طائرانہ جائزہ بھی اس حصے میں شامل کیا گیا۔

اسٹریٹجک فریم ورک کے تیسرے حصے میں پراجیکٹ کی بہتری کے بارے میں تفصیلی نقطہ نظر پیش کیا گیا۔ شہر قدیم لاہور اس حوالے سے مختلف اور منفرد ضرور ہے کہ اس کے چاروں طرف سرکلر گارڈن ہے جہاں سرکلر روڈ ہے اور یہ واضح طور پر قدیم اور جدید شہر کو الگ کرتی ہے ایسے دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔ اسٹریٹجک پلان کے بنیادی مقاصد میں اندرون شہر لاہور کی اس جداگانہ حیثیت اور امتیازی وصف کو محفوظ کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اور پلان کو اس کے مطابق بنایا جانا چاہیے۔ دوسری بات جس پر زور دیا گیا وہ یہ تھی یہ تجاوزات اور غیر ضروری تعمیراتی اضافے اور ان سے منسلک خطرات سے نمٹنے کی جامع منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ تیسرا مقصد یہ بیان کیا گیا کہ ان مذکورہ نتائج کو حاصل کرنے کے لیے پراجیکٹ کو تین سطحوں پر پلان کرنے کی ضرورت ہے (۱) میٹروپولیٹن لاہور (۲) اندرون شہر لاہور (۳) کمیونٹی اور محلہ کی سطح پر۔ میٹروپولیٹن کی سطح پر وژن کو اجاگر کرنے کے لیے مزید تین اجزاء بیان کیے گئے۔

(۱) شہر قدیم لاہور کو اس کے وسیع بیرونی تناظر میں دیکھا جانا ضروری ہے کہ کس طرح اس کا نواحی علاقوں سے ٹرانسپورٹ کے ذریعے رابطہ ہوتا ہے اور اس کی امتیازی حیثیت

سرکلر گارڈن کی وجہ سے قائم ہوتی ہے۔

(۲) شہر قدیم لاہور پر بیرونی طور پر پڑنے والے تجارتی و کمرشل پریشر کو ختم کرنا بہت ضروری ہے اور اس کے لیے ہول سیل مارکیٹ شہر قدیم لاہور میں ختم کرنا ہوگی۔

(۳) نواح میں اہم مسئلہ پارکنگ کی سہولت فراہم کرنا ہے اور انیسویں اور بیسویں صدی کی اہم عمارات کی حفاظت اور مقامی لوگوں کو رہائش کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

اندرون شہر لاہور کی سطح پر پراجیکٹ پلان کرتے ہوئے درج ذیل امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہوگا۔

(۱) غیر مناسب زمینی استعمال کو تبدیل کرنا ہوگا تا کہ اندرون شہر میں رہائشی سرگرمیوں کو فروغ ملے۔

(۲) اندرون شہر میں ٹریفک کے لیے محدود سہولیات اور پیدل چلنے کی عادت میں اضافہ کا فروغ کرنا ہوگا۔

(۳) راستوں کو پیدل چلنے والوں کے لیے بہتر کرنے کے ساتھ کھلی جگہوں کو دوبارہ بنانا ہوگا تا کہ ماحولیات پر بہتر اثر پڑے۔

(۴) انفراسٹرکچر سروسز کو بہتر بنانا ہوگا۔

(۵) تاریخی وثقافتی ورثے کو بحال اور بہتر کرنا ہوگا۔

(۶) ٹورزم کی حوصلہ افزائی کے لیے مناسب اقدامات کرنا ہوں گے۔

(۷) اندرون شہر لاہور میں پرچون فروشی تک ہی تجارتی سرگرمیوں کو محدود کرنا ہوگا۔

کمیونٹی اور محلہ کی سطح پر اہم نکات مدنظر رکھنا ہوں گے۔

(۱) شہریوں کی صحت اور تعلیم کی بہتری کرنا ضروری ہے۔

(۲) شہریوں کے لیے روزگار کے مواقعوں کی فراہمی۔

(۳) زمینی و مکانی استعمال کو کنٹرول کرنا، شہری رہائشی سہولیات کی فراہمی و بہتری۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے پیش کردہ اسٹریٹیجک فریم ورک کے چوتھے حصے میں اندرون شہر لاہور سے ملحقہ نواحی علاقوں کی بہتری کے لیے تجاویز بھی دی گئیں۔ اس لیے کہ ان میں بہتری لائے بغیر صرف اندرون شہر لاہور کے تحفظ اور بہتر سہولیات کی فراہمی موثر نہ ہو سکتی تھی۔ ان میں درج ذیل تجاویز پیش کی گئیں۔

ے بہتر بنانا۔

- فورٹ روڈ اور علی پارک کی بہتری تا کہ قلعہ لاہور سے بہتر بصری تعلق قائم ہو سکے۔

۴۔ شاہی گزرگاہ کی تعمیرات و انفراسٹرکچر سروسز کی بحالی و بہتری، ٹریفک و ماحولیات کی بہتری۔

۵۔ ایک رہائشی محلّہ کی عمارات کی بحالی و انفراسٹرکچر سہولیات کی فراہمی تا کہ اس کے تجربے سے شاہی گزرگاہ کا پراجیکٹ اور پھر اس تجربہ کی روشنی میں پورا اندرون شہر لاہور کا پراجیکٹ مکمل کیا جا سکے۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر (AKTC) کی اس رپورٹ نے جو کہ پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے آٹھ ماہ بعد پیش کی گئی، ایک مرتبہ پھر شاہی گزرگاہ کے پراجیکٹ کے کام کی حدود میں بے شمار تبدیلیاں تجویز کر دیں۔ ابتداء میں ان کا فوکس یہی تھا کہ شاہی گزرگاہ کے پراجیکٹ کو مکمل کرنے کے لیے بہتر اور عملی طور پر موثر طریقہ کار یہ ہوگا کہ انفراسٹرکچر سہولیات اور عمارات کی تزئین و آرائش کی بحالی کا کام ایک ہی وقت میں ایک پراجیکٹ کے طور پر اور ایک ہی ٹھیکیدار سے کروایا جائے۔ اب اسٹریٹیجک فریم ورک کی تیاری کے بعد نہ صرف فصیل کے اندر پورے شہر قدیم لاہور کے لیے مجموعی سطح پر ماسٹر پلان کی ضرورت کو لازمی سمجھا گیا بلکہ فصیل کے نواح میں موجود جگہوں اور عمارات کو نظر انداز نہ کرنے کے بارے میں زور دیا گیا۔ گویا پراجیکٹ محض شاہی گزرگاہ سے بڑھ کر پورے شہر قدیم لاہور اور اس کے نواحی رقبے تک پھیل گیا۔ اس پر عمل درآمد کروانے کے لیے حکومتی سطح پر، سیاسی سطح پر اور انتظامی سطح پر کئی ایک فیصلوں کی ضرورت تھی جو اس اسٹریٹیجک فریم ورک کے نتیجے کے طور پر سامنے آئے تھے۔ یہ بہت مشکل اور تقریباً ناممکن کام تھے لہٰذا پراجیکٹ کا تعطل کا شکار ہونا قدرتی امر تھا۔ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کی توجہ شاہی گزرگاہ سے ہٹ کر اندرون شہر اور اس سے ملحقہ دیگر پراجیکٹس تک پھیل گئی۔ اس کے لیے اگر انہوں نے لاہور شہر کے تمام پارکوں کی اسٹڈی کروائی تو دوسری جانب انفراسٹرکچر سہولیات کی فراہمی کے لیے سارے شہر قدیم لاہور کے لیے ایک ماسٹر پلان کی تیاری اور اس

نہایت مشکل کام تھا اور اس کے لیے اضافی اخراجات کی ضرورت تھی جو لہٰذا غا...
کلچر کو اپنے ذرائع سے پیدا کرنے تھے اس لیے کہ ورلڈ بینک کے ساتھ حکومت پنجاب
معاہدے میں ایسی کوئی گنجائش نہ تھی۔
سرکلر گارڈن میں تجاوزات کا ایک تفصیلی سروے کیا گیا تاکہ ایسی جامع منصوبہ بندی
کی جاسکے کہ اگر ان تجاوزات کو یہاں سے ہٹانا ہے تو کس طرح ان دکانداروں کو دوسری
جگہ پر منتقل کرنا ہے اس کے لیے ورلڈ بینک کی ہدایات و پالیسی کی روشنی میں ایک
Resettlement Policy بنانے کی ضرورت تھی۔ سرکلر گارڈن میں موجود سرکاری عمارات،
سکولوں، تھانے وغیرہ کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے بھی جامع منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔
اندرون شہر لاہور میں پندرھویں اور سولہویں صدی کی تاریخی عمارات کی تفصیلی
ڈاکومینٹیشن اور ان کی تزئین و آرائش و بحالی کے لیے الگ سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس
کے لیے آغاخان ٹرسٹ فار کلچر نے الگ سے فنڈز کا انتظام کیا اور مسجد وزیر خان کی
ڈاکومینٹیشن، نقشہ جات، زمینی معائنہ کی رپورٹ اور عمارت کی استقامت کی رپورٹ تیار کی
گئیں، رم مارکیٹ، علی پارک اور مریم زمانی مسجد سے ملحقہ تجاوزات کو ہٹانے کے لیے موثر
لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ واپڈا نے پہلے سے سرکلر گارڈن میں تین گرڈ سٹیشن بنا
رکھے تھے اور چوتھے کی تعمیر شروع کر دی تھی۔ یہ گرڈ سٹیشن اندرون لاہور کو کم اور نواحی علاقوں کو
زیادہ بجلی فراہم کر رہے تھے ان کو سرکلر گارڈن سے ہٹانا بذات خود ناممکنات میں سے تھا البتہ
چوتھے گرڈ سٹیشن کی تعمیر گورنر پنجاب کے حکم سے روک دی گئی تھی۔
اندرون شہر کے اندر ٹرانسفارمرز کے لیے زمین کا خریدنا ایک الگ مسئلہ تھا، واسا کی
ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے شہر کی اندرونی آبادی میں پانی فراہم کرنے کیلیے ایک طریقہ کار
وضع کرنے کی ضرورت تھی اس لیے کہ پانی والا تالاب ضروریات پوری نہیں کر رہا تھا، واسا نے
سرکلر گارڈن میں ۲۲ عدد ٹیوب ویل لگا رکھے تھے ان میں سے صرف سات ٹیوب فعال تھے
پانی براہ راست لوگوں کے گھروں تک پہنچاتے تھے بغیر پانی کی ٹینکی کے صاف پانی کی فراہ

کے لیے کنسلٹنٹس کا مقرر کیا جاتا تھا جو شاہی گزرگاہ

بہت مشکل تھی۔

شہر قدیم کی گلیاں اور سڑکیں واپڈا کے ٹرانسفارمر، بجلی، ٹیلی فون کی تاریں اور پانی و گیس کے زمین پر پڑے ہوئے پائپوں نے ماسٹر پلان تیار کرنے والوں کے لیے بے شمار چیلنجز (Challenges) سامنے لا کھڑے کیے تھے۔ اندرون شہر کے اوپر سے تجارتی دباؤ کم کرنا تھا تو اس کے لیے ایک جانب اگر نئے تعمیر ہونے والے پلازوں کو روکنا تھا تو دوسری جانب بادامی باغ کے لاری اڈے کو ختم کرنا تھا اس کے لیے دیگر جگہوں کی تلاش ایک الگ مسئلہ تھا، ٹرکوں اور ان کے ساتھ وابستہ فارورڈنگ ایجنسیوں کے کاروبار کو ختم کرنے کے لیے بہت توانائی کی ضرورت تھی۔

ان تمام زمینی حقائق اور فنی مشکلات کے علاوہ صوبے میں سیاسی عدم استحکام نے بھی اس منصوبہ پر منفی اثرات مرتب کیے۔ وزیراعلیٰ کے تبدیل ہونے کے بعد نئے وزیراعلیٰ نے ایک سال تک اس پراجیکٹ کے لیے ڈائریکٹر جنرل کی تعیناتی کو ہی ضروری نہ سمجھا۔ تین ڈائریکٹرز میں سے بھی صرف ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کام کر رہا تھا، راستے کا تعین تھا مگر زادِ سفر نہیں تھا اور پھر پُرخطر راستے کے بے شمار خوف اور خدشات نے ایک سال سے زائد عرصہ تک تو اس پراجیکٹ کو بالکل مردہ کیے رکھا۔ پھر اوریا مقبول جان کو ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا جس نے صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد ضروری سمجھا کہ ڈائریکٹرز کی دونوں خالی پوسٹوں پر ٹیکنیکل لوگوں کی تعیناتی کی جائے اس مقصد کے لیے محکمہ آثار قدیمہ سے اور محکمہ اوقاف سے ڈائریکٹر کلچرل ہیریٹیج اور ڈائریکٹر انفراسٹرکچر کی پوسٹوں کے لیے ٹیکنیکل افسران ڈیپوٹیشن پر لائے اور ایک مرتبہ پھر پراجیکٹ کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ یہ جون ۲۰۰۸ء کی بات ہے۔ اسٹریٹیجک فریم ورک کو آئے ابھی پانچ چھ ماہ گزرے تھے۔ مگر پراجیکٹ کو شروع ہوئے دو سال گزر چکے تھے، حکومتی ایوانوں اور عوامی حلقوں کی جانب سے شدید تنقید کا سامنا تھا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود ابھی تک عملی طور پر پراجیکٹ شروع ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے مطابق پراجیکٹ کا Rehabilitations حصہ ان کے ذمہ تھا جس میں عمارتوں کے بیرونی منظر ناموں کی اصلاح اور بحالی کرنا تھا جبکہ دوسرے اہم حصے میں انفراسٹرا کچر سروسز کی بہتری کے لیے اگر ایک جانب آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے غیر ملکی ماہرین کی مدد سے ایک ماسٹر پلان تیار کرنا تھا تو دوسری جانب پی ایم یو نے تفصیلی ڈیزائنگ کے لیے

مقامی کنسلٹنٹس ورلڈ بینک کی مالی معاونت سے مقرر کرنا تھے۔ مجموعی طور پر اس طریقہ کار کو Integrated-Coordinated Design کا نام دیا گیا۔

آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے شہر قدیم لاہور کی انفراسٹرکچر سروسز کے اجمالی پلان (Conceptual Design) کے لیے دوبئی کی ایک مشاورتی فرم اوریکان (Ourecon) کی خدمات ستمبر ۲۰۰۸ء میں حاصل کیں اوران کو لاہور آنے کی دعوت دی اسی طرح پی ایم یو نے اوریکان کی معاونت اور انفراسٹرکچر سروسز کے تفصیلی ڈیزائن کے لیے لاہور کی کنسلٹینسی فرم اے سی ای پرائیویٹ لمیٹڈ ACE(Pvt)Ltd ورلڈ بینک کی منظوری کے بعد حاصل کی۔ اوریکان کا کام ایک اجمالی پلان تھا جبکہ اے سی ای نے ان ہی سفارشات کے مطابق تفصیلی پلان تیار کرنا تھا۔

اوریکان نے اپنی پہلی ڈرافٹ رپورٹ جنوری ۲۰۰۹ء میں بحث اور تبصرہ کے لیے پیش کی۔ اوریکان نے انفراسٹرکچر سروسز کی حالیہ صورتحال کا نہایت باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا اور پھر ان کی بہتری کے لیے تجاویز پیش کیں۔

ا۔ واٹر سپلائی: اوریکان نے واسا (WASA) کی مہیا کردہ معلومات اور معاونت کے ساتھ شہر قدیم لاہور میں پینے والے پانی کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اندرون شہر میں پانی زیر زمین پانی کے ذخیرے سے حاصل کیا جاتا ہے مگر نکالے جانے والے پانی کی مقدار زیادہ ہے اور زیر زمین اکٹھے ہونے والے پانی کی مقدار کم پڑ جاتی ہے۔ پانی ٹیوب ویل کے ذریعے گھروں تک براہِ راست پائپوں سے پہنچایا جاتا ہے۔ یہ پائپ بُری حالت میں ہیں اور پانی میں آلودگی کا سبب بنتے ہیں۔ پینے والے پانی کے لیے میٹر بھی نہیں ہے۔ ماہانہ ایک مختص رقم مکینوں سے پانی کے بل کے طور پر لی جاتی ہے لہٰذا مکین پانی کے ضائع ہونے پر کوئی زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ پانی کی صفائی اور بیکٹیریا کے لیے کوئی سسٹم اس لیے موجود نہیں ہے کہ ٹیوب ویل سے پانی ٹینکی میں جانے کے بجائے براہ راست گھروں تک جاتا ہے۔ لہٰذا کلورین وغیرہ کا استعمال ممکن نہیں ہے۔ گھروں میں غیر قانونی پانی کے کنکشن موجود ہیں جس سے آلودگی میں اضافہ ہوتا ہے، ان کنکشن کے جوڑوں سے پانی زمین میں جذب ہوتا رہتا ہے۔

اسی صورتحال سے نمٹنے اور پانی کو آلودگی سے بچانے کے لیے اوریکان نے تجویز کیا کہ پانی کو آلودگی سے پاک رکھنے کے لیے پانی ذخیرہ کرنے والی جگہ پر ادویات کا مناسب استعمال

اور اس کی نگرانی کے طریقہ کار کو موثر بنانے کی ضرورت ہے۔ زمینی پانی کے نیچے چلے جانے کا حل یہ ہے کہ بارشی پانی کو شہر کے گرد ذخیرہ کیا جائے تا کہ یہ پانی دوبارہ زیر زمین جا کر پانی کی سطح کو مزید گہرا ہونے سے بچانے میں مدد کرے۔ پانی کی چوبیس گھنٹے مطلوبہ مقدار میں ہر مکین کو فراہمی کے لیے چار عدد بڑی پانی کی ٹینکیاں بنانے کی ضرورت ہے اور مزید ٹیوب ویل اور پانی لے جانے والے پائپوں کے قطر کو اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔

۲۔ نکاسی آب: واسا کے مہیا کردہ ڈاٹا اور معلومات اور موقع کی صورتحال کا معائنہ کرنے کے بعد اوریکان کی ٹیم درج ذیل نتائج پر پہنچی۔

پہلے سے موجود نکاسی آب کا نظام کچھ جگہوں پر نالیاں (کھلی اور جزوی طور پر ڈھکی ہوئیں) اور کچھ جگہوں پر پائپ پر مشتمل ہے۔ اور یہ نکاسی آب کا نظام ہر طرح کے پانی اور سیور کی نکاسی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے بارشی پانی کی نکاسی ہوتی ہے اور اسی سے سیور اور صنعتی فاضل پانی کی نکاسی کی جاتی ہے۔ یہ نالیاں چونکہ ڈھکی ہوئی نہ ہیں اور جہاں پائپ ہیں وہاں مین ہول کے ڈھکنے نہ ہیں اس لیے کوڑا کرکٹ ان میں جمع ہو جاتا ہے جو کہ کئی طرح کی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ سیور کی نکاسی کے لیے کنکریٹ کے پائپ اور کھلی نالیاں حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق آج قابل قبول نہ ہیں۔ شہر میں کوڑا کرکٹ کا کسی ایک جگہ اکٹھا ہونا اور پھر اس کو Treatment کرنے کا کوئی پلانٹ موجود نہ ہے۔ یہ تمام سیور کوڑا کرکٹ کے ساتھ قریبی دریا تک گندے نالوں کے ذریعے پہنچ کر دریا کو بھی آلودہ کرتا ہے۔ اس سے ماحولیاتی آلودگی بھی ہوتی ہے۔

ایسی صورتحال سے نمٹنے کے لیے اوریکان نے تجویز دی کہ بہاؤ کی استعداد بڑھانے کے لیے بارشی پانی اور سیور کے پانی کو الگ الگ راستوں سے گزرنا چاہیے، الگ الگ پائپ استعمال کرنے چاہیے۔ پینے والے پانی کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے دیگر گندے پانی کو الگ الگ رکھنا چاہیے۔ بارشی پانی کا علیحدہ سے نظام متعارف کروانے کی ضرورت ہے۔ ایک موثر نظام کی عدم موجودگی میں کوئی بھی سیور کا نیٹ ورک اور اس کے Treatment Plant کی عدم موجودگی میں مطلوبہ نتائج حاصل ہونے بہت مشکل ہیں۔ یہ بات خوش آئند اور حوصلہ افزاء ہے کہ شہر کے لیے ایسی سہولیات کی فراہمی پر اس وقت کام شروع ہو چکا ہے۔

۳۔ بارشی پانی: بارشی پانی کی نکاسی کے لیے ایک جامع، قابل عمل اور موثر نظام اندرون

شہر کے لیے متعارف کروانے کی اشد ضرورت ہے اگر پانی کی نکاسی کا ناکافی بندوبست ہوگا تو سیلابی صورتحال سے گزرنا ہوگا اور اگر بڑے پائپ مہیا کیے جائیں گے تو بہاؤ میں کمی کے باعث آلودگی میں اضافہ ہوگا لہٰذا ہونے والی بارشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب استعداد والا نظام متعارف کروانے کی اشد ضرورت ہے۔

شہر کے گرد جہاں مناسب ہو اگر بارشی پانی کو کچھ وقت کے لیے ذخیرہ کرنے کا انتظام ہو تو اس سے تہہ زمین پانی اوپر آ جائے گا۔ اس ذخیرہ ہونے والے پانی کو اگر زراعت و باغبانی میں استعمال کیا جا سکے تو یہ بہت سودمند ہوگا۔

۴۔ الیکٹرک سٹی: لاہور میں لیسکو (LESCO) کا ادارہ ضروریات کے مطابق بجلی مہیا کرنے کے لیے فعال ہے لیسکو نے اوریکان کی ٹیم کو بنیادی معلومات اور ڈاٹا فراہم کیا۔

۱۔ اس وقت اندرون شہر لاہور میں بجلی مہیا کرنے والے تین گرڈ سٹیشن ہیں جو کہ ناکافی ہیں اس کے لیے ایک چوتھے گرڈ سٹیشن کی تعمیر انتہائی ضروری ہے۔

۲۔ ہائی وولٹیج کا نیٹ ورک اس وقت کامیابی سے کام کر رہا ہے۔

۳۔ لو وولٹیج (Low Voltage) کا تقسیمی نظام کئی مسائل کا شکار ہے اس میں مرمت جمالیات، حفاظت اور فعالیت کے مسائل درپیش ہیں تاریخی اور ثقافتی عمارات بری طرح اس کی زد میں ہیں۔

۴۔ گلیوں میں مناسب روشنی کے لیے لائیٹ کا انتظام خصوصی توجہ کا منتظر ہے۔

اوریکان نے تفصیلی جائزے کے بعد اپنے اجمالی خاکے (Conecptual Plan) میں ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے مناسب تجاویز پیش کیں۔

(۱) الیکٹرونک میٹر لگائے جائیں تاکہ فاصلے سے ریڈنگ پڑھی جا سکے۔

(۲) تنگ اور چھوٹی گلیوں میں زیرِ زمین تاروں کو بچھانے کے لیے (Fuse Pits) بنائی جائیں گی۔

(۳) بجلی کی مسلسل فراہمی کو بنانے کے لیے ایک سسٹم بنایا جائے تاکہ مرحلوں میں کام ہو سکے۔

(۴) لیسکو گرڈ سٹیشن کو بہتر کرنے کے لیے پہلے ہی کام کر رہی ہے جو کہ انتہائی ضروری ہے۔

۵۔ ٹیلی کمیونیکیشن: اس وقت اندرون شہر میں پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کارپوریشن لمیٹڈ ٹیلی فون کی سہولت فراہم کر رہی ہے۔ پی ٹی سی ایل نے اوریکان کو موجودہ صورتحال کے بارے

میں آگاہ کیا اور بنیادی معلومات فراہم کیں۔ اوریکان نے درج ذیل مسائل کی جانب توجہ مبذول کرائی۔

۱۔ شہر اندرون میں اس وقت گھریلو ٹیلی فون، موبائل فون نیٹ ورک، ٹیلی ویژن سروسز موجود ہیں۔

۲۔ مستقبل اور حال کی ضروریات کو احسن طریق سے پورا کرنے کے لیے ان سہولیات کے معیار کو بہتر بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

۳۔ پی ٹی سی ایل نے اس وقت بیرون لاہور شہر قدیم میں جزوی طور پر فائبر آپٹک کیبل کی سہولت مہیا کر رکھی ہے۔

۴۔ کاپر کیبل اور الیکٹرسٹی کیبل کے جال اندرون شہر لاہور میں جگہ جگہ گڈمڈ ہوئے ہیں۔

۵۔ کچھ حصے میں لاسلکی نظام کے تحت بھی ٹیلی فون کی سہولت دی گئی ہے۔

۶۔ موبائل فون کی سروس پانچ کمپنیاں اس وقت دے رہی ہیں۔

۷۔ ٹیلی ویژن سروس بھی پی ٹی سی ایل نے مہیا کر رکھی ہے۔

اوریکان نے مذکورہ صورتحال کے پیش نظر تجویز کیا کہ زیر زمین دیگر سروسز کے ساتھ ٹیلی فون سروس کی تاروں کو بھی جگہ مہیا کی جائے تاکہ تاروں کے جال سے تاریخی، ثقافتی، عمارتوں کا گہنایا ہوا حسن واپس آ سکے۔ اس کے لیے مرحلہ وار تبدیلی لائی جائے تاکہ سہولت کی فراہمی تسلسل کے ساتھ عوام کو فراہم رہے۔ چھوٹی گلیوں میں تاروں کو سنبھالنے کے لیے کوئی موثر نظام متعارف کروانے کی ضرورت ہے۔

۶۔ سوئی ناردرن گیس: اس وقت شہر قدیم لاہور میں چار فٹ تک کی چوڑی گلیوں تک سوئی گیس کی فراہمی زیر زمین موجود ہے۔ جبکہ چار فٹ سے کم چوڑی گلیوں میں پائپ زمین سے باہر گھروں تک پہنچتے ہیں اور گلی کے شروع میں میٹر لگائے گئے ہیں۔ شہر میں گیس زیادہ تر کھانے پکانے اور پانی گرم کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ سہولت قدرے نئی ہے تاہم سوئی ناردرن گیس کا محکمہ ہی سارے کام سنبھالے ہوئے ہے۔

اندرون شہر لاہور کی انفراسٹرکچر سروسز کے لیے جو اجمالی خاکہ اوریکان نے تیار کیا تھا وہ اس لحاظ سے تو بہت اہم سٹڈی تھی کہ فصیلوں کے اندر بسے ہوئے قدیمی شہر کے مکانات تک انفراسٹرکچر سروسز مثلاً پانی، بجلی، گیس سیوریج، نکاسی آب وغیرہ پہنچانے کے لیے موجودہ

صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے پہلی مرتبہ کسی نے اس انداز سے سوچا تھا، وگرنہ اس سے قبل جتنی بھی تحقیق ہوئی تھی وہ اندرون شہر کے مخصوص گلی کوچے یا تاریخی عمارات کی تزئین و آرائش اور بحالی کی حد تک تھی، اندرون شہر لاہور کو ایک اکائی کے طور پر بستی کی تمام لازمی سہولیات کی فراہمی کے حوالے سے پہلی مرتبہ ماہرین نے جائزہ لیا تھا۔ یہ ماہرین اگرچہ مقامی رہنے والے نہیں تھے۔ غیر ملکی انجینئر تھے جنہوں نے دو تین بار چند گھنٹے اندرون شہر میں گزارنے کے بعد کچھ نتائج مرتب کیے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ایک طرف اگر آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے تجربہ کار ماہرین دست و بازو بنے ہوئے تھے جبکہ دوسری جانب مقامی کنسلٹنیسی فرم اے سی ای پرائیویٹ لمیٹڈ کے سینئر ٹیکنوکریٹ اپنے کئی دہائیوں پر پھیلے عملی تجربے کے ساتھ اور ریکان کی معاونت کے لیے ساتھ ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ انفراسٹرکچر سہولیات فراہم کرنے والی سرکاری کمپنیاں جیسے لیسکو، سوئی ناردرن گیس، پی ٹی سی ایل اور واسا کے ماہرین بھی ہمہ وقت تعاون کے لیے حاضر تھے۔

ایسی صورتحال میں غیر ملکی ماہرین کیلیے ایک فعال کامیاب اور باعمل اجمالی خاکہ Conceptual Design تیار کرنے میں کوئی مشکلات نہیں ہونا چاہیے تھی اور ریکان نے نہایت محنت عرق ریزی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ اجمالی خاکہ انفراسٹرکچر سروسز کی بہتری کے لیے تیار کیا تھا جبکہ تاریخی عمارات اور اندرون شہر کے قدیمی مکانات کی تزئین و آرائش اور بہتری کے لیے فنِ تعمیرات کے نقشہ جات آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے تیار کرنا تھے۔

Conceptual Design میں واسا کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق چوبیس گھنٹے کے لیے فی فرد ۸۰ لیٹر کے حساب سے پانی درکار تھا اور موجودہ ٹیوب ویل جتنا پانی فی سیکنڈ کے حساب سے فراہم کرتے تھے، اور ریکان کے حساب سے ۶۲ مزید ٹیوب ویل درکار تھے جن کو اور ریکان نے سرکلر گارڈن میں پھیلا دیا۔ اتنے سارے ٹیوب ویل دیکھ کر کئی سوال بہ یک وقت ذہن میں ابھرے، اگر اس وقت سات ٹیوب ویل اندرون لاہور کے لیے پانی فراہم کرتے ہیں تو مزید اتنی زیادہ تعداد میں ٹیوب ویلوں کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر اتنے زیادہ ٹیوب ویل لگا دیئے گئے تو کیا زیر زمین اتنا پانی ہوگا کہ یہ ٹیوب ویل چلائے جا سکیں اور ان ٹیوب ویل کو چلانے کے لیے کتنی بجلی اور کتنے افراد درکار ہوں گے۔

اگلی بات یہ تھی کہ ان ٹیوب ویلوں نے پانی ان چار بڑی بڑی ٹینکیوں میں ذخیرہ کرنا تھا جو شہر کے گرد تعمیر کی جانے کی تجویز دی گئی تھی۔ وہاں سے پانی پمپوں کے ذریعے اندرون شہر کے ہر گھر کے باہر بنے زیرزمین پانی کے ٹینک میں جمع ہونا تھا اور وہاں سے ایک اور پمپ کے ذریعے پانی ان زیرزمین ٹینکیوں سے چھتوں پر رکھی ٹینکیوں میں پہنچنا تھا تاکہ چوبیس گھنٹے ہر فرد کی ضرورت کے مطابق ہمہ وقت پانی موجود رہ سکے۔

اس نظام کو سمجھتے ہوئے غیرملکی ماہرین کی خدمت میں کئی سوال پیش کیے گئے، الیکٹرسٹی کی لوڈشیڈنگ کو تو مجوزہ جنریٹر کے ذریعے پورا کیا جا سکتا ہے مگر ایک گھر میں پانی پہنچانے کے لیے چار پمپ استعمال ہونا تھے، پہلے پمپ نے زیرزمین پانی کو پانی کی ایک بڑی ٹینکی میں ذخیرہ کرنا تھا، وہاں سے پمپ کے ذریعے پانی گھر کے باہر زیرزمین انفرادی پانی کی ٹینکی تک پہنچنا تھا اور وہاں سے پانی ہر گھر کی چھت پر رکھے پانی کے ٹینک تک پہنچنا تھا۔ اور اگر اندرون شہر کی اونچائی کو مدنظر رکھا جائے تو پانی کی چار بڑی ٹینکیوں کو کم و بیش ۸۰ سے ۱۰۰ فٹ کی بلندی تک تعمیر کرنے سے مقاصد حاصل ہونا تھے اور ایک تاریخی اور ثقافتی شہر کے باہر اتنی بڑی گنجائش والی اتنی اونچی چار عدد ٹینکیوں سے کیا بصری تاثر بننا تھا یہ معاملہ الگ غور طلب تھا۔ اور تین پمپوں کی بجلی اور مطلوبہ ملازمین کی تنخواہیں اور سالانہ اخراجات کا بوجھ اندرون شہر کے غریب مکینوں نے اٹھانا تھا، اس مہنگے حل کی جانب جب توجہ دلائی گئی تو جواب ملا صاف شفاف پانی پینے کے لیے خرچہ تو برداشت کرنا ہوگا۔

بعدازاں ان چار پانی کی ٹینکیوں کو زیرزمین کر دیا گیا کہ ان کا بصری تاثر قابل قبول نہ تھا مگر ظاہر ہے اس سے اخراجات میں مزید اضافہ ہونا تھا۔ جب غیرملکی ماہرین کو تنگ اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں جگہ کے نہ ہونے کے بارے میں بتایا گیا کہ زیرزمین پانی کی انفرادی ٹینکی کی تعمیر ہر گھر کے باہر گلی میں ممکن نہ ہوگی کہ جہاں سے زیرزمین انفراسٹرکچر کے پائپوں نے بھی گزرنا ہے تو اس زیرزمین انفرادی ٹینکی کو ختم کرتے ہوئے پمپ کی پاور میں اضافہ کر دیا گیا کہ جس نے سرکلر گارڈن کی زیرزمین پانی کی بڑی ٹینکی سے پانی کو براہ راست گھر کی تیسری یا چوتھی منزل کی چھت تک پہنچانا تھا۔

واسا کے افسران نے ۸۰ لیٹر فی فرد پانی کی ضرورت کو کم کر کے ۳۵ لیٹر کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اندرون شہر کے چھوٹے گھروں اور بغیر لان کے مکانوں میں پانی کی اتنی زیادہ

ضرورت نہ تھی، اس صورت حال سے ایک تو ٹیوب ویل کی تعداد میں کمی ہوگئی اور دوسرا جب ماہرین کو بتایا گیا کہ اس وقت لگے ہوئے ٹیوب ویل پانی فی منٹ کے حساب سے اتنا مہیا کر رہے ہیں تو غیر ملکی ماہرین نے ٹیوب ویل کی تعداد ۶۲ سے کم کر کے ۲۲ کر دی جو کہ پہلے ہی سرکلر گارڈن میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ ان میں سے صرف ۷ ٹیوب ویل فعال تھے۔ ابھی اندرون شہر کے ۲۲۰۰ گھروں میں پانی پہنچانے کے لیے سرکلر گارڈن میں مجوزہ زیرزمین پانی کی ٹینکی سے گھروں تک پانی لے جانے والے پائپوں کا قطر معلوم کرنا تھا۔

دوسرا اہم مسئلہ نکاسی کے لیے تجویز کردہ پائپ کے قطر کا تھا۔ واسا کی ضروریات و معیار کے مطابق کم از کم قطر ۱۸ انچ تھا اور ان کی ضرورت کنکریٹ کے پائپ تھے۔ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے کنسلٹنٹ کے مطابق یہ قطر ۶ انچ بھی کافی تھا۔ ان پائپوں نے گلیوں میں بچھایا جانا تھا ایک مین ہول سے دوسرے مین ہول تک اور درمیان میں Y جوڑ سے ان کا ۶ انچ قطر کے پائپوں کے ساتھ ہر گھر سے نکلنے والے پائپ نے بھی جڑنا تھا۔ تمام انفراسٹرکچر سروسز کے پائپوں نے زیرزمین ۱۸ انچ موٹی کنکریٹ کی تہہ کے اندر دفن ہونا تھا تاکہ کوئی گلی کا فرش اکھاڑ کر غیر قانونی کنکشن نہ لے سکے۔ گھروں سے باہر نکلنے والے نکاسی کے پائپ میں کوئی پی ٹریپ (P-Trap) نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ہوا کے اخراج کے لیے پائپ (Vent Pipe) تجویز کیا گیا تھا۔ البتہ ایک راڈ کے ذریعے بند ہونے والے پائپ کو (SNACK کے ذریعے) کھولنے کی تجویز دی گئی تھی اور اس کے لیے تجویز کیا گیا کہ ہر گلی میں کمیونٹی ایک تنظیم کے ذریعے اپنی مدد آپ کے ذریعے صفائی کا یہ انتظام جاری رکھے گی۔ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر والے بااعتماد تھے کہ پائپ کا یہ قطر اور نکاسی کا یہ نظام اس لیے ضروری ہے کہ کوڑا کرکٹ کسی طرح بھی ان پائپوں میں نہ جائے۔ انہوں نے ورلڈ بینک کے ماہر Kevin Tayler سے بھی اس مجوزہ نظام ہائے نکاسی کی منظوری حاصل کر لی تھی۔ مگر نہ تو پی ایم یو کے ماہرین اور نہ ہی اے سی ای پرائیویٹ لمیٹڈ کے انجینئرز اس کی کامیابی پر متفق تھے مگر آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے ماہرین نے کسی کی بات نہ سنی اور اسی پر بضد رہے۔

الیکٹرسٹی کے ٹرانسفارمر جو کہ اس وقت دو سے تین سو (KV) کے اندرون شہر میں لگائے گئے تھے۔ ان کے بارے میں اوریکان کے ماہرین کی تجویز تھی کہ کم از کم 1500 KV کا ٹرانسفارمر لگایا جائے تاکہ گلیوں اور بازاروں میں ٹرانسفارمرز کی تعداد کم کی جا سکے۔ اب

1500 KV کا ٹرانسفارمر لگانے کے لیے الگ سے پلاٹ کی ضرورت تھی۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ خراب ہونے یا مرمت کرنے کے لیے ان ٹرانسفارمرز کے لیے چھوٹی کرین چاہیے تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اندرون شہر کی تنگ اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں چھوٹی کرین کے چلنے کے لیے مناسب جگہ نہ تھی۔

ٹیلیفون کے لیے سارے شہر میں فائبر آپٹک (Fiber Optic) کیبل تجویز کی گئی مگر اس کے لیے الگ سے ایک ٹیلی فون ایکسچینج کی تعمیر کی ضرورت تھی جس کے لیے جگہ اور اخراجات دونوں ہی اپنی جگہ مشکلات تھیں۔

الیکٹرسٹی پانی اور گیس کے لیے نئے میٹر لگائے جانے کی تجویز دی گئی۔ انجینئر کا مطالبہ تھا کہ ان میٹروں کو گھر سے باہر دیوار پر لگایا جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اندرون شہر کی گلیوں میں اکثر مکانات ایک ڈیڑھ سے ڈھائی تین مرلے تک تھے۔ یہ چار چار منزلہ تھے اور ہر منزل پر ایک یا ایک سے زائد خاندان آباد تھے۔ یوں ڈیڑھ مرلے کے گھر کے باہر دروازہ نکال کر اتنی جگہ نہ بچتی تھی کہ بارہ عدد میٹر لگائے جا سکیں۔

ان انفراسٹرکچر سروسز میں سب سے زیادہ مشکلات واسا والوں کو درپیش تھیں۔ اس لیے کہ الیکٹرسٹی، گیس اور ٹیلی فون کی سروس گھر تک پہنچتی تھی اور استعمال ہو جاتی تھی مگر واسا کا مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے پائپوں کے ذریعے پہلے پانی ہر گھر میں پہنچانا تھا اور پھر پائپوں کے ذریعے ہر گھر سے اس پانی کی نکاسی بمعہ بارشی پانی کا انتظام بھی کرنا تھا۔ ایسے حالات میں یہ سروسز لوگوں کو مہیا کرنا اور پھر مکینوں کے شعور اور آگہی میں اضافہ کرنا بہت مشکل تھا وقت توانائی اور ماہرین درکار تھے۔ تجرباتی طور پر انفراسٹرکچر سروسز کا ماڈل دہلی دروازے کے باہر سرکلر گارڈن میں بنایا گیا اور پھر عملی طور پر پہلے گلی سُرجھن سنگھ اور پھر محمدی محلّہ میں یہ سہولیات فراہم کی گئیں تاکہ باقی پائیلٹ پراجیکٹ پر اس تجربہ سے فائدہ حاصل کر کے عمل درآمد کرایا جا سکے۔

اندرون شہر لاہور میں انفراسٹرکچر سہولتوں کی فراہمی اور عمارتوں کے بیرونی منظر ناموں کی تزئین و آرائش و بحالی کے کام کے منصوبہ کا اہم حصہ مقامی لوگوں میں ذہنی و سماجی آگاہی اور تاریخی شعور کی بیداری بھی تھا کیونکہ اس کے بغیر مقامی رہائش پذیر لوگوں نے کام مکمل ہونے کے بعد اور دوران میں مثبت انداز سے تعاون نہیں کرنا تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر پی ایم یو میں ایک شعبہ Social Mobilization کا بنایا گیا جس میں ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو

شامل کیا گیا جن کے ذمے پائیلٹ پراجیکٹ کے مکینوں سے رابطے اوران کی سطح پر محلہ تنظیمیں بنانا تھا۔ علاوہ ازیں تجارتی و کاروباری معاملات سے متعلق لوگوں کی ٹریڈ یونین سے رابطہ اور ان کے اندر شعور وآگہی کا بیدار کرنا تھا۔ اس ٹیم نے مسلسل فیلڈ کے دورے کیے۔ مقامی رہائش پذیر لوگوں سے رابطے کیے اور پھر پراجیکٹ کے عمل درآمد کروانے کے لیے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا۔ لوگوں کو سیمینار میں بلایا گیا، ورکشاپس کروائی گئیں اور ہیلتھ پروگرام کے تحت کئی سرگرمیوں کا انعقاد کروایا جس میں مقامی لوگوں کی شمولیت نے مقاصد کے حصول میں اور بھی آسانیاں پیدا کردیں۔

سماجی شعور وآگہی کی مہم اپنے پورے عروج پر تھی۔ مقامی لوگوں کو بہتر رہائشی سہولتوں کی فراہمی کے خوبصورت خواب دکھائے گئے وہ ہر لحاظ سے تعاون کے لیے مکمل تیار ہو گئے مگر سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے جب گورنر راج کا نفاذ ہو گیا تو اس کام کی رفتار کو بھی شدید دھچکا لگا۔ پی ایم یو کے دفتر کے ملازمین کو اپنا مستقبل نظر نہیں آ رہا تھا، وہ مقامی لوگوں کے دلوں میں امید کی شمع کیسے روشن کر سکتے۔ تاہم چند ماہ کے بعد جب دوبارہ عدالتی حکم سے صوبائی حکومت نے کام شروع کر دیا تو پی ایم یو میں نئے سرے سے سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ اب ضروری سمجھا گیا کہ سیاسی دباؤ کے اثر کو زائل کرنے کے لیے عملی طور پر کچھ کیا جائے اس کے لیے آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے گلی سُرجھن سنگھ میں انفراسٹرکچر سہولیات کی فراہمی کا کام عملی طور پر شروع کر دیا تو لوگوں کے اندر ایک مرتبہ پھر امید بندھ گئی۔

عملی طور پر جب گلی سُرجھن میں آغا خان ٹرسٹ فار کلچر (AKTC) نے کام شروع کروایا تو Integrated Coordinated کا جو ڈیزائن کا طریقہ کار انہوں نے جولائی ۲۰۰۷ء میں پیش کرتے ہوئے انفراسٹرکچر سروسز اور عمارتوں کی بیرونی آرائش کا کام الگ الگ کرنے کا خیال مسترد کر دیا تھا اور انجینئر کے بنے ہوئے PC-1 اور کنسلٹنٹس کے کام کو یکسر ایک طرف رکھ دیا مگر اب عملی طور پر انہوں نے پہلے گلی سُرجھن سنگھ میں انفراسٹرکچر سروسز فراہم کیں اور بعد ازاں عمارتوں کی بیرونی آرائش کی، تو معلوم ہوا کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا اور عملی طور پر انفراسٹرکچر سروسز اور عمارتوں کی بیرونی آرائش کے کام کو الگ الگ ہی ہونا تھا اور یہی تجربہ بعد ازاں محمدی محلہ میں ہوا کہ جب پہلے انفراسٹرکچر سروسز کی فراہمی کا کام کیا گیا اور بعد ازاں عمارتوں کی بیرونی آرائش کا کام کروایا گیا۔

گلی سُرجھن سنگھ اور محمدی محلّہ میں تقریباً کام مکمل ہو چکے ہیں مگر جو ٹینڈر پائیلٹ پراجیکٹ کے لیے ورلڈ بینک کی منظوری کے بعد اخبارات میں مشتہر کیے گئے وہ بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ ٹھیکیدار ورلڈ بینک کے معیارات پر پورا نہ اترے۔ اب دوبارہ چھوٹا ٹینڈر کیا گیا ہے جو دہلی دروازے سے چٹا گیٹ جو کہ مسجد وزیر خان کے اسکوائر میں کھلتا ہے، تک کا حصہ شامل کیا گیا ہے۔ اس کے لیے سات ٹھیکیداروں نے ابتدائی مطلوبہ کاغذات جمع کروائے ہیں، امید ہے یہ ٹینڈر ہو جائے گا۔ اس لیے بھی کہ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے بیرونی آرائش کے لیے ابھی اسی حصے کی تفصیلی ڈرائنگز تیار کی ہیں۔ اب اگر یہ کام بھی عملی طور پر ہو جاتا ہے تو اس کو بھی بڑی کامیابی سمجھا جا رہا ہے۔ اس لیے بھی کہ اگلے چند ماہ تک ورلڈ بینک نے پراجیکٹ کی جو دو سال کی توسیع کی تھی وہ عرصہ بھی پورا ہونے والا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مختلف وجوہات کی بنا پر جولائی ۲۰۰۶ء میں شروع ہونے والا یہ منصوبہ تجزیاتی نگاہ رکھنے والوں کو بہت سے سبق سکھانے کی اہلیت رکھتا ہے کہ آخر اس کی ناکامیابی کی وجوہات کیا تھیں۔ اس کے بارے میں ورلڈ بینک، آغا خان ٹرسٹ فار کلچر پی ایم یو (SDWCLP)، اے سی ای (ACE) پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ اور مقامی لوگ اپنے اپنے فکری تناظر میں مختلف منفرد اور الگ الگ وجوہات کے انبار لگا سکتے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ ایک اچھا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

منصوبہ کی عدم تکمیل و تعطل کی وجوہات

منصوبہ بحالی اندرون شہر لاہور کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ پرانے شہر سے وابستگی اور لاہور کے کلچر سے پیار کرنے والوں کی اکثریت اکثر یہ سوال اٹھاتی ہے، کئی سال پہلے اندرون شہر لاہور کی بحالی کا منصوبہ آغاز ہوا تھا وہ کیا ہے؟ آخر اندرون شہر لاہور کے ساتھ ماہرین کیا کرنا چاہتے ہیں؟ چونکہ یہ تمام باتیں بقول لوگوں کے شعوری طور پر صیغہ راز میں رکھی جا رہی ہیں، اس لیے مشکوک ہوتی جا رہی ہیں اور دوسرا وہ لوگ جو تھوڑا بہت اس منصوبہ سے آگاہی رکھتے ہیں، اس منصوبہ کے عملی طور پر آغاز ہونے میں اتنا انتظار کر چکے ہیں کہ اب تھک کر ناامیدی کی باتیں کرتے ہیں، کچھ عالمی سطح پر اس کو ایک بڑی سازش کا شاخسانہ بتاتے ہیں کیونکہ ان کے بقول امریکیوں کو ورلڈ بینک یا یونیسکو کی وساطت سے درحقیقت اندرون

لاہور و دیگر پنجاب کے شہروں کے تفصیلی نقشہ جات تیار کرنے ہیں اور چونکہ اب آغا خان ٹرسٹ فار کلچر والے جیوگرافک انفارمیشن سسٹم (GIS) کے تحت ایک ایک گھر کی مکمل تفصیلات بمعہ مکان، منزلیں اور مکیں حاصل کر چکے ہیں، لہٰذا ان کے مقاصد پورے ہوئے۔ اب عملی طور پر اندرون شہر لاہور اور اس کے مکینوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا خواب اپنی موت آپ مر جائے گا۔ اخباری رپورٹر اور ٹیلی ویژن چینلز بھی وقتاً فوقتاً اپنے خبرناموں میں کوئی نہ کوئی نیا پہلو لوگوں پر آشکار کرتے رہتے ہیں مگر سوال اپنی جگہ پر ہے کہ ایک طرف نہ تو عوام الناس کو اس بات کی آگاہی حاصل ہے اور نہ ہی دوسری جانب فن تعمیرات کے ماہرین کماحقہ اس منصوبے کی تفصیلات سے واقف ہیں۔ مختلف تقریبات اور نجی ملاقاتوں میں جب بھی اندرون شہر لاہور کے اس منصوبے کا ذکر آتا ہے تو کوئی نہ کوئی چبھتا جملہ گفتگو کا رخ کسی اور جانب پھیر دیتا ہے مگر کوئی ان عوامل اور وجوہات سے آگاہ نہیں ہے کہ آخر اس شاندار ترقیاتی منصوبے کہ جس کی تیاری و عمل درآمدگی پر ہر سطح کے بااختیار لوگوں سے لے کر گلی سُرجھن سنگھ اور محمدی محلہ کے غریب مکینوں تک ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کراتے ہیں، اور شدید آرزومند ہیں کہ یہ منصوبہ تکمیل کے مراحل سے گزرے اور صدیوں پرانا شہر ایک مرتبہ پھر آلودگی تجاوزات تجارت اور رش سے نکل کر ایک اچھے صحت مند اور قابل ستائش ماحول کا نقش بن جائے۔

گذشتہ صفحات میں منصوبہ کی عمل درآمدگی کے لیے اس سے متعلق لوگوں اور اداروں کو جن مراحل سے گزرنا پڑا اس کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے آیا ہے۔ ہم منصوبے کا اجمالی جائزہ خصوصاً اس زاویہ سے فوکس کرتے ہوئے لیتے ہیں کہ آخر جولائی ۲۰۰۶ء سے لے کر اکتوبر ۲۰۱۱ء تک پانچ سال اور چار ماہ گزر چکے ہیں جبکہ منصوبہ صرف چار سالوں میں مکمل ہو جانا تھا، مگر عملی طور پر پائیلٹ پراجیکٹ کا ابھی تک آغاز کیوں نہیں ہو سکا۔ جبکہ اس وقت صرف گلی سُرجھن سنگھ اور محمدی محلّہ کی ایک گلی میں انفراسٹرکچر سروسز اور جزوی طور پر بیرونی تزئین و آرائش کا کام ہی تقریباً مکمل ہو سکا ہے۔ چند اہم وجوہات درج ذیل ہو سکتی ہیں۔

(ا) PC-1 میں جس پائیلٹ پراجیکٹ کی منظوری عطا کی گئی تھی، جسے پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ کے زیر اہتمام کام کرنے والے ادارہ اربن یونٹ نے تیار کیا تھا، اس کے مطابق یہ طے تھا کہ انفراسٹرکچر سروسز مہیا کرنے والی ایجنسیاں جیسے واپڈا، سوئی ناردرن گیس، واسا اور پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کارپوریشن اپنی اپنی سروسز زیر زمین لے جانے کے لیے

کنسلٹنٹس کی مدد سے PC-1 تیار کریں گی۔ اس کے لیے فنڈز ورلڈ بینک کے قرضہ سے دیئے جائیں گے جبکہ SDWCLP کا دفتر ان اداروں میں صرف باہمی تعاون کو یقینی بنائے گا جبکہ عمارات کے بیرونی منظر نامہ کی تزئین و آرائش کی بحالی کا کام اس کے بعد ایک کنسلٹنٹ اور کنٹریکٹر کے ذریعے کروایا جائے گا۔ واپڈا، سوئی ناردرن گیس، پی ٹی سی ایل جو کہ وفاقی ادارے تھے، ان کا پنجاب کے ایک ذیلی ادارے سے تعاون روکھا سا تھا جبکہ واسا (WASA) اس پراجیکٹ میں پہلے دن سے ہی عملی طور پر اور تمام تر توانائیوں کے ساتھ شامل تھا۔ آدھے دل کے ساتھ PC-1 بنائے گئے مگر پورا تعاون حاصل نہ ہو سکا اور اسی میں ایک سال گزر گیا۔ جب آغا خان ٹرسٹ فار کلچر اس پراجیکٹ میں اپنی خدمات اور فنڈز لے کر پنجاب گورنمنٹ کے ساتھ پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے معاہدے میں شامل ہو گیا جن کا پہلا مطالبہ ہی یہ تھا کہ ہمیں جزوی اور انفرادی طور پر شہر کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ کلی طور پر ایک باہم مربوط (Integrated Coordinated) نظام کے تحت ایک چھتری کے نیچے، ایک کنٹریکٹر کی ذریعے سے تمام سروسز بمعہ عمارات کے بیرونی منظر نامہ کی تزئین و آرائش اور بحالی کا کام کروانا لازم ہوگا۔ ورنہ ایک ادارہ اپنا کام کر کے جائے گا، دوسرا آ کر اپنے کام کے لیے اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دے گا اور پراجیکٹ ناکام ہو جائے گا۔ اس دل کو چھو لینے والے انداز فکر نے سبھی بااختیار افسران کو قائل کر لیا۔ اور یوں ایک سال بعد پراجیکٹ کا پھر زیرو سے آغاز کیا گیا۔

(۲) جولائی ۲۰۰۶ء سے فروری ۲۰۰۷ء تک آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے اپنے پیش کردہ مخصوص اندازِ فکر کی روشنی میں ایک ماسٹر پلان کی شکل میں سٹریٹیجک فریم ورک تیار کیا اور اندرون شہر لاہور کو کلی طور پر دیکھتے ہوئے پراجیکٹ کی حدود کو محض پائیلٹ پراجیکٹ تک محدود نہ رکھا بلکہ اس بات پر اصرار کیا کہ انفراسٹرکچر سروسز کی سہولیات کی فراہمی کو فصیل کے اندر بسے ہوئے شہر میں کلی طور پر دیکھا جائے اور ساتھ ساتھ اس کا تعاون نواحی شہر سے کیسے جڑتا ہے، اس کو بھی مدنظر رکھا جائے کیونکہ الیکٹرسٹی، پانی، نکاسی آب، ٹرانسپورٹ، سوئی گیس، ٹیلی فون وغیرہ کی سروسز باہر سے اندر آتی ہیں اور خصوصاً نکاسی آب اور بارشی پانی کو شہر سے باہر لے جانے کے لیے نواح میں موجود سروسز کا سہارا لینا پڑتا ہے، ایک مرتبہ پھر آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے سبھی بااختیار لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا مگر اس متفق ہونے پر آغا خان ٹرسٹ فار کلچر نے پراجیکٹ کو بہت پھیلا دیا۔ اگر ایک جانب انہوں نے اندرون شہر میں مکمل سروے اور

GIS کے تحت معلومات اور نقشہ جات کی تیاری کا کام شروع کر دیا تو دوسرے جانب بیرون فصیل موجود سرکلر گارڈن کا سروے، موجود تجاوزات، لاہور کے دیگر باغات کی اسٹڈی، مینار پاکستان اور آزادی پارک کو قلعہ کا حصہ بنانے، علی پارک اور رم مارکیٹ کے خاتمے اور سب سے بڑھ کر شہر پر سے تجارتی دباؤ کم کرنے کے لیے بادامی باغ سے بس ٹرمینل کی منتقلی جیسے بڑے بڑے عفریتوں میں خود کو پھنسا لیا، ان متعلقہ ہوتے ہوئے غیر متعلقہ معاملات نے آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کا بہت سا پیسہ اور توانائیاں چاٹ لیں مگر یہ لوگ ابھی تک مضبوط اعصاب کے ساتھ اپنے نقطہ نظر پر استقامت سے کھڑے ہیں اور درست کھڑے ہیں۔ مگر اس ساری صورتحال کی وجہ سے اصل پراجیکٹ پر کیے جانے والے کام میں پسِ پشت چلے گئے، اندرون شہر کی تاریخی اور قدیمی عمارات کی تزئین و آرائش و بہتری کے لیے نقشہ جات صرف دہلی دروازے سے چوک مسجد وزیر خان تک ہی تیار ہو پائے ہیں جو کہ پائیلٹ پراجیکٹ کا بمشکل دس بارہ فیصد حصہ ہے اور اسی طرح پائیلٹ پراجیکٹ پورے اندرون شہر لاہور کا دس سے بارہ فیصد حصہ بنتا ہے۔ حقیقی طور پر دیکھا جائے تو ۲۰۰۶ء میں آغاز ہونے والے اس پراجیکٹ میں متعلقہ ماہرین ابھی وہیں ادھر ادھر کھڑے ہیں، جہاں سے منصوبہ کا آغاز کیا تھا۔

(۳) سیاسی استحکام اگر ایک جانب ملک کی معیشت اور صنعت کے لیے ضروری ہے تو دوسری جانب سیاسی استحکام ایسے بڑے منصوبہ جات کی بروقت تکمیل کے لیے بھی لازمی ہوتا ہے اس کی عملی تصویر ہمیں اندرون شہر کی بحالی کے اس منصوبے میں نظر آتی ہے۔ چوہدری پرویز الٰہی چیف منسٹر پنجاب کے دور میں شروع ہونے والا یہ منصوبہ جب شہباز شریف کے چیف منسٹر بننے کے دور میں داخل ہوا تو سیاسی مخالفت کی وجہ سے اس جانب حکومت وقت اور اداروں کی عدم توجہی معمول کا حصہ سمجھنا چاہیے، درمیان میں چند ہفتے گورنر راج اور پھر شہباز شریف کے اقتدار کی بحالی ایک ایسا دھچکا تھا جس نے کم از کم آٹھ دس ماہ اس منصوبے کے کھا لیے۔ اس دوران اس منصوبہ کا ڈائریکٹر جنرل اور تین میں سے دو اہم ڈائریکٹروں کی پوسٹیں خالی رہیں اور یوں سال ۲۰۰۷ء تو اسی سیاسی عدم استحکام کی صورتحال کی نذر ہو گیا۔ اور اس کے بعد جو صاحب اس منصوبے کے ڈائریکٹر جنرل بنے ان کا اگرچہ پنجاب آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں کام کا تجربہ تھا۔ پڑھے لکھے تھے تاریخ سے خصوصی لگاؤ تھا مگر ایسے کسی بڑے منصوبے کی تکمیل کے لیے جو لگن، کل وقتی فراغت اور فنی لوازمات سے آگہی درکار ہوتی ہے، وہ اتنی ہی تھی جتنی

ہمارے ملک کے بیوروکریٹ کو، جہاں بھی انہیں تعینات کر دیا جائے،تو ہوتی ہے اور اوپر سے ان کی ٹیلی ویژن کے چینلز پر بے شمار مصروفیت پراجیکٹ کے لیے بہت کم وقت بچنے دیتی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس منصوبے کے متوازی پنجاب کی دیگر تحصیلوں میں انفراسٹرکچر سہولیات کی فراہمی کے دوسرے منصوبے کی تکمیل زیادہ کامیابی سے ہوگئی۔

(۴) اپنے تیار کردہ سٹریٹجک فریم ورک کے مطابق اندرون شہر لاہور کے لیے کلی طور پر انفراسٹرکچر سہولیات کی فراہمی کے لیے ماسٹر پلان (اجمالی خاکہ) تیار کرنے کے لیے دوبئی کی جس فرم اور ریکان کو منتخب کیا گیا تھا، ان کا سارا تجربہ دوبئی کی نئی آبادیات کی حد تک تھا، ایک تہذیبی و ثقافتی شہر کہ جو پہلے سے موجود ہو، کس طرح ان سہولیات کی فراہمی میں بہتری لائی جا سکتی ہے ان کو اس کے سمجھنے میں کافی وقت لگ گیا۔ جو اجمالی خاکہ پہلے سیمینار میں پیش کیا گیا اس پر ہونے والی تنقید نے تو یوں لگتا تھا کہ ایک ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والی فضا کو جنم دے دیا ہو۔مقامی ماہرین نے کچھ ایسے چبھتے چبھتے سوال اٹھائے کہ ان کو مدافعانہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ کہہ اٹھے ''اگر آپ لوگوں کو خود معلوم ہے تو ہمیں کس لیے زحمت دی گئی ہے۔''

یہ اجمالی خاکہ (SDWCLP(Conceptual Design کے لوگوں کے نزدیک بھی کوئی قابل تحسین نہ تھا اور مقامی کسٹلٹنٹس ACE نے بھی اس کے فنی معاملات پر کئی اعتراضات اٹھائے۔ انفراسٹرکچر سہولیات کے لیے جو اندرون شہر لاہور کے لیے عمومی معیارات اور ریکان نے تجویز کیے تھے وہ بھی کوئی قابل قبول نہ تھے۔ایسی صورتحال کا نقصان پراجیکٹ کے مزید تعطل کی صورت میں نکلا۔

(۵) آغا خان ٹرسٹ فار کلچر اگر ایک جانب فنی مشاورت مہیا کر رہا تھا تو دوسری جانب ان کو عالمی اداروں سے فنڈز لینے کے لیے بھی کافی توانائی اور وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔گلی سُرجھن سنگھ کی تزئین و آرائش کی بحالی، ایک گھر کی اندرونی زیبائش، انفراسٹرکچر سہولیات کی فراہمی کے لیے اگر فنڈز حاصل کرنے پڑے تو دوسری جانب مسجد وزیر خان کی ڈاکومینٹیشن اور زمینی تجزیہ اور اس کی استقامت کا جائزہ لینے کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کر کے ایک جرمن ماہر کی خدمات حاصل کرنا پڑی۔ ان کوششوں نے بھی ان کی توجہ اصل پائیلٹ پراجیکٹ سے ہٹائے رکھی اور وہ صرف گلی سُرجھن سنگھ کی حد تک عملی طور پر کچھ کام کروا پائے جبکہ انہی کی ڈرائینگز سے SDWCLP نے محمدی محلّہ میں ایک ٹھیکیدار کی وساطت سے کام کروایا۔ جس کی

ادائیگی ورلڈ بینک کے قرض سے ہوئی۔

(۶) آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے ماہرین کا گذشتہ تجربہ ان کے پیش نظر تھے۔ جب انہوں نے 1988ء میں PEPAC کے پلیٹ فارم سے اندرون شہر لاہور پر کام کیا، اس سابقہ تجربے نے ان پر عجیب سا خوف طاری کیا ہوا تھا، اور وہ اپنے منصوبہ کی تفصیلات، کام اور آئیڈیا کو چھپاتے پھرتے تھے۔ انہوں نے دستخط کردہ پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کی کئی شقوں کی خلاف ورزی کی۔ مثلاً ایک ماہرین کی کمیٹی بنانا تھی، مگر اس کمیٹی میں صرف SDWCLP، آغا خان ٹرسٹ فار کلچر اور ورلڈ بینک کے لوگ ہی ارکان تھے، باہر سے کسی مورخ، کسی آرکیٹکٹ، کسی ماہر آثار قدیمہ، کسی اربن پلانر وغیرہ کو اس کا رکن نہ بنایا گیا اور خوف یہی تھا کہ وہ رخنے ڈالیں گے، باتیں کریں گے۔ اس عدم اعتمادی اور سوچ نے پراجیکٹ کو یک سمتی اور یک سطحی بنادیا۔ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے ماہرین کسی کی ذرا بھر تنقید بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے اور اس کے پیچھے ان کو کوئی نہ کوئی منفیت نظر آتی تھی۔ چھ ماہ بعد کمیٹی کا اجلاس ہوتا تو اس کی روئیداد اگلے اجلاس میں لکھی جاتی اور پیش کی جاتی تب تک سب کچھ بھول چکا ہوتا۔

دوسری شق جو PPP کے معاہدے کی تھی وہ تھی عوامی سطح پر ان کی تیار کردہ ڈرائنگوں، تحقیق وغیرہ کی رسائی، جب کہ انہوں نے سختی سے اپنے دفتر کے اندر تک ہی ہر شے کو محدود کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ SDWCLP جن کے ساتھ ان کی پارٹنرشپ تھی، وہ بھی بار بار اصرار کرتے تو کچھ مہیا کر دیا جاتا، یوں لگتا تھا جیسے یہ ون مین شو (One-Man Show) ہے۔ ایسی صورتحال نے پراجیکٹ کے پوشیدہ اور پیچیدہ گوشوں پر روشنی ہی نہ پڑنے دی اور اس کی رفتار کو بہت سست رکھا۔

(۷) حکومت پنجاب کے ذیلی ادارے SDWCLP میں تعینات سرکاری افسروں کی بار بار تبدیلی بھی اس منصوبے کے لیے کافی نقصان دہ رہی۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ۲۰۰۶ء سے لے کر آج تک اگر ان آٹھ دس ماہ کو نکال دیا جائے کہ جب SDWCLP کا ڈائریکٹر جنرل بھی نہیں تھا، اس منصوبے کا ڈائریکٹر جنرل تین چار مرتبہ تبدیل ہوا، اضافی چارج رہا، اس کے ڈائریکٹر انفراسٹرکچر اور ڈائریکٹر کلچر ہیریٹج تبدیل ہوتے رہے، البتہ ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن واحد شخص ہے جو ۲۰۰۶ء سے لے کر تا حال اس منصوبے پر کام کر رہا ہے اور اس کو ٹرانسفر نہیں کیا گیا۔ اس بار بار کی ٹرانسفر پر ورلڈ بینک اور آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے

ماہرین بے شمار مرتبہ احتجاج کر چکے ہیں۔ان کا نقطہ نظر ہے کہ جب اس پراجیکٹ کی آفیسر کو سمجھ آجاتی ہے تو اسے حکومت پنجاب ٹرانسفر کر دیتی ہے۔

یہاں بیوروکریٹ اور نان ٹیکنیکل افسران اس لیے موثر طور پر کام نہ کر سکے کہ وہ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے ماہرین کے سامنے طفلِ مکتب اور غیر متعلقہ لوگ تھے جنہیں منصوبہ کی سمجھ نہیں تھی اور ٹیکنیکل لوگ اس لیے قابل قبول نہ تھے کہ وہ آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے ماہرین کے تیار کردہ منصوبہ کی تفصیلات اور اوریکان کے اجمالی خاکے (Conceptual Design) پر تنقید کرتے تھے۔اس صورتحال نے بھی منصوبہ کو آگے بڑھانے میں کافی رکاوٹیں کھڑی کیے رکھیں۔

(۸) آغا خان ٹرسٹ فار کلچر کے سٹریٹیجک فریم ورک کے مطابق جب دوبارہ انفراسٹرکچر سہولیات فراہم کرنے والی وفاقی ایجنسیوں سے تعاون کے لیے ایک میمورنڈم آف پارٹنر شپ پر دستخط کرنے کے لیے رابطہ کیا گیا تو چونکہ ۰۷-۲۰۰۶ء میں ان کے تیار کردہ PC-1 منسوخ ہو چکے تھے، لہٰذا ان کا رویہ نہایت منفی اور عدم تعاون کا رہا۔حکومت پاکستان کا قانون صرف انہی اداروں کو یہ سہولیات فراہم کرنے کے لیے اتھارٹی فراہم کرتا ہے۔اس لیے اگر کسی اور ادارے نے ان سہولیات کی فراہمی کرنا ہو تو اس کے لیے ان مجاز اداروں سے اجازت لینا لازم تھا۔اس کے لیے لیسکو، پی ٹی سی ایل اور سوئی ناردرن گیس کے ساتھ جو میمورنڈم آف پارٹنر شپ دستخط ہونا تھا وہ ۲۰۱۰ء میں کہیں جا کر ہزار کوششوں کے بعد دستخط ہوا۔ عملی طور پر گلی سُرجھن سنگھ اور محمدی محلہ میں کام کے آغاز نہ کر سکنے کے پیچھے یہ مجبوری بھی آڑے آتی رہی۔اس کے لیے بے شمار میٹنگ ہوئیں، ملاقاتیں ہوئیں، صاحبانِ اختیار ٹرانسفر اور پوسٹ ہوتے رہے، مگر یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔

موجودہ صورتحال

پراجیکٹ ابھی اپنے اختتام کو نہیں پہنچا، اگرچہ ورلڈ بینک اور حکومت پنجاب نے اس کی توسیع کے لیے دوسال کی منظوری جاری کر دی ہے۔۲۰۱۱ء کے آغاز میں پائیلٹ پراجیکٹ پر عملی طور پر کام کرنے کے لیے ۵۵۵ملین روپے کے ٹینڈر اخبار میں شائع کیے گئے اور ٹھیکیداران کی پیشگی اہلیت ورلڈ بینک کے ضابطوں کے مطابق کرنے کے لیے اشتہار شائع ہوا۔دو کمپنیوں نے شمولیت اختیار کی مگر دونوں ہی اہلیت کا معیار پورا نہ کر سکیں۔آغا خان

ٹرسٹ فار کلچر بھی ابھی تک پورے پائیلٹ پراجیکٹ کے لیے مطلوبہ ڈرائینگز تیار نہیں کر سکا اور نہ ہی ACE کی تیار کردہ انفراسٹرکچر سروسز کی ڈرائینگز سے پوری طرح مطمئن ہے۔ اس سال کے وسطی ماہ میں ایک مرتبہ پھر اخبار میں اشتہار دیا گیا مگر اب کی بار پراجیکٹ میں صرف دہلی دروازے سے چوک وزیر خان تک کا علاقہ شامل کیا گیا ہے۔ اس کے لیے سات فرموں نے دلچسپی لی ہے جن کے ساتھ پری بڈ(Pre-Bid) میٹنگ بھی ہو چکی ہے اور ٹینڈر بھی ہو چکے ہیں۔ دو فرموں نے پری کوالیفائی کیا تھا ایک یونی بلڈرز اور دوسری قوی بلڈرز۔ ۵۵۰ملین کے تخمینہ جات پر ان فرموں نے ۷۰۰ملین کی بڈ جمع کروائی ہے۔ دونوں میں باہم کوئی پچاس لاکھ کا فرق ہے مگر ٹینڈر کی وصولی کے مقرر کردہ وقت کے حوالے سے باہمی تضادات ہو گئے ہیں اور معاملہ ورلڈ بینک کے نوٹس میں بھی لایا جا چکا ہے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اخباری اشتہار میں ٹینڈر کی وصولی کے لیے وقت ۱۲ تا ۲ بجے تحریر تھا جبکہ ٹینڈر ڈاکومنٹ میں وصولی کا وقت ۲ تا ۴ بجے دوپہر تھا، معاملہ متنازعہ ہو چکا ہے، دیکھئے بات کہاں پہنچتی ہے۔ بال ایک مرتبہ پھر ورلڈ بینک کے کورٹ میں پھینکی جا چکی ہے۔ (اکتوبر ۲۰۱۱ء)

منصوبہ بحالی اندرون شہر لاہور کی تیاری میں درج ذیل ماخذ سے مدد لی گئی۔

1- Conservation of the Walled City. Case Study: Lahore Pakistan
Editor: Donald Hankey. The World Bank.

2- PC-1 Document.(2006-2011)
Revision I to IV. By SDWCLP.

3- Baseline data base for Royal Trail. Walled City Lahore.
By Urbn Unit (Jan. 2007)

4- The Lahore Walled City: A Preliminary Strategic Frame Work
By Agha Khan Cultural Services Pakistan.(Feb 2008)

5- Lahore Walled City Project.
Integrated Infrastructure Conceptual Design (Three Volumes)
By AURECON Jan. 2009 Draft Final Report.